خدا اور رسول کا تصور

اسلامی تعلیمات میں

مولانا سید جلال الدین عمری

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

ہمارا حال ہمارے ماضی سے بے حد مختلف ہے۔ یہ اختلاف علوم و فنون اور صنعت و تہذیب میں جس قدر نمایاں ہے اس سے کہیں زیادہ فکر و نظر کے طریقوں میں ظاہر ہوا ہے۔ ماضی میں خدا کو ایک حقیقت سمجھا جاتا تھا اور آج اس کو ایک وہم خیال کیا جاتا ہے۔ پہلے انسان کا ایمان یہ تھا کہ خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور اب اس کی "تحقیق" یہ ہے کہ وہ بعض طبعی اسباب کے نتیجے میں خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے اس کے نزدیک اخلاق و روحانیت کی بڑی اہمیت تھی اور اب وہ محض ایک "ترقی یافتہ حیوان" ہے، جس کی اخلاقیات بھی اس کی حیوانی خواہشات کی تابع ہیں۔ پہلے وہ خدا کی نافرمانی کو جُرم سمجھتا تھا اور اب وہ خدا کی ہدایت کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے ادوار میں بھی خدا کی نافرمانی ہوتی رہی ہے اور بہت ہوتی رہی ہے لیکن خدا کا انکار کم ہی ہوا ہے اور آج فکر و عمل کی دنیا میں ہر طرف خدا سے بغاوت برپا ہے۔ اسی بات کو ایک جملے میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ ماضی کا رخ خدا پرستی کی طرف تھا اور حال کا رخ الحاد کی طرف ہے۔ موجودہ دور کی تہذیب، اس کی معاشرت اس کی حکومت و سیاست، اس کا قانون اور اس کا تصورِ اخلاق ہر چیز خدا سے بے نیازی پر مبنی ہے، خدا کو زندگی سے اس طرح خارج کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی کام میں اس کا نام نہیں لیا جاتا۔

لیکن ظاہر ہے خدا کو ماننا یا نہ ماننا ایسا نہیں ہے جس کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ دنیا ان نتائج کو اچھی طرح دیکھ چکی ہے جو خدا کو ماننے یا انکار کرنے سے فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ خدا سے بغاوت کے نتیجے میں آج پوری انسانیت کو اتنے شدید صدمات اٹھانے پڑے ہیں

اور زندگی کے ایک ایک میدان میں اتنے زبردست نقصانات اسے پہنچ چکے ہیں کہ کوئی بھی ذہین سے ذہین انسان پہلے سے اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ موجودہ دور کو خدا سے بغاوت کے نتیجہ میں جو تلخ تجربات ہوئے ہیں اگر الفاظ میں ان کی تصویر کشی کی جا سکے تو یقیناً وہ بہت ہی دل ہلا دینے والی ہوگی۔ اور ہر خیر خواہ انسانیت اسے دیکھ کر رو پڑے گا۔

دوسری طرف تاریخ کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے تجربات بھی ہوئے ہیں۔ کوئی شخص مانے یا نہ مانے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی قیمتی اور پاکیزہ تجربات ہیں ان تجربات کو نظر انداز کرنا تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی اور انسانیت پر بہت بڑا ظلم ہے۔ خدا پر ایمان جب بھی انسان کی زندگی میں داخل ہوا ہے، اخلاق میں بلندی، تہذیب و معاشرت میں پاکیزگی اور معاملات میں دیانت داری پیدا ہوئی ہے، اور بحیثیت مجموعی پوری انسانی زندگی کو سکون اور چین نصیب ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ تصویر کا یہ رُخ مدّت دراز سے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور آج ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ اسے اُبھارا جائے۔

ظاہر ہے یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ان ہی کا فرض ہے کہ دورِ حاضر کی بغاوت کا سامنا کریں، اور اس کا معقول جواب دیں۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، جتنا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ موجودہ دور میں خدا سے بغاوت از خود نہیں پھوٹ پڑی، بلکہ اس کے لیے اس کے علم برداروں نے زبردست محنت کی، اپنی بہترین قوتیں صرف کیں، اپنی جانیں کھپا دیں، رات دن اس کام میں لگے رہے۔ نئے نئے علوم ایجاد کیے اور ہر علم کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نہ خدا ہے اور نہ ہم اس کی ہدایت کے محتاج ہیں اور آج تک یہ سلسلہ پوری قوت اور شدت کے ساتھ جاری ہے، تب وہ انسانوں کو خدا سے دور کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آج کا انسان خدا سے بغاوت کے لیے جس قدر مسلّح ہے اس قدر شاید ہی کسی دور کا انسان مسلح رہا ہو۔

اس بغاوت کے مقابلے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم شب و روز محض یہ اعلان کرتے رہیں کہ خدا ہے اور وہی انسان کا معبودِ برحق ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر پہلو سے موجودہ دور کی فکری و عملی خامیاں نمایاں کی جائیں اور ہر محاذ پر اسے شکست دی جائے۔ جب تک

ہم ان استدلالات کو رد نہیں کریں گے، جن پر اس دور کی عمارت اٹھی ہے اس کی جگہ خدا پرستی کے دور کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ آج صرف یہی نہیں کہ دنیا خدا کی رہنمائی نہیں چاہتی بلکہ خدا کے وجود ہی سے انکار کر رہی ہے۔ آپ کو نعروں سے نہیں بلکہ دلائل و براہین کی قوت سے ثابت کرنا ہوگا کہ خدا فی الواقع موجود ہے اور ہماری نجات اسی کی غلامی سے وابستہ ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے اور اس کے لیے بڑی زبردست تیاری کی ضرورت ہے، لیکن ہماری علمی زندگی کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جس حد تک ہمارا فکری ارتقاء ہو چکا ہے ہم اس سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے اور ہمارے اندر دشمن کے نئے نئے فنون حرب سے واقفیت کا جذبہ نہیں ہے۔ آپ کا دشمن علم کے ہر گوشے میں تیار ہے اور آپ بغیر تیاری کے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس شان کے ساتھ آپ کبھی اپنے دشمن پر غالب نہیں آسکتے۔ خدا کا حکم ہے کہ دشمن کے مقابلے میں جتنی بھی طاقت فراہم کر سکتے ہو کرو، لہٰذا خدا کو ماننے والا کوئی بھی شخص اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا، کہ اسے آخری حد تک تیاری کرنی ہے اور اپنی قوت اس راہ میں لگانی ہے۔

آپ شاید میرے اس دعوے کو نہیں مانیں گے کہ موجودہ دور خدا سے بغاوت کا دور ہے۔ اس لیے کہ ابھی بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی موجود ہے جو خدا کو مانتے اور اس کا نام لیتے ہیں لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان میں بہت ہی کم ایسے ہیں جن کے ایمان کی کوئی علمی و عقلی بنیاد ہو زیادہ تر لوگوں کے لیے خدا پر ایمان محض ماضی کا ایک ورثہ ہے۔ ابھی ان میں ماضی سے بغاوت کی جرأت نہیں ہے۔ اس لیے آپ ان کو صاحب ایمان سمجھتے ہیں۔

ماضی کے اس یادگار خدا کا جو ابھی تک بعض ذہنوں میں موجود ہے، کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ جو لوگ اس سے دعائیں مانگیں، ان کی دعائیں سنے اور ان کی مرادیں پوری کرے، انسانوں پر اس کا زیادہ سے زیادہ یہ حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اس کے نام پر خاص خاص اوقات میں چند بے جان رسومات ادا کرتے رہیں۔ اس سے آگے نہ تو خدا کا کوئی کام ہے اور نہ کسی معاملے میں اس کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ چنانچہ آپ یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ خدا کا نام مسجدوں میں بھی لیا جاتا ہے، مندروں میں بھی لیا جاتا ہے۔ گرجاؤں اور کلیساؤں میں بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھ سکتے کہ فی الواقع انسان خدا کا بندہ بن گیا ہو اور اس پر خدا کی فرماں روائی قائم ہو چکی ہو۔

پھر یہ کہ اگر کچھ لوگ علمی و عقلی بنیادوں پر خدا کو مانتے بھی ہیں تو موجودہ تہذیب و تمدّن پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ آج جو نظریات انسان پر حکومت کر رہے ہیں، جن افکار کے تحت اس کی ذہنی و فکری تربیت ہو رہی ہے، جو علوم پڑھائے جاتے ہیں اور جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے وہ سب کے سب خدا سے بغاوت پر مبنی ہیں۔ ان میں سے ہر میدان میں اس بغاوت کا بہت ہی کامیاب جواب دیا جا سکتا ہے لیکن افسوس کہ وہ زبانیں اور قلم نہیں ہیں جو جواب دے سکیں۔ اگر کہیں سے خدا کے تصوّر کے حق میں کوئی آواز اٹھتی بھی ہے تو وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ انکارِ خدا کے ہنگامے میں دب کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے جب تک پوری قوت اور شدّت کے ساتھ اس بغاوت کا مقابلہ نہیں کیا جائے گا اس کا زور نہیں ٹوٹ سکتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کا وجود چونکہ قطعاً غیر محسوس ہے۔ اس لیے کوئی قطعی دلیل نہیں دی جا سکتی، جو بھی دلیل دی جائے گی اس کا کوئی نہ کوئی جواب ممکن ہوگا اور وہ رد کر دی جائیگی۔

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ خدا کے وجود پر دی جانے والی ہر دلیل کا جواب اگر ممکن ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر اس حقیقت کا جواب دیا جا سکتا ہے جو عقل و استدلال سے ثابت ہے کسی بھی استدلالی حقیقت کو اگر آپ تسلیم کرتے ہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ خدا کا وجود بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ میں بغیر کسی تامل کے کہوں گا کہ خالص علمی و عقلی بنیاد پر خدا کا اس قدر پختہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ کسی بھی طرح اس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

میں یہاں اس "یقین" کی جو خدا کے بارے میں دلائل سے پیدا ہوتا ہے تھوڑی سی وضاحت کروں گا۔

محسوسات کے بارے میں جس "قطعیت" کے ساتھ آپ کوئی دعویٰ کر سکتے ہیں اس قطعیت کے ساتھ غیر محسوسات کے بارے میں دعویٰ نہیں کر سکتے۔ آپ کسی بھی غیر محسوس چیز کے بارے میں جو دعویٰ کریں گے وہ صحیح بھی ہو سکتا ہے، اور اس کے غلط ہونے کا بھی امکان ہے۔ آپ کے دعویٰ کے بعد اگر ان میں سے کسی ایک پہلو کا غالب امکان مجھے حاصل ہوا ہے تو گویا مجھے اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں "یقین" حاصل ہوا ہے۔ یہ کیفیت ان دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے جو اپنے دعویٰ کے حق میں آپ فراہم کرتے ہیں۔ دلائل اگر مضبوط ہیں تو اس کے صحیح ہونے کا

"یقین" ہوگا اور اگر کمزور ہیں تو اس کے غلط ہونے کا یقین ہوگا۔ بعض اوقات یہ یقین اس قدر بڑھ بھی جاتا ہے کہ انسان اپنے ذہن میں کسی ایک پہلو کو پوری طرح ترجیح دینے لگتا ہے اور دوسرے پہلو کو بالکل رد کر دیتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ غور و فکر سے آپ خدا کا یقین حاصل کر سکتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ ان دلائل کو قوی پائیں گے جو خدا کے وجود پر دیے جاتے ہیں اور اُن دلائل میں کوئی وزن نہیں محسوس کریں گے جو انکارِ خدا کے حق میں دیے جاتے ہیں۔

ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو خدا کے متعلق علمی انداز میں غور و فکر سے گھبراتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کے منکر ہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی ذات کو عقل اور منطق کا موضوع نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ خدا پر ایمان اطمینان قلب چاہتا ہے اور اطمینان کسی عقلی دلیل سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ انسان کے باطن سے ابھرتا ہے۔ جب انسان کا دل پکار اٹھے کہ خدا کا وجود محض مفروضہ نہیں ہے جس کو وہم و خیال نے پیدا کیا ہو، بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا تو اسی کا نام ایمان ہے۔

یہ خیال بھی اصلاح کا محتاج ہے۔ یہاں ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ اطمینان ایک قلبی کیفیت ہے۔ یہ کیفیت ہمیشہ دلیل کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات آپ کسی معاملے میں پوری طرح مطمئن ہونے کے باوجود اس کا کوئی معقول سبب نہیں بیان کر سکتے۔ اس نوعیت کے اطمینان سے آپ کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ کیونکہ جس اطمینان کے پیچھے دلیل نہ ہو وہ حقیقی اطمینان نہیں ہے۔ ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ انسان کا ذوق اور رجحان یا خاندان اور ماحول کے اثرات کسی ایسے خیالات پر اس کے اندر اطمینان کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو ہرگز قابلِ اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لیے ہر نظریہ دلائل کا محتاج ہے۔ اس کے قبول کرنے یا رد کرنے میں ہم دلائل سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

آپ جانتے ہیں کہ خدا کے بارے میں مختلف نظریات پھیلے ہوئے ہیں اور خدا تک پہنچنے کی بھی بہت سی راہیں تجویز کی جا چکی ہیں۔ ان نظریات میں سیاہی و سفیدی کا تعلق ہے اور ان راہوں میں ایک مشرق کی طرف لے جانے والی ہے تو دوسری مغرب کی سمت راہنمائی کرتی ہے۔ اس لیے اگر آپ ان میں سے ایک کو حق کہیں گے تو لازمًا دوسرے کو باطل کہنا پڑے گا۔ لیکن اس کے باوجود ہر نظریہ کا ماننے والا اس پر شرحِ صدر کا اظہار کرتا ہے اور ہر راہ کا راہی اپنے سفر پر

مطمئن نظر آتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کیا دلیل ہے کہ کسی کے اطمینان کو غلط کہیں؟ اس کی بنیاد صرف یہ ہو سکتی ہے کہ جو نظریہ مسلّمات عقل کا ساتھ دے رہا ہو، ہم اسے صحیح سمجھیں اور جو نظریہ ان مسلّمات سے ٹکرا رہا ہو اسے باطل تصور کریں اور ان لوگوں کے اطمینان کو جھوٹا اطمینان قرار دیں جو باطل نظریات پر مطمئن ہو چکے ہیں۔

ہاں ایک پہلو سے اطمینان کا درجہ بہت اونچا ہے۔ خدا کے بارے میں دلائل کے ذریعہ انسان کو جو "یقین" حاصل ہوتا ہے اس کی حیثیت، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، امکان غالب کی ہے۔ اطمینان کی کیفیت انسان کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اس "یقین" کو اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کرلے اور اپنے جذبات و احساسات کو شعوری طور پر اس سے ہم آہنگ بنا دے۔ یقین کے بعد اگر آپ کو اطمینان نصیب ہوا ہے تو یہ یقین صرف آپ کے گوشہ دماغ میں بند ہو کر نہیں رہے گا بلکہ آپ کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے گا۔ آپ خدا کے تصور سے سکون اور چین محسوس کریں گے اور آپ کی پوری زندگی پر خدا پرستی چھا جائے گی۔ آپ کا فکر آپ کا جذبہ بن جائیگا اور آپ خدا کو اپنے قریب محسوس کرنے لگیں گے۔ جس یقین کو آپ نے دلائل سے اخذ کیا ہے وہ آپ کے دل کی آواز میں تبدیل ہو جائے گا۔ اور آپ کے جذبات آپ کے یقین میں گم ہو جائیں گے۔

خدا کے بارے میں غور و فکر کرتے وقت ہمیں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ایک یہ کہ ہمارے سوچنے کا انداز صحیح ہو۔ کیونکہ غلط طرز فکر سے کبھی صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری چیز یہ کہ خدا کے بارے میں ہمارے فکر کی پرواز ایک خاص حد تک ہی ہو سکتی ہے اس سے آگے اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ تجربات گواہ ہیں کہ بڑے بڑے ہوش مند انسان اس وادی میں اس وقت کھو گئے، جب کہ انہوں نے اپنی عقل کے حدود نہیں پہچانے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پیغمبروں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، خدا کے پیغمبر ایک تو صحیح انداز فکر عطا کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ ہماری عقل جس منزل تک پہنچ چکی ہے اسے اس سے آگے ایک فطری ترتیب کے ساتھ لے جاتے ہیں۔ خدا ایک ایسی حقیقت ہے جو ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی ہے۔ خدا کا رسول اس چھپی ہوئی حقیقت کا ترجمان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس عظیم حقیقت کو پا نہیں سکتے جب تک کہ ترجمان حقیقت اس کی ترجمانی نہ کرے۔ اسی وجہ سے کتاب کا موضوع "خدا" کے ساتھ اس کا

"رسول" بھی ہے۔ بلکہ کتاب کی ترتیب میں رسالت پر بحث الوہیت پر بحث سے مقدم ہے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعہ ہم خدا تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تک راستہ کا صحیح علم نہ ہو منزل پر پہنچنے کا تصور بھی دشوار ہے۔ کتاب میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ انسان خدا کی تلاش میں ناکام ہے۔ اگر وہ خدا سے تعلق جوڑنا چاہتا ہے تو اسے رسول کی رسالت کو ماننا پڑے گا۔ پھر رسول جن دعوؤں کے ساتھ دنیا کے سامنے آتا ہے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد رسول کی پہچان بتائی گئی ہے اور اسی بنیاد پر آخری رسول کی رسالت کو جانچنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ اس کتاب کا ایک حصّہ ہے۔ اس کے دوسرے حصّے میں قرآن کے تصورِ خدا کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خدا کی ذات و صفات، توحید، کائنات سے خدا کے تعلق اور خدا کی رضا و عدم رضا سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، یہ دونوں حصّے باہم اس طرح مربوط ہیں کہ آپ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ کتاب کے آغاز میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان باطل نظریات پر تنقید ہے۔ جو موجودہ دور نے خدا کے بارے میں مان رکھے ہیں۔ اس کے بغیر کتاب ایک پہلو سے تشنہ ہوتی اور آج کا ذہن اس میں خلا محسوس کرتا۔

خدا اور رسول کے بارے میں غور و فکر کی اہمیت ایک دوسرے پہلو سے بھی ہے۔ وہ یہ کہ خدا اور رسول کا تصور دین کی اساس ہے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد پورا دین گردش کرتا ہے۔ اس لیے دین کو اس کی حقیقی شکل میں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ خدا اور رسول کا اس نے کیا تصور دیا ہے اور اس کے حق میں کیا دلائل فراہم کیے ہیں۔ انسان دین کے دائرے میں اسی وقت داخل ہوتا ہے جب کہ اسے خدا اور رسول کا صحیح عرفان اور ان پر یقین کامل حاصل ہو جائے اگر اس کے ذہن میں خدا اور رسول کا پختہ یقین اور صحیح تصور موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پورے دین کے بارے میں تذبذب اور غلط فہمیوں کا شکار رہے۔

خدا اور رسول کے بارے میں گفتگو کرنا بڑا نازک اور کٹھن کام ہے۔ یہ حقیقت میں پورے دین کے بارے میں گفتگو کرنا ہے۔ اس میں معمولی سی لغزش بھی بہت بڑے سانحہ سے کم نہیں ہے۔ جب کبھی میں موضوع کی اس نزاکت اور اہمیت کا تصور کرتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی س خیال سے ڈھارس بندھتی ہے کہ اگر انسان ان حدود کے اندر رہے جو خدا اور اس کے رسول نے

کھینچ دیے ہیں تو یقیناً خطرات سے محفوظ ہے۔ میں نے جانتے بوجھتے کوئی ایسی بات خدا اور رسول کی طرف منسوب نہیں کی ہے جو فی الواقع خدا اور رسول کی نہیں ہے بلکہ جو کچھ بھی کہا ہے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت سے کہا ہے، اگر کہیں ضرورت محسوس ہوئی ہے تو وہ فطری اور منطقی نتائج پڑھنے والے کے سامنے رکھ دیے ہیں جو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے براہِ راست نکلتے ہیں۔ اس طرح میں نے اپنے موضوع کے اندر یا تو اسلامی فکر کی خالص علمی تشریح کی ہے یا اس کے استدلالی پہلو کو نمایاں کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ میں نے کہیں غلطی نہیں کی ہے۔ میں نے قلم کو ہر بے راہ روی سے بچانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ لیکن کوئی بھی انسانی کوشش — خصوصاً مجھ ایسے بے علم و بے مایہ کی کوشش — غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ جو بھی صاحب علم میری کسی غلطی کی نشاندہی کریں گے مجھے اس کے قبول کرنے میں انشاء اللہ کبھی تامل نہ ہوگا۔

جلال الدّین

۹ ستمبر ۱۹۶۴ء

باب اوّل

خدا اور مذہب کے بارے میں

دورِ جدید کے بعض نظریات کا تجزیہ

تاریخ کا یہ بہت ہی دلچسپ تجربہ رہا ہے کہ بعض اوقات حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت کا نام دے دیا جاتا ہے۔ غیر عقلی باتیں مسلّمات کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اور مسلّمات کو غیر عقلی باتیں سمجھ کر رد کر دیا جاتا ہے، غلط افکار مستند نظریات کی جگہ لے لیتے ہیں اور مستند نظریات کو افکارِ باطل کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ تاریخ کا یہی دلچسپ تجربہ مجھے یاد آجاتا ہے جب موجودہ دور کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ خدا اور مذہب کے بارے میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

۱۔ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے۔

۲۔ خدا کا ماننا یا نہ ماننا ہر شخص کا ایک انفرادی عمل ہے، اجتماعی زندگی سے نہ تو اس کا کوئی تعلق ہے اور نہ فی الواقع ہونا چاہیے۔

۳۔ خدا کو ماننے والے متعصب اور تنگ نظر ہوتے ہیں۔

۴۔ مذہب آپس کے جھگڑے اور اختلافات پیدا کرتا ہے۔ کسی بھی مذہب کی تاریخ ان نزاعات اور جھگڑوں سے خالی نہیں ہے۔

ان خیالات کو دورِ جدید نے خاص اہمیت دے رکھی ہے۔ یہ آج کی نجی صحبتوں

اور پبلک جلسوں کے موضوعات ہیں۔ علمی مجلسوں میں ان پر بحث وتمحیص ہوتی ہے اور درس گاہوں میں ان کی تعلیم دی جاتی ہے، تحقیق کرنے والے ان پر تحقیق کر رہے ہیں اور نشر و اشاعت کی وہ زبردست قوتیں جو اس دور سے پہلے کبھی میسّر نہیں تھیں، ان کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ اس لیے ہم ان میں سے ہر خیال پر آئندہ صفحات میں پوری تفصیل سے الگ الگ بحث کریں گے۔

فصل اوّل

انکارِ خدا کی حقیقت

موجودہ دور کے بہت سے با اثر علمی حلقے خدا کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کو ماننا بہت بڑی جہالت ہے۔ چنانچہ جو شخص فلسفۂ الحاد کی تردید کرتا ہے اسے ان حلقوں میں بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ گویا جب تک انسان اپنی عقل کھو نہ دے نہ تو خدا کو مان سکتا ہے اور نہ انکارِ خدا کے دعویٰ کو چیلنج کر سکتا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ خدا کے انکار پر ان کی طرف سے اب تک کوئی معقول دلیل نہیں دی جا سکی ہے۔ جب کہ خدا کے وجود پر بے شمار شہادتیں موجود ہیں۔ انکارِ خدا کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہم خدا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور ہمارے پاس اس کا کوئی حسّی ثبوت نہیں ہے کہ فی الواقع خدا ہے۔ لیکن کسی چیز کے متعلق ہمارا نہ جاننا اور اس کے بارے میں ہمارے پاس حسّی ثبوت کا نہ ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم اس کا انکار کر دیں۔

خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس سے کائنات کی معقول توجیہہ ہوتی ہے اگر آپ خدا کو نہیں مانتے ہیں تو کائنات کی ایک ہی توجیہہ کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آگئی اور آپ سے آپ چل رہی ہے۔ کوئی بھی شخص اس توجیہہ کو معقول توجیہہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے برعکس عقل کہتی ہے کہ اس کا ایک خالق اور مدبّر ہونا چاہیے اور وہ لازمًا ہے جس نے اس کو پیدا کیا اور جو اسے اپنی قدرت سے چلا رہا ہے۔ ایک دعویٰ جسے عقل کی تائید حاصل نہیں ہے اور دوسرا دعویٰ جو عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے، ہرگز دونوں ایک نہیں ہو سکتے۔ عقل کا یہ فیصلہ کہ اس کائنات کا ایک خدا ہونا چاہیے، خدا کے وجود کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کی تردید ان ہزار ہا

دفاتر سے بھی نہیں ہوسکتی جن کو وہم وقیاس نے پیدا کیا ہے۔ ہم یہاں چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں۔

خدا ہے یا نہیں ؟ اس سوال پر انسان ہمیشہ غور وفکر کرتا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں کبھی اس نے خدا کا اقرار کیا ہے اور کبھی انکار۔ لیکن عموماً اس کے غور وفکر کا نتیجہ خدا کے اعتراف کی شکل میں نمودار ہوا ہے۔ خدا کا انکار کرنے والے ایک طرف تو تعداد میں کم رہے ہیں اور دوسری طرف ان کی آواز اتنی کمزور رہی ہے کہ "علم وفن" کے کسی بھی گوشہ میں اس کی گونج نہیں سنی گئی۔ موجودہ دور میں صورتحال بدل گئی ہے۔ گو کہ اب بھی خدا کو ماننے والے اکثریت میں ہیں۔ لیکن جن افراد کے ہاتھوں میں علمی دنیا کی قیادت ہے ان کی بہت بڑی تعداد خدا کا انکار کرنے والوں کی ہے۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر خدا نہیں ہے تو یہ کائنات، جن کی وسعت وعظمت کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، کیسے وجود میں آگئی ؟ اس سوال کے جواب میں موجودہ دور کے منکرین خدا آپ کے سامنے کوئی نہ کوئی مادی توجیہہ پیش کریں گے۔ اس توجیہہ کے مطابق خالق کائنات کا مقام مادّے کو حاصل ہے اور مادّہ آپ اپنا خالق ہے۔ ان مفکرین کے درمیان اس بات میں تو اختلاف ہے کہ مادّے نے کس طرح موجودہ کائنات کی صورت اختیار کر لی، لیکن فی نفسہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ کائنات خدا کی پیدا کردہ نہیں ہے، بلکہ بے جان مادّے سے وجود میں آئی ہے۔ برٹنڈرسل نے تخلیقِ کائنات سے متعلق موجودہ نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"اس میں کوئی شک نہیں یہ سارے نظریات متنازع فیہ ہیں مگر ان کا غالب رجحان کائنات کی مادی تعبیر کی طرف ہے اور جو فلسفہ بھی اس توجیہہ کو آج تسلیم نہیں کرتا وہ حقائق کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا۔"

خدا کی ذات ہمارے حواس کے حدود سے بہت دور ہے۔ ہم نہ تو کسی لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی خوردبین سے اسے دیکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ہمارے سامنے یہ وسیع کائنات پھیلی ہوئی ہے، جو اس کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اس کی ایک ایک چیز کہتی ہے کہ کسی صاحبِ علم وحکمت ہستی نے اسے پیدا کیا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے مفکرین کسی ایسے وجود ہی کو ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہیں جس کا نہ تو مشاہدہ کیا جا سکے اور جو نہ "تجربات" میں آسکے۔ اگر آپ خدا کو

بچشم سر دکھادیں یا اسے ان کے تجربات میں لے آئیں تو وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں اور اگر آپ کے اندر اس کی صلاحیت نہیں ہے تو آپ کا ایمان ان کے نزدیک ایک اندھا یقین ہے جو بغیر دلیل کے پیدا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کوئی صاحب بصیرت کسی بات پر اندھا یقین نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کہوں گا کہ خدا کو نہ ماننا بصیرت نہیں، فریب بصیرت ہے، اور خدا کو ماننا اندھا یقین نہیں بلکہ ایک کھلی ہوئی حقیقت کا اعتراف ہے۔ کیونکہ خدا کا وجود اس عالم میں محسوسات سے زیادہ یقینی اور ثابت شدہ ہے۔ خدا کو مانے بغیر اس عظیم واقعہ کی' جو کائنات کی شکل میں موجود ہے، کوئی معقول توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے کہ موجودہ دور کے بعض سوچنے اور سمجھنے والے انسانوں نے اس حقیقت کا کھل کر اعتراف کیا ہے اور اسے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ پیش کیا ہے[1]

فرینک ایلن[2] نے اعداد و شمار کی زبان میں اس امکان کو صاف رد کر دیا ہے کہ کائنات اتفاق کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس عالم وجود کے پیچھے کوئی منصوبہ اور کوئی کارفرما قوت نہیں تو لامحالہ یہ قرار دینا پڑے گا کہ یہ عالم رنگ و بو محض ایک اتفاقی حادثہ کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو گیا۔ اب دیکھئے، بخت و اتفاق محض ایک فرضی چیز نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت ہی ترقی یافتہ حسابی نظریہ ہے جس کا اطلاق ان امور پر کیا جاتا ہے جن میں قطعی اور یقینی معلومات ممکن نہیں ہوتیں۔ اس نظریے کے ذریعے ایسے بے لاگ اصول ہمارے ہاتھ آ جاتے ہیں جن کی مدد سے ہم حق و ناحق میں بآسانی امتیاز کر سکتے ہیں اور کسی خاص نوعیت کے واقعہ کے امکانات صدور کا

---

[1] حال ہی میں امریکہ سے ایک کتاب EVIDENCE OF GOD IN AN EXPANDING UNIVERSE کے نام سے چھپی ہے۔ اس کتاب میں اونچے درجے کے چالیس سائنسدانوں نے خدا کی ذات سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ سائنس کے مختلف شعبوں میں کام کے دوران ان کے اندر یہ پختہ یقین ابھرا ہے کہ یہ کائنات بغیر خدا کے نہیں بنی ہے بلکہ اس کا ایک خالق و مالک اور منتظم و مدبر ہے جس نے اسے بڑی حکمت سے پیدا کیا ہے اور انتہائی بصیرت کے ساتھ اسے چلا رہا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عبدالحمید صدیقی ایم' اے نے "خدا موجود ہے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہی ترجمہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس باب کے تمام اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ [2] ایم' اے، پی' ایچ، ڈی' پروفیسر حیاتی طبیعیات، مینی ٹوبا یونیورسٹی، کینڈا۔

حساب لگا کر صحیح اندازہ کر سکتے ہیں کہ اتفاقاً اس کا پیش آجانا کس حد تک ممکن ہے۔

پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں (CELLS) کے لیے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں پانچ عناصر پر مشتمل ہیں۔ کاربن۔ ہائیڈروجن۔ نائٹروجن۔ آکسیجن اور گندھک۔

پروٹینی سالمہ (MOLECULE) ان عناصر کے ۴۰۰۰۰ ہزار دقیق ذرات یا جواہر ATOMS پر مشتمل ہوتا ہے۔

کائنات میں ۹۲ کیمیاوی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے وجود میں آسکے؟ مادہ کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہو اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو حساب لگا کر معلوم کی جا سکتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک حساب داں چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعے کا امکان $10^{160}/1$ کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا ہے۔ واضح رہے $10^{160}/1$ کا مطلب یہ ہے کہ دس کو ایک سو ساٹھ مرتبہ پے در پے ضرب دی جائے، گویا یہ ایک ایسا بعید از امکان قیاس ہے کہ اعداد کی زبان میں اس کا اظہار بھی مشکل ہے۔

صرف ایک پروٹینی سالمے کے اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے اس پوری کائنات کے موجودہ مادے سے کروڑوں گنا زیادہ مقدارِ مادّہ مطلوب ہوگی جسے یکجا کر کے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ آمد ہونے کا امکان ارب ہا ارب (10^{243}) سال کے بعد پیدا ہوگا۔[1]

ڈانلڈ ہنری پورٹر[2] تخلیقِ کائنات سے متعلق موجودہ نظریات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"کائنات کے بارے میں دو تصورات معروف ہیں۔ اول یہ کہ کائنات ایک تدریجی اور ارتقائی عمل سے وجود میں آئی اور یہ تصور الفر ALPHER اور گیمو GAMOW نے پیش کیا۔ دوسرا تصور ہوائل HOYLE کا ہے کہ کائنات میں تخلیقی عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔

---

[1] خدا موجود ہے، باب ۱۔ [2] ماہر ریاضی وطبعیات۔

پہلے نظریے کے مطابق یہ عالم رنگ و بو ایک دھماکے کے ذریعہ وجود میں آیا جو انتہائی حدّت و کثافت کے باعث وقوع پذیر ہوا۔ اس تصور کے مطابق درحقیقت ایک بہت ہی سخت گھٹی ہوئی اور انتہائی گرم گیس کے پھٹ پڑنے کے بعد ستارے، اجرام فلکی، ان کو وجود بخشنے والا مادہ اور ان اجرام فلکی کی ظاہری گردش وغیرہ بتدریج ارتقا پذیر ہوئی ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات کا عملِ تخلیق شروع ہونے سے پہلے کیا صورت حال تھی اس کے بارے میں یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ اس کائنات سے قبل کوئی اور کائنات موجود تھی جو ایک لامحدود زمانے سے بتدریج تحلیل ہوتی چلی جارہی تھی اور جب اس کو انتہائی حد تک سکیڑ دیا گیا تو اس نے ہماری موجودہ کائنات کی صورت اختیار کرلی۔

اگر اس تصور کو قبول کرلیا جائے کہ اس کائنات کا آغاز انتہائی گھٹن اور سکڑن اور نہایت سخت حدّت سے ہوا تو پھر یہ ناگزیر ہوجائے گا کہ خدا کو اس بنیادی مادّۂ ترکیب کے اجزاء کے خالق اور ایک ایسی قوت کے منبع کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے جس نے یہ انقباض و اختصار کا عمل کیا اور حدّت پیدا کی۔ یہاں خدا کی کارفرمائی کا اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

بانڈی، گولڈ اور ہائل کا تصور، تخلیق پیہم کا تصور ہے۔ اس کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ اس کائنات میں زمان و مکان کے اصول و قواعد ہم آہنگ اور یکساں ہیں لیکن ان سے جمود اور تعطل کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس تصور کے پیش کرنے والے اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ کائنات میں توسیعی عمل جاری ہے اور اجرام فلکی بتدریج ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ اس عمل کے نتیجے میں جو اجرام فلکی دور ہوتے ہوئے حد نظر سے ماورا چلے جاتے ہیں، ان کی جگہ لینے کے لیے اور کائنات کی ظاہری صورت و ہیئت کو برقرار رکھنے کے لیے مادّہ مسلسل تخلیق اور ارتقائی عمل کے ذریعے نئے نئے اجرام فلکی کی صورت میں تشکیل ہوتا رہتا ہے

ہماری نظر روشنی میں کام کرتی ہے اور اگر کوئی چیز روشنی سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہم سے دور ہوتی جا رہی ہو تو ایسی چیز کو ہم عمدہ سے عمدہ اور طاقت ور دوربین سے بھی دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اندازہ یہ ہے کہ جو اجرام فلکی ہم سے ۲۰ کھرب نوری سال کے فاصلے پر پہنچ جاتے ہیں، ان کی سرعت رفتار اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ روشنی اس کو نہیں پا سکتی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے دور ہو جاتے ہیں[1] واضح رہے کہ یہ فاصلہ اس فاصلے سے دگنا ہے جو ماؤنٹ پلوم پر نصب شدہ دیو قامت دوربین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس حساب سے اگر کائنات کا توسیعی عمل سورج کی تخمینی مدت کے پانچویں حصے کے برابر بھی جاری رہے تو اس کائنات کی ہر چیز ہماری نظر کی گرفت سے پرے چلی جائے گی۔ اور آفاق میں ایک عظیم خلا رونما ہو جائے گا۔

تخلیق پیہم کے تصور کے مطابق وہ مادہ برابر پیدا ہوتا رہے گا جس سے اجرام فلکی وجود پاتے ہیں اور اس طرح اگر خلاء میں کچھ اجرام فلکی نظر سے دور ہو جائینگے تو نئے اجرام فلکی ان کی جگہ لے لیں گے اور کائنات میں کوئی تغیر رونما نہ ہو گا۔ رہی یہ بات کہ یہ مادّہ کس طرح پیدا ہوتا ہے تو اس بارے میں ہوائل کا خیال یہ ہے کہ مادّہ کہیں خارج سے نہیں ٹپک پڑتا، بلکہ یہیں سے ابھرتا رہتا ہے۔ اب اگر اس تخلیق پیہم کے تصور کو درست تسلیم کیا جائے تو اس میں بھی خالق کی حیثیت سے خدا کے وجود کا اقرار کیے بغیر بات نہیں بنتی اور خدا کا وجود پھر ایک ناقابل تردید حقیقت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں آپ فطرت کے قوانین کے بارے میں جو رائے بھی

---

[1] نوری سال LIGHT YEAR کو جب فاصلہ ناپنے کی حیثیت سے بولا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ روشنی کی اس رفتار کی بنیاد پر کہ وہ ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل کی مسافت طے کر لیتی ہے، وہ فاصلہ جو روشنی ایک سال میں طے کرے گی ظاہر ہے کہ اتنے عظیم فاصلے کو اعداد و شمار کی زبان تو بیان کرنے سے قاصر ہے۔"
(خدا موجود ہے، باب ۵)

قائم کریں اور اس کائنات کی جو اساس و بنیاد بھی متعین کریں ایک سائنس داں کی حیثیت سے میرے نزدیک وہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ناظم و محرک کی حیثیت سے خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ خدا ہی کی قدرت ہے جو اس کائنات کی ہر شے میں نظر آتی ہے اور ان تمام سوالات کا واحد جواب بن جاتی ہے جن کا ہم کوئی جواب دینے سے قاصر ہیں[۱]"

پروفیسر ایڈون ماہر حیاتیات پرسٹن یونیورسٹی نے اکثر کہا ہے کہ:۔

"زندگی کا بطور حادثہ وقوع پذیر ہو جانا ایسا ہی ہے جیسے ایک پریس میں دھماکہ ہو جانے سے ایک ضخیم لغت کا تیار ہو جانا۔[۲]"

کیمیا کا ایک محقق ایڈمنڈ کارل کو رنفیلڈ پروفیسر موصوف کا ہم خیال ہے وہ پوری قوت کے ساتھ اس نظریہ کی تردید کرتا ہے کہ کائنات بطور حادثہ وجود میں آگئی۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"اس کائنات کی تخلیق کے متعلق صرف دو نظریات ہی ممکن ہیں۔ یا تو اسے فطرت میں پوشیدہ ایک اعلیٰ تخلیقی ذہن کی کرشمہ سازی مان لیا جائے یا یہ تسلیم کیا جائے کہ یہ سب کچھ محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس نے حیرت انگیز پیچیدگیوں کو دیکھا ہے اور پھر وہ نامیاتی کیمیا میں تنظیم بھی پاتا ہے، خصوصاً ذی حیات اشیاء میں، اس کے لیے اس اتفاق کے نظریے کو قبول کر لینا کسی طرح ممکن نہیں"

"ایک جانور کے عضویاتی نظام میں ایسے پیچیدہ نامیاتی اور کیمیاوی عمل ہوتے رہتے ہیں کہ کوئی انسان انہیں پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔ آدمی یہی دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اتنا پیچیدہ نظام باقاعدہ کام کس طرح کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کا یہی تقاضا ہے کہ ایک مدبر اور ایک بے انتہا ذہین حاجت روا کا وجود تسلیم کیا جائے۔ میں جس قدر اپنے کام میں آگے بڑھتا جاتا ہوں، میرا خدا کی ذات پر اعتقاد پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنے شرکاء کار کی بے اعتقادی کی روش خواہ وہ دنیا کے کسی گوشے میں ہو ایک ناقابل تشریح معمہ

---

[۱] خدا موجود ہے۔ باب ۵۔ [۲] خدا موجود ہے، باب ۵

بن جاتی ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی معمولی مشین کے لیے بھی ایک بنانے والے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر یہ دس ہزار گنا زیادہ پیچیدہ مشین کس طرح خود بخود بن سکتی اور ارتقا پذیر ہو سکتی ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔"[1]

انڈریو کان وے[2] لکھتا ہے کہ:-

"یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور یہ دعویٰ کہ خدا نہیں ہے اس کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالےٰ کے وجود کی نفی تو کی ہے لیکن اس کے انکار کے لیے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت فراہم نہیں کر سکے۔ ایک آدمی کو اس بات کا پورا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرے لیکن اس کے ساتھ اس کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ اپنے اس اشتباہ کے لیے کوئی ٹھوس عقلی دلیل بھی پیش کرے۔ میری نظر سے آج تک نہ تو کوئی ایسی تحریر گزری ہے اور نہ ہی میں نے کبھی کوئی ایسی تقریر سنی ہے جس میں علمی استدلال کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا گیا ہو کہ خدا کا وجود محض افسانہ ہے۔ اس کے برعکس بہت سی ایسی کتابیں میرے زیر مطالعہ آئی ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا موجود ہے۔"

"کائنات پر ایک نگاہ دوڑائیے تو آپ کو اس میں ایک زبردست نظم و ترتیب نظر آئے گی۔ یہ نظم و ترتیب ایک ناظم اور ایک مرتب کے وجود کی زندہ شہادت ہے۔ اتنی وسیع و عریض کائنات کا نظم و نسق کوئی معمولی شخصیت نہیں سنبھال سکتی۔ لہٰذا اس کائنات کا ناظم وہی قادرِ مطلق ذات ہے جس کی قوتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ اندازِ فکر ہے جس کو اختیار کر لینے کے بعد ایک تین چار سال کا بچہ بھی علت و معلول کے ذریعہ خداوند تعالیٰ کو پہچان سکتا ہے۔"[3]

موجودہ فکری دنیا پر مغرب کی حکومت ہے اور مغرب فلسفۂ الحاد کا امام ہے۔ یہ طویل اقتباسات

---

[1] خدا موجود ہے، باب نمبر ۳۰۔ [2] پی ایچ ڈی ایم ڈی ڈی۔ ایس سی، ایل ایل ڈی، ماہر عضویات۔ [3] خدا موجود ہے، باب نمبر ۳۰۔

میں نے اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ اس فلسفہ کی کمزوریاں مفکرین مغرب ہی کے الفاظ میں پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آجائیں، اور یہ معلوم ہو جائے کہ جس مغرب کی ذہنی برتری کو ہم مانے ہوئے ہیں اس میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو بغیر کسی احساس کمتری کے خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان محض اپنا ایک آبائی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ذاتی تحقیق اور علمی غور و فکر نے انہیں خدا تک پہنچایا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ انکار خدا کی عمارت ریت کے ٹیلے پر تعمیر ہوئی ہے۔ وہ قطعاً عقل و دانش کے حملوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ آج اگر انکار خدا ایک فلسفے کی حیثیت سے زندہ ہے اور ہر طرف اسی کا چرچا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی بنیادیں بہت مستحکم ہیں بلکہ وقت کی سیاسی حکمتوں اور مصلحتوں نے اسے زندہ رکھا ہے۔ اگر یہ حکمتیں اور مصلحتیں نہ ہوں تو بہت سے وہ لوگ جن کو منکرین خدا کی صف میں شمار کیا جاتا ہے خدا کا اقرار کرنے لگیں۔ چنانچہ یہی بات ایک سائنس دان والٹر آسکر لنڈبرگ[1] نے کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"سائنسی طریق فکر جن اساسی اصولوں پر مبنی ہے، وہ بجائے خود وجود باری کے مظہر ہیں اور ایسے لوگ جن کی عمریں سائنسی تحقیقات و تجسس میں گزرتی ہیں۔ خدا کے وجود کو دوسروں کی نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔"

"سائنس داں اگر سائنسی اصولوں سے وجود باری کو سمجھنے اور اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کے مختلف اسباب ہیں۔ جن میں سے ..... پہلا سبب تو یہ ہے کہ اکثر ممالک اور بیشتر شہروں میں اجتماعی اداروں اور تنظیموں اور حکومتوں نے الحاد اور خدا سے انکار کو بلا دلیل اور اپنی سرکاری حکمتِ عملی کی حیثیت سے بہ جبر لوگوں پر ٹھونسا ہے اور لوگ انفرادی طور پر اگر مظاہر قدرت میں وجود باری کا جلوہ دیکھتے بھی ہیں تو لادینی حکومت کے عتاب و سزا اور معاشرتی زندگی میں نکّو بن جانے کے خوف سے اس کا اعتراف اور برملا اظہار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"[2]

---

[1] پی ایچ ڈی۔ ماہر عضویات و حیاتی کیمیا۔ [2] خدا موجود ہے، باب ۷۔

موجودہ دور میں جب کہ ہر طرف خدا سے بغاوت پھوٹ پڑی ہے، اگر ایسے لوگوں کی تعداد کم ہے جو صحیح معنی میں خدا پر ایمان رکھتے ہوں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ ایسے افراد ہمیشہ کم ہی ہوتے ہیں جن کے اندر وقت کے چھائے ہوئے فکر کے خلاف سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس دور میں زیادہ امکان اسی کا ہے کہ آدمی انکارِ خدا کی رو میں بہہ جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ سائنس اور فلسفہ کا سطحی مطالعہ بسا اوقات انسان کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ حقیقت تک رسائی کی کوشش کرے، اس پندار میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس نے حقیقت کو پا لیا ہے۔ وہ اپنے تھوڑے سے علم کے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ علم کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے ہاتھ آ گیا ہے۔ لیکن اگر آدمی کے اندر حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت ہو تو وہ اس عظیم کائنات کے مطالعہ کے بعد یہ اقرار کرنے پر مجبور ہوگا کہ اس کا ایک خدا ہے اور وہ بغیر خدا کے وجود میں نہیں آ سکتی۔ ایک انگریز مفکر اور فلسفی فرانسس بیکن اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"فلسفے کا سطحی مطالعہ انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے، لیکن اسی فلسفے کی گہرائیوں میں اتریے تو مذہب کے قائل ہو جائیں گے۔"[1]

پال کلیرنس ایبرسولڈ[2] اپنے ذاتی تجربات کی روشنی میں فرانسس بیکن کی رائے سے پورا اتفاق کرتا ہے۔ اس کے تجربات کی سرگزشت اس قابل ہے کہ فلسفہ کا ہر طالب علم اسے اپنے سامنے رکھے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

"سائنس کے مطالعے کے دوران میں شروع شروع میں انسانی عقل و استدلال کی بے پناہ قوت سے اس درجہ مرعوب ہو گیا کہ میں یہ سمجھنے لگا کہ اب کائنات کی کوئی گتھی ایسی باقی نہیں رہے گی جسے عقلِ انسانی سلجھا نہ سکے اور اب سائنس داں زندگی کے منبع و مبدا، شعور و عقل کے سرچشموں بلکہ اس کائنات کی ہر چیز کی حقیقت اور اس کے مقصد و منشا کے بارے میں مکمل علم حاصل کر لیں گے۔ لیکن جوں جوں میرے علم میں

---

[1] خدا موجود ہے، باب۔ [2] ایم۔ اے، پی ایچ ڈی۔

اضافہ ہوا اور سالموں سے لے کر نظام ہائے سیارگان تک اور جرثومے سے لے کر حضرت انسان تک ہر چیز کے بارے میں مجھے بہت کچھ معلوم ہو گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی تو اس کائنات کے اسرار رموز کی ابجد کی بھی مجھے ہوا نہیں لگی ہے۔ سائنس قرنہا قرن تک بھی اپنے اکتشافات و ایجادات میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتی چلی جائے، پھر بھی ایک سالمے سے لے کر پوری کائنات تک حیات انسانی اور شعور و ادراک کی تفصیلات کا وہی عالم رہے گا کہ ہم بے اختیار یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ۔"

وہ سائنس کے حدود اور اس کا دائرۂ عمل کو واضح کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"سائنس کا منتہا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ یہ بتا دے کہ یہ سب کچھ "کیسے" ہوا۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر اس حقیقت کی نقاب کشائی کہ یہ سب کچھ "کیوں" ہوا نہ حضرت انسان کے بس میں ہے اور نہ سائنس ہی اس کی عقدہ کشائی پر قادر ہے۔ سائنس یا بشری قوتِ استدلال اس بات کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سے یکساں قاصر ہیں کہ یہ سالمیات، سیارے، نظامہائے سیارگان، یہ انسان اور اس کی بے مثل قوتیں اور صلاحیتیں آخر "کیوں" ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سائنس اس کائنات کے عمل آفرینش کے بارے میں کوئی بڑا من لگتا نظریہ پیش کر سکتی ہے کہ یہ ستارے، یہ نظامہائے شمسی اور یہ انسان اور یہ رونقیں کس طرح وجود میں آ گئیں لیکن اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں کہ آخر یہ مادہ و توانائی کہاں سے آ گئی اور اس کائنات میں یہ نظم اور یہ حسنِ ترتیب کس طرح قائم ہو گیا؟ سلامتِ فکر اور راستیِ استدلال کا تقاضا ہے کہ یہاں آ کر انسان خدا کے تصور کو قبول کر لے"۔[۱]

---

[۱] خدا موجود ہے، باب ۸۔

فصل دوم

خدا پرستی اور انسان کی اجتماعی زندگی

"خدا کو ماننا یا نہ ماننا ہر شخص کا ایک انفرادی عمل ہے۔ اس کا ہماری اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ یہ موجودہ دور کی بالعموم ایک مانی ہوئی بات ہے۔ اگر کسی سیاسی و سماجی بحث میں آپ خدا کا نام لیں تو لوگ تعجب سے آپ کی طرف دیکھیں گے کہ اس مجلس میں خدا کا ذکر کہاں سے آگیا۔ آج دنیا کی تقریباً ہر ریاست اپنے اجتماعی معاملات کے لیے "الحاد" کو پسند کرتی ہے، اور ساتھ ہی مذہبی آزادی کا اعلان کرتی ہے۔ یہ حقیقت میں اس خیال کا اظہار ہے کہ خدا کے حدودِ اقتدار انفرادی زندگی تک محدود ہیں، اجتماعی زندگی میں دخل دینے کا اسے حق نہیں ہے، انسان جب تنہائی میں ہو تو اپنے عقیدہ کے مطابق خدا کو یاد کر سکتا ہے لیکن معاشرتی و تمدنی زندگی میں اسے اس نظام کی پیروی کرنی چاہیے جو خدا کے انکار پر مبنی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ خدا کے تصور کو اس وقت تو بیدار رہنے کا حق حاصل ہے جب کہ انسان دنیا کے کاموں سے فارغ ہو، لیکن زندگی کی ہماہمی میں قدم رکھنے کے بعد اس تصور کو شعور کے پردے سے ختم ہو جانا چاہیے۔ خدا کا انکار تو اخلاق، تہذیب، تمدن اور سیاست میں لازماً ظاہر ہو گا۔ لیکن خدا پر یقین اور اس کا اقرار ذہن و فکر کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وقت کی اس منطق سے عقل اس قدر مرعوب ہے کہ اس کا جواب دینے کی وہ لوگ بھی اپنے اندر کم ہی ہمت پاتے ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔

بلاشبہ موجودہ دور اب تک، اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے کہ خدا کے تصور کو افراد کے ذہنوں سے کھرچ کر پھینک دے۔ البتہ اس کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی اس تصور سے

خالی ہو چکی ہے۔ آج کے انسان کے لیے زندگی کا وہی ایک نقشہ ناقابل قبول ہے، جو اس کے خدا نے اُسے دیا ہے۔ اس ایک نقشہ کے علاوہ دنیا کے پیش کردہ ہر نقشہ پر وہ نہ صرف غور و فکر کے لیے آمادہ ہے، بلکہ اُسے قبول بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے بسا اوقات کسی ایسی سوسائٹی کا تصور بھی دشوار ہوتا ہے جہاں خدا کا قانون انسانوں کے درمیان فیصلہ کرے، جہاں صنعت و تجارت، علم و فن اور تہذیب و تمدن خدائی ہدایات کے تابع ہوں، اور جہاں انسان خدا کے بتائے ہوئے اصول کی روشنی میں اس کی عبادت بھی کرے، اور سیاست و عدالت کا کام بھی انجام دے۔ حالانکہ یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ زندگی کی تعمیر جب خدا کے تصور سے بے نیاز ہو کر کی جا سکتی ہے تو خدا کو مان کر اس کی تعمیر کیوں نہیں ہو سکتی؛ خدا بیزاری زندگی کے مختلف گوشوں کو متاثر کرتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ خدا کی محبت و اطاعت کا ان پر اثر نہ پڑے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ چراغ جلے اور ماحول روشن نہ ہو؟ دل خدا کی یاد میں تڑپے اور اس کی گونج زندگی کے کسی گوشہ میں سنائی نہ دے۔؟ انسان کا باطن خدا کے سامنے جھک جائے اور اس کے ظاہر میں یہ جھکاؤ نمایاں نہ ہونے پائے؟

حقیقت یہ ہے کہ نظریات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض نظریات محض علمی دریافت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ انسان کی معلومات میں تو تبدیلی پیدا کرتے ہیں لیکن اس کی عملی زندگی کو نہیں بدلتے۔ انسان جس رُخ پر چل رہا ہوتا ہے، ان نظریات کے انکشاف کے بعد بھی اس کا وہی رُخ ہوتا ہے۔ آدمی اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی کیے بغیر ان نظریات کو قبول کر لیتا ہے اور سکون کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ اس کے برعکس بعض نظریات انسان کی زندگی میں انقلاب بن کر داخل ہوتے ہیں اور اسے پوری طرح بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ اس کے ذہن و فکر پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں اور ہر معاملہ میں اسے ایک نئے ڈھنگ سے سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بسا اوقات ان نظریات کو قبول کرنے کی وجہ سے انسان کے وہ بہترین صبح و شام جن کا وہ مدت سے عادی ہوتا ہے، یکلخت اس کے لیے نامانوس بن جاتے ہیں اور جن چیزوں کو وہ اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے ان میں کوئی دلچسپی اس کے لیے باقی نہیں رہتی۔ اسے کسی ایسی دنیا میں چین نہیں آتا جو اس کے مانے ہوئے نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہ اسے توڑ کر ایک "نئی دنیا" کی تعمیر میں مصروف ہو جاتا ہے اور سیاست، اخلاق، معیشت، علم و فن اور تہذیب و معاشرت

پر ان نظریات کی حکومت قائم کر دینا چاہتا ہے جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔

یہ انقلابی قوت ان نظریات میں ہوتی ہے جو اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت سے بحث کرتے ہیں۔ ان ہی کے تحت اس کی انفرادی زندگی کے اصول و آئین طے ہوتے ہیں اور اجتماعی زندگی میں اس کا رویہ متعین ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے پورا ایک نظام عمل تجویز کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اسے یہاں کس طرح زندہ رہنا ہے اور کس ڈھنگ سے کام کرنا ہے ان ہی سے اس کا سیاسی و سماجی ڈھانچہ وجود میں آتا ہے، اور انہی کے تابع اس کی معاشی دوڑ دھوپ، اس کے اخلاقیات اور اس کی تہذیب و تمدن ہوتی ہے۔ انسان اگر اپنی حیثیت متعین کرنے میں غلطی کر جائے تو اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ غلط اصولوں پر قائم ہوگا۔ اور اگر اس کو اپنی صحیح حیثیت کا علم ہو جائے تو اس کی کوششوں کا رُخ بھی درست ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ بالعموم انسان سوچ سمجھ کر اپنی حیثیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ ہر کام سے پہلے اپنی حیثیت کا تعین ضرور کرتا ہے۔ اپنی حیثیت کا تعین کیے بغیر نہ تو وہ کوئی انفرادی عمل انجام دے سکتا ہے، اور نہ سماج کے مختلف اداروں سے اپنا رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ بازار جانے سے پہلے آدمی اس بات کا جائزہ لیتا ہے کہ اس کی کیا ضروریات ہیں، اور اسے خرید و فروخت کن اصولوں کے تحت کرنی چاہیے۔ یہ جائزہ دراصل اپنی حیثیت کا جائزہ ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنی تجارت میں دیانت داری سے کام لیتا ہے، مکر و فریب سے بچتا ہے اور سودی لین دین سے پرہیز کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی حیثیت ایک ایسے انسان کی قرار دی ہے جو اخلاق کا پابند ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو اخلاقی قیود سے آزاد سمجھے گا اس کی تجارت میں بھی اس کا ظہور ہوگا وہ دیانت دار نہ ہوگا، مکر و فریب اور لوٹ کھسوٹ سے نہیں بچے گا اور اپنے کاروبار کی خاطر ہر اخلاقی بندش کو توڑ پھینکے گا۔

موجودہ دور میں جو لوگ خدا کو ماننے کے باوجود اجتماعی زندگی میں اس سے بغاوت کرتے ہیں ان کا ذہن ٹھیک اس رُخ پر کام کر رہا ہے جس رُخ پر آج منکرین خدا کا ذہن کام کر رہا ہے۔ انہوں نے جانے بوجھے یا ان جانے بوجھے اس کائنات میں اپنی وہی حیثیت متعین کر رکھی ہے جو

منکرین خدا اپنی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ اس دور میں خدا کا انکار کرنے والوں نے انسان کی یہ حیثیت متعین کی ہے کہ وہ اس کائنات کا ایک اتفاقی واقعہ ہے، نہ تو اس کا کوئی خالق ہے اور نہ اس پر کسی کا اقتدار قائم ہے، وہ آپ اپنا مالک ہے اور کسی دوسرے کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دِہ نہیں ہے، اس کے اعمال کا حساب لینے والی عدالت خود اس کی اپنی ذات ہے۔ جسے وہ خوب کہے، خوب ہے، اور جسے وہ بد کہے، بد ہے۔ انسان کی اس حیثیت سے زندگی کا ایک نقشہ بنتا ہے جس میں انسان کا رول ایک آزاد فرد کا رول ہوگا، وہ خود ہی اپنے لیے قانون بنائے گا، زندگی کے اصول دریافت کرے گا، تہذیب و تمدّن کے خطوط متعین کرے گا اور اپنے جذبات و احساسات کی آسودگی کے طریقے تلاش کرے گا۔ جو شخص اپنی یہ حیثیت متعین کرلے وہ اس آزاد نقشۂ کار سے انکار نہیں کرسکتا۔ وہ نہ تو اپنی انفرادی دلچسپیوں کو اس سے الگ رکھ سکتا ہے اور نہ اجتماعی سرگرمیوں کو۔ وہ جب کسی مسئلہ پر سوچے گا تو اسی نقشہ کے مطابق سوچے گا اور کسی معاملہ میں قدم اٹھائے گا تو یہی نقشہ اس کے سامنے ہوگا۔ اس کی تہذیب، معاشرت اور سیاست خود بخود بولے گی کہ وہ ایک آزاد فرد کی تعمیر کردہ ہے۔ جب تک وہ اپنی اس حیثیت کو غلط نہ قرار دے نہ تو کوئی شخص اس سے یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ وہ اپنے لیے خود کوئی قانون تجویز نہ کرے اور نہ وہ اسے تسلیم کرسکتا ہے۔ اگر وہ اس مطالبہ کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے رہنمائی حاصل کرنا جائز سمجھتا ہے تو اپنے عقیدہ و خیال کی تردید کرتا ہے۔

انسان کی حیثیت کے بارے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کا ایک جواب نظریۂ خدا دیتا ہے۔ یہ نظریہ انسان پر خارج سے لادا نہیں جاتا، بلکہ اس کے اندر سے اُبھرتا ہے، اس کی عقل اور اس کا وجدان جب اس بات سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ یہ کائنات از خود وجود میں آئی ہے، تو وہ اس کو ایک ایسی ہستی کی تخلیق ماننے پر مجبور ہوتا ہے جو شعور و ادراک کی مالک ہے اور جس کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے۔ اس نظریہ میں زندگی کی تعبیر کا ایک خاص انداز چھپا ہوا ہے، اور اس کے ذریعہ انسان فکر و عمل کی نئی راہ سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ ایک وسیع ترین نظریہ ہے جو پوری زندگی پر چھا جاتا ہے اور جذبہ و عمل کے ایک ایک پہلو سے نمایاں ہونے لگتا ہے۔ یہ یقین کہ خدا ہی انسان کا خالق ہے اور وہی اس پر حکومت کا حق رکھتا ہے۔ خدا اور انسان کے

کے درمیان حاکم اور محکوم کا رشتہ قائم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد انسان نہ تو اپنی خواہش کی اتباع کرسکتا ہے اور نہ اپنے علم و تجربہ سے کوئی نقشۂ کار اپنے لیے تجویز کرسکتا ہے۔ اس کے لیے وہی ایک نظام قابلِ قبول ہوگا جو خدائے تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی نظام کو وہ قبول نہیں کرسکتا۔ وہ ایک وفادار غلام کی طرح خدا کی ہدایات کو اپنی زندگی کے ایک ایک گوشہ میں نافذ کرے گا اور اسی میں اپنی دنیا و آخرت کی کامیابی سمجھے گا۔ اس نظریہ کو جو شخص پوری ایمانداری کے ساتھ قبول کرلے وہ زندگی کے دور دراز گوشوں میں بھی کسی ایسے عمل کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس سے ٹکرا رہا ہو۔ وہ وقت کے سیاسی و تمدنی ڈھانچہ کو یا تو اس نظریہ کے تابع کرنے کی کوشش کرے گا یا اسے توڑ کر اس کی جگہ ایسا ڈھانچہ تیار کرے گا، جس میں اس نظریہ کے تحت زندگی گزارنا اس کے لیے ممکن ہوگا۔ خدا کو ماننے کے بعد اگر انسان کے اندر یہ جذبات نہیں اُبھرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذہن میں خدا کا واضح تصور نہیں ہے۔ اسے خدا کا مجمل تصور تو ملا ہے لیکن اس کے تقاضوں سے ابھی وہ ناواقف ہے۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کہ نظریۂ خدا ایک وسیع ترین نظریہ ہے ایک خاص پہلو سے غور کرنا ہوگا:۔

انسان کے سامنے دو اہم سوالات ہیں اور اس کی تمام دلچسپیاں انہی دو سوالات کے گرد گھومتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کائنات سے وہ کس طرح فائدہ اٹھائے؟ کیونکہ اس کی زندگی کا سارا سامان اسی کائنات کے اندر موجود ہے۔ آج جو بڑی بڑی صنعتیں، عظیم ترین کارخانے، تجارت کے نت نئے طریقے ہم دیکھتے ہیں، وہ سب اسی سوال کا جواب ہیں۔ سائنس اسی سوال سے بحث کرتی ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہو؟ یہ ہماری تہذیب، معاشرت، سیاست اور تمدن کا سوال ہے۔ نظریۂ خدا ان دونوں سوالات کا جواب اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ خدا کو نہ ماننے والا آرٹسٹ جب اس کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کو سوائے اس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ یہاں اس کے مادی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم ہے۔ لیکن خدا کو ماننے والا انسان جب اس کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اپنے آپ کو خدا کی سلطنت میں گھرا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ یہاں ہر طرف اپنے خالق کی قدرت کے کرشموں کا مطالعہ کرتی ہے۔ ایسے شخص کا تصور یہ ہوتا ہے کہ وہ جس

زمین و آسمان سے فائدہ اٹھا رہا ہے وہ کسی اتفاق کے نتیجہ میں اس کو نہیں مل گئے ہیں بلکہ ان کو خدائے تعالےٰ نے اس کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ تصور انسان کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کائنات کو اپنی خواہش کے مطابق استعمال کرے، وہ فطری طور پر اس سے خدائے تعالےٰ کی مرضی کے مطابق کام لینے پر مجبور ہوگا۔ اسی طرح جو شخص خدا کو نہ مانتا ہو، وہ انسانوں کے ساتھ تعلقات میں، اپنے ذاتی نفع و نقصان کو سامنے رکھے گا۔ لیکن خدا کو ماننے والا انسان ہر حال میں اس کی ہدایات کا پابند ہوگا۔ اسی کے حکم سے وہ تعلقات پیدا بھی کرے گا اور اسی کے حکم سے ختم بھی کرے گا۔ زندگی کا کوئی بھی میدان ایسا نہیں ہے جس میں خدا کو ماننے والے، اور نہ ماننے والے ایک دوسرے سے بالکل ممتاز نہ ہو جاتے ہوں۔

غرض یہ کہ خدا کا تصور زندگی گزارنے کے لیے پورا ایک نظام ہمیں عطا کرتا ہے، جس سے انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ آزاد نہیں رہتا۔ یہ تصور چاہتا ہے کہ انسان اپنے تمام معاملات میں خدا سے رہنمائی حاصل کرے، اپنے نزاعات کو طے کرنے کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے اور اپنی خوشی اور غم اور اپنی تہذیب و معاشرت اور تمدّن و سیاست کو اس کی مرضی کے تابع کر دے۔

فصل سوم

کیا خدا کو ماننے والے تنگ نظر ہوتے ہیں؟

موجودہ دور میں مذہب کی تنگ نظری کا صور اتنے زور سے پھونکا گیا ہے کہ دنیا اس کے نام تک سے گھبرانے لگی ہے اور کسی شخص کے متعصب ہونے کی یہ زبردست دلیل سمجھی جاتی ہے کہ وہ مذہب کا قائل ہے اور خدا اور رسول کو مانتا ہے۔ لیکن کیا فی الواقع خدا اور رسول کے ماننے سے انسان تعصب کا شکار ہو جاتا ہے؟ کیا واقعتاً مذہب، تنگ نظری اور تاریک خیالی پیدا کرتا ہے؟ اگر یہ بات صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ ہر شریف آدمی کو مذہب سے دور رہنا چاہیے۔ کیونکہ تعصب اور تنگ نظری بہت بری بلا ہے۔ اس سے بستیاں اجڑتی ہیں، تہذیب و تمدّن کو نقصان پہنچتا ہے، اجتماعیت برباد ہوتی ہے اور سیاست میں فساد رونما ہوتا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ کسی انسانی آبادی کے لیے ایک متعصب اور تنگ نظر انسان کا وجود جنگل کے درندے سے زیادہ ضرر رساں ہے اس لیے اگر کوئی شخص تعصب اور تنگ نظری کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مخالفت بالکل بجا ہے۔ ہم کھلے دل سے اس کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ یقین بھی ہے کہ مذہب سے تنگ نظری نہیں پیدا ہوتی اور مذہب کے ماننے والے جتنے روادار اور وسیع النظرف ہوتے ہیں کوئی دوسرا گروہ اتنا روادار اور وسیع النظرف نہ ہوتا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔

ہم یہاں ان تاریخی اسباب سے بحث کرنا نہیں چاہتے جن کی بنا پر مذہب پر تنگ نظری کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لیکن اتنی بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس الزام کے لگانے والے مذہب کے معاملہ میں غیر مخلص بلکہ اس کے بدترین دشمن ہیں۔ ان کو یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ

مذہب کی اساس پر کوئی گروہ وجود میں آئے۔ وہ کسی ایسی تنظیم کو برداشت کرنا نہیں چاہتے جو خدا پرایمان رکھے اور اپنی زندگی کو اس کی غلامی میں لگا دے۔ ان کا بہترین مفاد اس میں ہے کہ خدا کو ماننے والے اپنی انفرادیت ختم کر دیں اور پوری طرح ان میں ضم ہو جائیں۔ خدا اور اس کے دین سے ان کی دشمنی کوئی سربستہ راز نہیں ہے، جسے کھولنے کی ضرورت ہو۔ ان میں سے بیشتر تو اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہو چکے ہیں، البتہ بعض ابھی تک "خلوص اور خیر خواہی" کی نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔ اسی لیے شاید مذہب کے ماننے والے بھی انہیں اپنا ناصح مشفق سمجھتے ہیں اور جب وہ "بے غرضی" کے ساتھ مذہب کی "خامیوں" کی نشاندہی کرتے ہیں تو یہ اس کی اصلاح کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ خدا اور اس کے دین کے یہ چھپے دشمن اس کے کھُلے دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔

مذہب کو تعصب کا سرچشمہ اور مذہب کے ماننے والوں کو تنگ نظر انسانوں کا گروہ ثابت کرنے کے لیے اس کے مخالفین نے جو الزامات لگائے ہیں ان میں سے پہلا الزام یہ ہے کہ مذہب کی اساس پر عالمی برادری وجود میں نہیں آسکتی کیونکہ مذہب سے فرقہ پرستی اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں کا نقطۂ نظر محدود ہوتا ہے، اس لیے وہ پوری نوع انسانی کو ایک سطح پر رکھ کر سوچ نہیں سکتے۔

لیکن مذہب پر اتنا بڑا الزام لگانے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تعصب اور گروہ بندی کیسے پیدا ہوتی ہے اور انسان کے فکر و نظر میں وسعت کہاں سے آتی ہے؟

اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ کسی نظریے کے اندر جتنی وسعت ہوگی اس کے ماننے والے کے فکر و عمل میں بھی اتنی ہی وسعت ہوگی۔ انسان کے فکر و عمل کی دنیا محدود ہو جاتی ہے جب وہ کسی محدود نظریے کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دیتا ہے۔ ایک شخص فرد واحد کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ دوسرے شخص کی نگاہ میں پوری قوم اس کی خدمت کی مستحق ہوتی ہے اور تیسرا شخص اپنی خدمت کے دائرے کو ساری انسانیت تک پھیلا دیتا ہے۔ نظریات کے اس اختلاف سے سعی و عمل کے حدود بھی وسیع یا تنگ ہو جاتے ہیں۔ پہلے شخص کے سامنے ایک فرد کی آسائش و راحت ہوگی، دوسرا شخص افراد کے ایک گروہ کی فکر کرے گا، اور تیسرا شخص نوع انسانی کے کسی بھی فرد کی تکلیف پر بے چین ہو جائے گا۔

آج جو لوگ مذہب پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے تحزب اور گروہ بندی پیدا ہوتی ہے، ان کا ایمان بجائے خدا کے نظریۂ قومیت پر ہے، اس لیے ہم یہاں اوپر کے بیان کردہ اصول کی روشنی میں نظریہ قومیت اور نظریۂ خدا پرستی کا تقابل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ نظریہ قومیت تمام انسانوں کو ایک وحدت نہیں سمجھتا اور نہ اس نقطہ نظر سے ان کے مسائل پر غور کرتا ہے، کہ ان کا نفع و نقصان ایک ہے بلکہ وہ انسانوں کو طبقوں اور جماعتوں میں تقسیم کرتا ہے اور ہر طبقہ میں یہ احساس بلکہ ایمان و یقین پیدا کرتا ہے کہ اس کا مفاد دوسرے طبقات کے مفاد سے بالکل مختلف ہے۔ وہ دوسروں سے الگ ہے اور اسے ہمیشہ الگ ہی رہنا چاہیے ورنہ اس کا مفاد کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کے نزدیک نوع انسانی کے ایک حصّے کو دوسرے حصّے سے الگ کرنے اور ان میں دوری پیدا کرنے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ان کے درمیان جغرافیائی حدود کا اختلاف ہے یا ان کی زبان اور رنگ و نسل جدا جدا ہیں۔

نظریۂ قومیت سے تمدن میں دو بڑی خرابیاں رونما ہوتی ہیں۔ پہلی خرابی یہ ہے کہ یہ نظریہ اپنے مزاج کے لحاظ سے انسان میں تعصب پیدا کرتا ہے، جو شخص صحیح معنوں میں قوم پرست ہوگا، وہ لامحالہ صرف اپنی قوم کا بھلا چاہے گا۔ اسے کسی دوسری قوم کی فلاح و بہبود سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ اور اگر ہوگی بھی تو اسی وقت جب کہ وہ اس کی اپنی قوم کے لیے مفید ہو۔ ہر معاملے میں قومی مفاد اس کے پیش نظر ہوگا، جس کام میں وہ قوم کا فائدہ دیکھے گا اس کی طرف دوڑ پڑے گا، خواہ وہ دوسری قوم کے لیے کتنا ہی نقصان دہ کیوں نہ ہو، اور جس کام میں قومی نقصان ہوگا وہ اس کے لیے غیر ضروری بلکہ ناجائز قرار پائے گا خواہ اس سے کسی دوسری قوم کے بڑے بڑے نفع کی توقع ہی کیوں نہ کی جائے۔ اسے آپ قوم کا ایسا وفادار کہہ سکتے ہیں جس کی نظر کبھی حق و ناحق پر نہیں ہوتی بلکہ اپنی قوم کے نفع و نقصان پر ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنے اس محدود نقطۂ نظر کو بدل دے اور ہر طبقہ اور ہر جماعت کی بھلائی چاہنے لگے تو وہ انسانیت نواز ہوگا، قوم پرست نہ ہوگا۔

نظریۂ قومیت کی دوسری خرابی یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کو ایک نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ ان کے درمیان بلندی و پستی کے بے شمار معیارات قائم کر دیتا ہے۔ کبھی کسی قوم کو وہ اس لیے برتر قرار دیتا ہے کہ اقتدار اور حکومت اس کے ہاتھ میں ہے اور کبھی اس کے نزدیک کوئی قوم اس لیے اونچی ہو جاتی ہے کہ

وہ ایک خاص زبان بولتی ہے یا اس کا کسی خاص نسل سے تعلق ہے۔ ظاہر ہے جہاں یہ خرابی ہوگی وہاں آپ مساواتِ انسانی کا تصور نہیں کر سکتے۔

موجودہ دور قوم پرستی کا دور ہے۔ چنانچہ اس میں یہ دونوں خرابیاں پوری طرح نمایاں ہو چکی ہیں۔ ایک طرف قومی تعصب پوری شدت کے ساتھ ابھر آیا ہے اور قوم کے لیے فنا ہونا فرد کی معراج سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف آج کا انسان مساوات کا تصور چھوڑ چکا ہے۔ چنانچہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی بھی با اقتدار قوم اپنے زیر سایہ کسی محکوم قوم کو جینے کا حق تک دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ ان کی ترقی و خوشحالی کی دشمن ہے اور ہر قدم پر ان کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے۔ ان نتائج کے کھل کر سامنے آنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ انسانیت کی فلاح نظریۂ قومیت میں ہے اور اس سے عالمی برادری وجود میں آسکتی ہے۔

انسانوں کے بارے میں خدا کو ماننے والے شخص کا نقطۂ نظر خدائی نقطۂ نظر کا عکس ہوتا ہے۔ خدا کے نزدیک تمام انسان خواہ وہ کسی بھی قوم اور وطن سے تعلق رکھتے ہوں، ایک ہیں۔ وہ انسانوں کے ساتھ اس بنیاد پر معاملہ نہیں کرتا کہ ان میں شریف النسل کون ہے، اور کون ادنیٰ ذات کا، کس کی زبان عربی ہے اور کون انگریزی بولتا ہے؟ کس کا رنگ سرخ و سفید ہے اور کون سیاہ فام اور کالا ہے۔ اسے نہ تو کسی سے ذاتی محبت ہے اور نہ کسی سے ذاتی دشمنی، بلکہ سب کے سب اس کے بندے اور غلام ہیں۔ اس لیے اس سے برابر کا تعلق رکھتے ہیں۔

خدا پر ایمان ایک وسیع ترین نقطۂ نظر ہمیں عطا کرتا ہے۔ جو شخص اس نقطۂ نظر کو اختیار کرے گا وہ فطری طور پر تمام انسانوں کو ایک وحدت سمجھے گا اور ان سے سچی محبت کرے گا۔ طبقاتی کش مکش، گروہی عصبیتیں اور جماعتی نزاعات ایمان باللہ کے ساتھ ہرگز جمع نہیں ہو سکتے۔ آج دنیا نے بلندی و پستی کے جو جھوٹے معیارات قائم کر رکھے ہیں، خدا کو ماننے والا انسان ان سب کو مٹائے گا اور بغیر کسی تفریق کے تمام انسانوں کو ایک نظر سے دیکھے گا۔ وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے وسیع الذہن ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور کرنا بھی صحیح نہیں ہے کہ وہ تنگ نظر ہوگا اور محدود دائرے میں رہ کر سوچے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خدا کو ماننے سے تنگ نظری پیدا ہوتی ہے وہ ایمان کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

مذہب کے ماننے والوں پر دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ انسان کو بحیثیت انسان کے نہیں

دیکھتے، بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مومن ہے یا کافر؟ خدا کو مانتا ہے یا اس کا انکار کرتا ہے؟ اور پھر اس کے بعد ان کی ساری ہمدردیاں اور جذباتِ محبت ان لوگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جو خدا کو مانتے ہیں۔ خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے ان کی محبت اور ہمدردی میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک باطل پرست ہیں، بے دین اور ملحد ہیں۔ وہ ان کے ساتھ قطعاً اس سلوک کے روادار نہیں ہوتے جو سلوک کہ وہ کسی کے ساتھ اس کے ایمان کے بعد کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کو ماننے والوں کے درمیان تعاون اور ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے کے صحیح معنی میں مخلص اور بہی خواہ ہوتے ہیں لیکن ان کی اس خصوصیت کو فرقہ واریت سمجھنا اور اس کے بعد وہ صفات ان پر چسپاں کر دینا جو کسی فرقے کے اندر پائی جاتی ہیں بہت بڑی زیادتی ہے۔ افسوس ہے کہ آج یہ زیادتی دیدہ و دانستہ اور علم و آگہی کے دعووں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ حالانکہ ہم پورے یقین و اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو اجتماعیت ایمان باللہ کی اساس پر وجود میں آتی ہے وہ فرقہ پرستی اور تعصب کی لعنت سے پوری طرح محفوظ ہوتی ہے۔ خدا کو ماننے سے انسان کا خوابیدہ ضمیر جاگ اٹھتا ہے، جو اسے ہر بد اخلاقی سے باز رکھتا ہے۔ اس سے آدمی کا اخلاقی زوال دور ہوتا ہے اور اس میں اعلیٰ اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں۔ خدا کو ماننے والا شخص انسانوں کے ساتھ وہ بہترین رویہ اختیار کرتا ہے جو خود خدا نے ان کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ خدائے تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے، اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے، وہ ہر ایک سے محبت کرتا ہے اور اس کے احسانات سب کے لیے عام ہیں، وہ مومن کو بھی دیتا ہے اور کافر کو بھی دیتا ہے۔ وہ یہاں ان لوگوں کو بھی اپنی رحمت سے محروم نہیں کرتا جو اس کی بڑی سے بڑی نافرمانی کرتے ہیں، وہ باغیوں اور سرکشوں کو بھی جب تک کہ ان کی مہلت حیات ختم نہ ہو جائے، راہِ راست پانے اور اپنی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے مواقع دیتا ہے۔ وہ اعلیٰ صفات سے متصف ہے اور اس نے ان ہی صفات کی اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے۔ خدا کو ماننے اور اس کی تعلیم کو قبول کرنے سے انسان کے اندر یہی صفات جلوہ گر ہوتی ہیں اور وہ بہت اونچے کردار کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدائے تعالیٰ ہر معاملے میں فضل و احسان کی روش پر قائم ہے، اس کی یہ روش کبھی نہیں بدلتی خدا کے ماننے والے بھی ہمیشہ یہی روش اختیار کرتے ہیں خدا اپنے ایک ایک بندے پر اس کے عقیدہ و مذہب سے قطع نظر بے حد مہربان ہے۔ خدا کے ماننے والے

بھی اس کے تمام بندوں پر بغیر کسی تفریق کے مہربان ہوتے ہیں۔ خدا غفّار و ستّار ہے اور بڑے بڑے ظالموں اور جابروں کو معاف کر دیتا ہے، اس کے ماننے والے بھی فیاض ہوتے ہیں اور کبھی تنگ ظرفی کا معاملہ نہیں کرتے۔

اگر آدمی میں ذوق الزام تراشی نہ ہو تو وہ خدا کو ماننے والے انسان پر کبھی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ اسکی ہمدردی صرف اپنے ہم مذہب افراد کے ساتھ ہوتی ہے۔ گروہی تعصب نہ تو اس کے عقیدہ و مسلک سے ہم آہنگ ہے اور نہ اس کی تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ اس کا وجود دوست اور دشمن ہر ایک کے لیے رحمت ہے، وہ اپنے مخالفین کو نہ صرف برداشت کرتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ انتہائی شریفانہ برتاؤ کرتا ہے۔ کسی سے اس کا فکری اختلاف نہ دشمنی میں تبدیل ہوتا ہے اور نہ اس سے الفت و محبت کا رشتہ قائم کرنے میں مانع ہوتا ہے۔ وہ تکلیف و راحت، خوشی اور غم، اختلاف و عدم اختلاف کسی بھی حال میں اخلاقی قدروں کو پامال ہونے نہیں دیتا۔ اگر کسی کے ساتھ وہ بدسلوکی کرنا بھی چاہے تو اس کی اخلاقی روح اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کا اس روئے زمین پر اس سے بڑا پاسبان کوئی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ اور اس کی زبان سے موافق اور مخالف کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس کی ذات سے ہر شخص کی جان و مال اور عزت و آبرو اس طرح محفوظ رہتی ہے کہ ان پر کبھی آنچ نہیں آتی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے سے انسان کے اخلاق میں بے پناہ عظمت اور بلندی پیدا ہو جاتی ہے، اس سے دشمنوں کی دشمنی ختم ہوتی اور دوستوں کی دوستی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے انسان اپنے حقوق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن دوسرے کے حق پر خواہ وہ اس کا حریف ہی کیوں نہ ہو، قبضہ کرنا نہیں چاہتا۔ اس قسم کے افراد سے جو معاشرہ وجود میں آتا ہے وہ ایک مثالی معاشرہ ہوتا ہے۔ اس میں استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے بجائے ایثار اور سخاوت کے جذبات پرورش پاتے ہیں اور ہر طرف رواداری اور وسیع النظرفی کی فضا چھا جاتی ہے۔ ایک شخص کا اندازِ فکر جو بھی ہو اور وہ جس نظریۂ حیات پر بھی ایمان رکھتا ہو، پورا معاشرہ اس کا سرپرست ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی حال میں اپنے آپ کو بے بس اور کمزور محسوس نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی با اخلاق اور انسانیت نواز سوسائٹی میں پاتا ہے جو اس کے لیے مضبوط سہارا ہوتی ہے اور اس کی ہر مشکل میں کام آتی ہے۔ خدا کو ماننے والا گروہ نوعِ انسانی

کا بہترین گروہ ہے ۔ اس سے زیادہ رواداراور وسیع الظرف گروہ کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ اس کے نزدیک انسان ایک قیمتی متاع ہے جس کا ضیاع بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ اس کے بچانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہے۔

مذہب کے ماننے والوں پر تیسرا الزام یہ ہے کہ وہ فکری اختلاف کو برداشت نہیں کرتے بلکہ اپنا فکر دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کوئی بھی صالح اجتماعیت اسی وقت وجود میں آسکتی ہے جبکہ افراد ایک دوسرے کے عقیدہ وخیال کا احترام کریں۔ اختلاف کرنے والوں کو اختلاف کا حق دیں اور اسے بخوشی برداشت کریں۔

میں بغیر کسی خوف تردید کے کہوں گا کہ یہ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ خدا نے دین میں جبر نہیں رکھا ہے بلکہ اس نے انسانوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنے لیے جو دین چاہے پسند کرے اور زندگی کے جس طریقے کو صحیح سمجھے اسے اختیار کرے۔ خدا نے انسان کی آزادی کا دائرہ یہاں تک وسیع کر دیا ہے کہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے اس کے وجود تک کا انکار کر سکتا ہے اور اس کی مرضی کے خلاف زندگی بھر عمل کر سکتا ہے۔ خدا کو ماننے والے بھی آزادی کی اسی راہ پر چلتے ہیں۔ وہ اس دنیا میں حرّیتِ فکر کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ وہ اس بات کے حق میں ہوتے ہیں کہ انسان کو فکر وخیال کی آزادی ملنی چاہیے، وہ کسی پر اپنا عقیدہ مسلط نہیں کرتے، کسی کو اپنا نظریہ ماننے پر مجبور نہیں کرتے اور کسی سے ان کی دشمنی محض اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ ان سے اختلاف رکھتا ہے اور اس کا فکر ان کے فکر سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ جو شخص ان کے نظریے کو صحیح نہیں سمجھتا اسے اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اسے قبول نہ کرے۔ اگر وہ عقیدے کے معاملہ میں زبردستی کریں تو ان کا طریقہ اس طریقے کے صریح خلاف ہوگا جو خدا نے اپنے بندوں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان کے نزدیک ارتداد ایک سنگین جرم ہے، جس کی وہ کبھی اجازت نہیں دیتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو اس بات کا تو حق ہے کہ وہ بغیر سوچے سمجھے خدا پر ایمان نہ لائے۔ لیکن جب اس نے ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر خدا کو مان لیا تو اب اسے اس کی اجازت نہیں ہے کہ خدا کا انکار کر دے۔ کیونکہ یہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ کھلّم کھلّا مذاق ہے، جو کسی بھی حال میں قابل برداشت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جس ریاست کی بنیاد خدا کے دین پر

رکھی گئی ہو، خدا کے انکار سے اس کے وجود کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی ریاست اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کی بنیاد ہی کو کمزور کر دیا جائے۔ اسلامی ریاست میں خدا کو ماننے سے پہلے آدمی ملحد و بے دین رہ سکتا ہے، لیکن خدا کو ماننے کے بعد پھر کبھی وہ الحاد کی طرف نہیں جا سکتا[1]

مذہب کے ماننے والوں پر چوتھا الزام یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفین کو زندہ رہنے کا حق نہیں دیتے، بلکہ مذہب کے نام پر ان سے جنگ کرتے ہیں۔ مذہب کا قصر ہمیشہ اس کے 'دشمنوں' کی لاشوں پر تعمیر ہوا ہے۔

اس کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ ہم کبھی یہ نہیں کہتے کہ خدا کو ماننے والے ناتوانی اور بے کسی کی تصویر ہوتے ہیں اور کبھی سختی روا نہیں رکھتے۔ اگر کوئی شخص ان کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ کسی کو سزا نہیں دیتے اور کسی سے باز پُرس نہیں کرتے تو اس کا خیال غلط ہے۔ وہ طاقت کے استعمال کو بعض اوقات جائز ہی نہیں بلکہ ناگزیر سمجھتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ صرف تحمل و برداشت اور عفو و درگزر ہی کا حکم نہیں دیتا بلکہ جنگ کا بھی حکم دیتا ہے۔ خدا کو ماننے والے اس کے حکم سے کبھی اپنا دفاع کرتے ہیں اور کبھی حملہ آور ہو کر دشمن کو دفاع کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ البتہ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی جنگ لوٹ مار اور استحصال کے لیے نہیں ہوتی، وہ دوسروں کے حقوق پر قبضہ کرنے کے لیے میدان میں نہیں آتے، ان کو کسی قوم اور کسی گروہ سے ذاتی پرخاش نہیں ہوتی اور نہ وہ کسی کی آزادی چھیننا چاہتے ہیں، بلکہ وہ عدل و انصاف کے محافظ ہوتے ہیں اور اسی کی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتے ہیں۔ ان کا یہ خاص امتیاز ہے کہ وہ طاقت کو ناحق کام میں نہیں لاتے بلکہ حق و انصاف کے ساتھ کام میں لاتے ہیں۔ وہ مجرم کو سزا دیتے ہیں، بے گناہ کو سزا نہیں دیتے۔ وہ ظالم کے ساتھ سختی کرتے ہیں، مظلوم کے ساتھ نہیں کرتے۔ ان سے ہمدردی کی توقع کسی مفسد فرد یا گروہ کو نہیں ہوتی بلکہ ان کی ہمدردیوں کے مستحق عدل کے طالب اور انصاف کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی روش کو آپ ناجائز نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہی وہ حق ہے جس کا اس زمین پر انسان محتاج ہے۔ اگر ظالم کے خلاف تلوار نہ اٹھائی جائے تو یہ ظلم کی حمایت ہوگی۔ باغیوں اور سرکشوں کے ساتھ رواداری برتی جائے تو اس سے بغاوت

---

[1] یہ موضوع تفصیل کا محتاج ہے اور یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اور سرکشی کو فروغ ہوگا۔ فتنہ و فساد کو انگیز کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے امن و امان کو ختم کر دیا جائے۔ اگر بدکاروں اور مجرموں کی گرفت نہ کی جائے اور انہیں کھلی چھوٹ دے دی جائے تو یہ دنیا نیکوں اور اچھوں کے رہنے کے قطعاً قابل نہ ہوگی۔ اس لیے ضروری ہے کہ عدل و انصاف کی خاطر تلوار اٹھائی جائے، لیکن اس کے لیے پہلے ہمیں عدل کی حقیقت جان لینی چاہیے۔ اُس کے بغیر اُس کام کی نوعیت سمجھ میں نہیں آسکتی، جسے خدا کے ماننے والے انجام دیتے ہیں۔

عدل کی بنیاد ایسے قانون پر ہوتی ہے، جس کی نظر میں عورت اور مرد، جوان اور بوڑھا، عالم اور جاہل، حاکم اور محکوم، امیر اور غریب، مزدور اور سرمایہ دار ایک ہوں۔ ایسا قانون صرف خدا کا دیا ہوا قانون ہے۔ وہ تمام انسانوں کو ان کے دنیوی مراتب کے فرق کے بغیر ایک نظر سے دیکھتا ہے اور بغیر کسی جانبداری کے ان کے ساتھ عدل کی روش اختیار کرتا ہے۔ دنیا میں ظلم کی ابتداء خدا کے قانون سے بغاوت کے ذریعہ ہوئی اور اب عدل اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان خدا کے قانون کے تابع نہ ہو جائے۔ خدا کے قانون سے بغاوت کے بعد انسان کے سامنے دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ خود قانون بنائے اور دوسروں پر حکومت کرے۔ دوسری یہ کہ محکوم بن جائے اور اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کے بتائے ہوئے قانون کی اطاعت قبول کرلے۔ یہ دونوں ہی صورتیں سراسر ظلم کی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت میں انسان صریح طور پر ایک ظالم کی پوزیشن اختیار کرلیتا ہے اور دوسری صورت میں اپنے آپ کو جان بوجھ کر ظلم کی آماجگاہ بناتا ہے اور یہ بالواسطہ ظالم کی تائید ہے۔ اگر انسان ظالم کا پنجہ موڑ دے اور ظلم کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو تو دنیا سے ظلم کا وجود ختم ہو جائے آج تک کی تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی انسان نے انسان پر حکومت کی ہے اس نے ظلم کی راہ اختیار کی ہے جہاں کسی شخص یا گروہ کے اندر یہ احساس پیدا ہوا کہ وہ حاکم ہے اور دوسروں کو اس کی غلامی کرنی چاہیے، وہیں سے ظلم کا آغاز ہو جاتا ہے اور دھیرے دھیرے سوسائٹی میں ظالم اور مظلوم دو طبقے وجود میں آجاتے ہیں۔ ایک پوری قوت کے ساتھ ظلم کرتا ہے اور دوسرا بے کسی کے ساتھ ظلم سہتا ہے۔ انسان کی انسان پر حکومت خواہ مذہب کے نام پر ہو یا سیاست کے نام پر، چھوٹے پیمانے پر ہو یا بڑے پیمانے پر، جمہوریت کے نام پر ہو یا آمریت کے نام پر، اس سے ظلم کی مقدار اور وسعت میں فرق تو آسکتا ہے، لیکن ظلم ختم نہیں ہوتا۔ خداوندانِ مذہب نے بھی انسان پر ظلم کیا ہے اور خداوندان

سیاست نے بھی۔ جب تک انسان پر انسان کی حکومت ہوگی یہ دنیا ظلم و زیادتی سے خالی نہ ہوگی۔ خدا کو ماننے والے اسی ظلم کے خلاف جنگ کرتے ہیں۔ وہ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے کے لیے اٹھتے ہیں اور دنیا میں صرف خدا کی حکومت چاہتے ہیں۔ اس لیے ان کی جنگ سراسر نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے ہوتی ہے۔ اگر وہ اس مقصد کے لیے نہ اٹھیں تو مجرم ہوں گے اور ان کا جرم کبھی معاف نہ کیا جائے۔

مذہب کے ماننے والوں پر پانچواں الزام یہ ہے کہ ان کی حکومت فرقہ وارانہ حکومت ہوتی ہے اور اس میں دوسرے فرقوں کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ہم جس مذہبی حکومت کا یہاں ذکر کر رہے ہیں وہ کسی خاص فرد یا کسی خاص طبقے کی حکومت نہیں ہے بلکہ خدا کے قانون کی حکومت ہے۔ اس میں اقتدارِ اعلیٰ صرف خدا کی ذات کو حاصل ہوتا ہے۔ ہر کام میں اس کی مرضی مقدم ہوتی ہے اور ہر معاملے میں پورے خلوص کے ساتھ اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ خدائے تعالیٰ اپنے اس قانون کو خود نہیں چلاتا بلکہ اسے وہ انسان چلاتے ہیں جو خدا کو حکمرانی کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کو مانتے ہیں۔

بعض لوگ عدل و انصاف کے خلاف سمجھتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کا حق کسی ایک فرقے کو سونپ دیا جائے اور دوسرے اس سے بالکل محروم رہیں۔

لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کسی قانون کو چلانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اس کا سچّا وفادار ہو اور اس کی صداقت پر پورا یقین رکھتا ہو۔ اس کے بغیر وہ خلوص کے ساتھ اسے نافذ نہیں کرسکتا۔ جو لوگ خدا کے اقتدارِ اعلیٰ ہی کو تسلیم نہ کرتے ہوں اگر اس کے قانون کے نفاذ کی ذمہ داری ان کے ہاتھ میں دے دی جائے تو کبھی اس کی تاثیر اور قوت باقی نہیں رہ سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ اس قانون کے الفاظ باقی رہ جائیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کی حقیقت اور معنویت برباد ہو جائے گی۔ خدا کے قانون کے ساتھ یہ سخت ناانصافی ہوگی کہ اس کے نفاذ کا حق ان افراد کو سونپ دیا جائے جو سرے سے اس پر ایمان ہی نہ رکھتے ہوں بلکہ اس کے منکر اور مخالف ہوں۔ اسے وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس سے کلّی اتفاق رکھتے ہیں۔ اور اس کے نفاذ اور قیام کے دل سے آرزومند ہیں۔

مذہبی حکومت ایک اصولی حکومت ہے جو خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو مان کر وجود میں آتی ہے اس میں قطعًا یہ بحث نہیں پیدا ہوتی کہ اس کے ماننے والے کس گروہ اور کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ سب کے

سب اس میں یکساں حیثیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسی حکومت میں اس بات کا کھلا ہوا امکان اور پوری گنجائش موجود ہے کہ ایک شخص جو کل تک خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کو نہیں مان رہا تھا آج اسے مان کر ان لوگوں میں شامل ہو جائے جو اسے چلانے کے اصولاً ذمہ دار ہیں۔ بلکہ اگر اس میں صلاحیت ہے تو وہ ان کا قائد اور راہنما بن سکتا ہے۔ کسی کو اس سے یہ پوچھنے کی اجازت نہ ہوگی کہ تیری ذات کیا ہے اور تو کس نسل اور خاندان سے تعلق رکھتا ہے؟

ہمیں بعض لوگوں کے اس خیال سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ مذہبی حکومت میں مخالف مذہب فرقوں کے حقوق محفوظ نہیں ہوتے۔ کیونکہ خدا کے قانون نے، جیسے آج بھی ہر شخص دیکھ سکتا ہے اپنے مخالفین اور منکرین کو اتنے حقوق دیے ہیں کہ کسی شخص کو اس معاملے میں اس سے شکایت نہیں ہو سکتی ہمارے نزدیک خدا کے قانون میں ان حقوق کا موجود ہونا اس بات کی زبردست ضمانت ہے کہ وہ عملاً محفوظ ہیں۔ کیونکہ اس قانون کو چلانے والے نہ تو اس میں ادنیٰ تغیر کر سکتے ہیں اور نہ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ خدا کی حکومت کے اندر ایک ایک فرد کی جان و مال کو اپنی جان و مال سمجھیں اور ان کی عزت و آبرو کی اپنی عزت و آبرو کی طرح حفاظت کریں۔ اگر ان کے ہاتھ سے کسی کا کوئی ادنیٰ حق بھی ضائع ہوتا ہے تو وہ اس قانون کے وفادار نہ ہوں گے۔ اور یہاں خدا کے قانون کے وفاداروں کی بحث ہو رہی ہے نہ کہ اس کے بے وفاؤں کی۔

فصل چہارم

مذہب کی تاریخ کا غلط مطالعہ

خدائے تعالیٰ ہمارا حاکم ہے اور ہم اس کے محکوم ہیں اور یہ دونوں چیزیں ازلی و ابدی ہیں۔ نہ تو ہم صرف چند معاملات میں اس کے محکوم ہیں اور نہ وہ ہماری زندگی کے کسی خاص دَور کا حاکم ہے۔ اُس کی حکومت ہم پر ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ہم دُنیا میں آنے سے پہلے بھی اس کے محکوم تھے اور دنیا میں آنے کے بعد بھی اس کے محکوم ہیں اور یہاں سے جانے کے بعد بھی اس کے محکوم ہی رہیں گے اس لیے یہ ایک سیدھی اور صاف بات ہے کہ ہم آزادی اور خودسری کی زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہمارے لیے سیدھا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ ہم اپنے گھر میں، کالج میں، مسجد میں، بازار میں، عدالت میں، سیاست میں، غرض ہر معاملے میں اور ہر قدم پر اس کی اور صرف اسی کی اطاعت کریں۔ اگر ہمارا کوئی بھی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے تو یہ ہماری صحیح اور جائز حیثیت کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن آج کے بہت سے پڑھے لکھے لوگ اس سیدھی اور سچی بات کا پوری طرح ساتھ نہیں دیتے۔ وہ اس کے ایک جزء سے تو کسی حد تک اتفاق کرتے ہیں لیکن اس کے دوسرے جزء سے انہیں سخت اختلاف ہے۔ شخصی زندگی میں اگر آپ خدا کی بندگی کو اختیار کریں تو یہ ان کے لیے گوارا ہے، لیکن اجتماعی زندگی میں وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کے نزدیک اس کی بہت سی 'دلیلیں' ہیں۔ ان میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ کسی بھی مذہب کے ماننے والے آپس میں متحد نہیں ہیں۔ ان کے درمیان شدید ترین اختلافات ہیں اور ہر اختلاف ایک زبردست نزاع کا سبب بن چکا ہے۔ ہر مذہب کے اندرونی جھگڑے اب اس مقام کو پہنچ گئے ہیں کہ خدا کا نام قوموں کے اتفاق و اتحاد کا نہیں بلکہ اختلاف و انتشار کا ذریعہ بن گیا ہے۔

خدا پر عقیدہ رکھنے والی ہر امت بے شمار گروہوں میں بٹ گئی ہے اور ہر گروہ خدا کے صرف اسی تصور کو حق سمجھتا ہے جسے اس نے قبول کیا ہے اور جو شخص اس تصور کو صحیح نہ سمجھے وہ اس کے نزدیک گمراہ اور بے دین ہے۔ مدت سے یہ جنگ صرف زبان و قلم کی جنگ ہے لیکن اگر کسی مذہب کے ماننے والوں کے ہاتھوں میں اقتدار و حکومت آجائے تو وہ ایک دوسرے کے خلاف ہی میدانِ جہاد میں کود پڑیں گے، اور یہ سرد جنگ واقعتاً فسادِ عظیم میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس لیے جو لوگ مذہب کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔ یہ محض قیاس ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے اور مذہب کی پوری تاریخ اس کی تائید میں پیش کی جاسکتی ہے۔ دنیا کو مذہبی جنگوں کے انتہائی سخت تجربات ہو چکے ہیں۔ ان تجربات سے سبق نہ حاصل کرنا بہت بڑی نادانی ہوگی۔

اس کے جواب میں یہاں چند باتیں میں کہوں گا۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ اگر تاریخ مذہب کا "حاصل مطالعہ" یہی ہے کہ وہ فروعی اختلافات اور مذہبی جھگڑوں کی تاریخ ہے تو یہ اس کا بہت ہی غلط اور ناقص مطالعہ ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین میں اور اس کی قوت اور تاثیر سے دنیا کے دوسرے حصوں میں ایک ایسا دور گزر چکا ہے، جب کہ ہر طرف خدا اور آخرت کا تصور چھایا ہوا تھا۔ اسی تصور کے تحت فرد کے شعور کی تربیت ہوئی تھی اور عملی زندگی پر بھی اسی کی گرفت قائم تھی۔ خدا پر یقین انسان کے فکر کی اساس بھی تھا اور عمل کی اساس بھی۔ وہ ہر معاملے میں خدا ہی کو آخری اتھارٹی سمجھتا تھا۔ اور خدا کے فیصلے کے مقابلے میں اس کے ذاتی فیصلے کی حیثیت کالعدم ہوتی تھی۔ جس طرح آج اجتماعی زندگی کی ہر ادا بول رہی ہے کہ نہ خدا ہے اور نہ ہم اس کے بندے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس وقت زندگی اس حقیقت کی ترجمان تھی کہ خدا ہے اور وہی اقتدار و حکومت کا جائز مالک ہے، کوئی شخص نہ تو اپنے انفرادی دائرے میں اس کے حکم سے سرتابی کو جائز سمجھتا تھا اور نہ اجتماعیت کا کوئی گوشہ اس کے اقتدار سے آزاد تھا۔ عدالت کے فیصلے خدا کے قانون کے تحت ہوتے تھے اور تہذیب و معاشرت میں خدا کی خدائی اور انسان کی بندگی کی روح نمایاں تھی۔ ایک طرف فرد اس تصور کے تحت اپنے تمام معاملات طے کرتا تھا کہ آخرت میں اسے خدا کے حضور جواب دہی کرنی ہے اور دوسری طرف پورا معاشرہ بندگی کے جذبات سے سرشار تھا۔

تاریخ ہم سے کہتی ہے کہ اس دور میں لوگ نہ ایک دوسرے کی گردن کاٹتے تھے اور نہ جماعتی زندگی میں کسی قسم کا فساد اور بگاڑ تھا۔ بلکہ اس کے برعکس جن خاندانوں اور قبیلوں کے درمیان مدتوں سے جنگیں جاری تھیں، وہ ختم ہوگئیں اور ان میں اتنی رواداری اور وسعت ظرف پیدا ہوگئی کہ وہ اپنی قدیم ترین دشمنیاں بھول گئے۔ معاشرے میں الفت و محبت کی ایسی فضا چھا گئی کہ عرصہ سے نفرت و عداوت کی جو آگ جل رہی تھی وہ ایک دم ٹھنڈی پڑ گئی اور جو قوم متحارب گروہوں اور جماعتوں میں بٹی ہوئی تھی وہ ایسے کنبہ اور خاندان میں تبدیل ہوگئی کہ اس کا ہر فرد دوسرے کا خیر خواہ اور ہمدرد تھا۔ تاریخ میں اس دور کے موجود ہوتے ہوئے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی بندگی سے اتفاق و اتحاد پیدا نہیں ہوتا اور اجتماعیت خراب ہوتی ہے، خدا کو ماننے والے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور ان کا کردار غیر مہذب اور ناشائستہ ہوتا ہے۔ تاریخ کی یہ صریح تحریف ہے نہ کہ صحیح تعبیر۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ بعض لوگ خدا اور مذہب کے نام پر ہونے والی ہر غلطی کو خدا اور مذہب پر ایمان کی غلطی شمار کرتے ہیں۔ یہ استدلال کی خامی ہے اور بالکل کھلی ہوئی خامی ہے۔ ان کی تنقید تو ہوتی ہے خدا کو ماننے والوں کی سیرت پر، لیکن سمجھتے ہیں کہ ایمان باللہ پر تنقید کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسی نظریے کے حاملین کی سیرت کی خرابی سے لازماً اس نظریے کی خرابی ثابت نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ نظریہ صحیح ہو اور سیرت میں بگاڑ کے اسباب دوسرے ہوں۔ انسانی اعمال کے محرکات اتنے زیادہ ہیں کہ ان سب کا شمار کرنا بھی دشوار اور پھر یہ کہ وہ سب کے سب ہر وقت ہمارے سامنے ہوتے بھی نہیں، اس لیے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ کون سا عمل کس محرک کا نتیجہ ہے۔ مذہب کی مخالفت کرنے والے اس دشواری کو شاید محسوس نہیں کرتے، یا محسوس کرتے ہیں تو قصداً اسے نظر انداز کر جاتے ہیں، ورنہ انسان کے ہر غلط عمل کو وہ اس کے عقیدے کی طرف منسوب نہ کرتے۔ جہاں ایک عمل کے ہزار محرک ہوسکتے ہیں وہاں یہ بہت بڑی زیادتی ہے کہ محض عقیدے کو اس کا محرک قرار دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کو ماننے والوں کی جماعتی زندگی آج اچھی نہیں ہے اور ان کے درمیان بے شمار مذہبی جھگڑے موجود ہیں، لیکن جب تک یہ ثابت نہ ہوجائے کہ یہ خرابیاں ایمان باللہ کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہیں، اس وقت تک یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ خدا کو ماننے سے اجتماعی زندگی میں خرابی پیدا ہوتی اور مذہبی جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر موجودہ دور جمہوریت کا دور ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج جس طرح جمہوریت کا خون ہو رہا ہے شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ جمہوریت کا دعویٰ کرنے والوں کے اعمال کی بنیاد پر اگر آپ مجھے جمہوریت کے بارے میں فیصلے کی اجازت دیں، تو میں یہ کہوں گا کہ جمہوریت ایک مخصوص طبقے کی حکمرانی اور لوٹ کھسوٹ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس کے باوجود آج ہر شخص جمہوریت کا ثناخواں ہے اور کوئی بھی اس کی مخالفت کرنا نہیں چاہتا اور جمہوریت کے نام سے جو بے عنوانیاں ہوتی ہیں انکے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ افراد کی کوتاہیاں ہیں، جنہیں نہ ہونا چاہیے۔

اسی طرح دنیا میں غلامی کے خلاف نظریات وجود میں آتے ہیں، جبر و تشدد کے خلاف آوازیں اٹھتی ہیں، ظلم اور ناانصافی ختم کرنے کے دعوے کیے جاتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود دعویٰ کرنے والوں کی زندگیاں آج ان جرائم سے پاک نہیں ہیں۔ اس کے باوجود ہم ان نظریات کو باطل نہیں سمجھتے۔ پھر یہ ہماری کیسی تنگ نظری ہے کہ استدلال کا یہی طریقہ خدا کے بارے میں سوچتے وقت اختیار کرنے کے لیے ہم آمادہ نہیں ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہمارا فیصلہ غلط ہے اور ہم نے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے؟

۳۔ تیسری بات یہ کہ دنیا میں کوئی بھی نظریہ ان ہی افراد کو اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے جو اسے حق سمجھ کر کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ ایسے افراد کی زندگیاں اس نظریے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں اس لیے اس کی حقیقی ترجمان ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے افراد کسی نظریہ کو بالعموم اس کے دورِ حکومت میں نہیں ملتے، بلکہ دعوتی مرحلہ انسانوں میں سے انہیں چنتا اور اپنے ڈھنگ پر ان کی تربیت کرتا ہے۔ جو نظریہ حکمرانی کے دور سے گزر رہا ہو اس کے ساتھ انسان کے بہت سے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ وقت محض مخلصین کے وجود کا نہیں ہوتا بلکہ مخلصین کی صف میں غیر مخلصین بھی شامل ہو جاتے ہیں اور دشمن بھی دوستی کا سوانگ بھرنے لگتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی با اقتدار نظریہ پر ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں بہت سے لوگ محض اس لیے بھی شامل ہو جاتے ہیں کہ سوسائٹی میں ان کا ایک مقام پیدا ہو جائے۔ حالانکہ ان کے دل اس کے قبول کرنے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہوتے۔ جن نظریات کے ہاتھ میں اقتدار و حکومت ہوتی ہے ان پر زمانے کے گزرنے کے ساتھ ایک وہ وقت بھی آتا ہے کہ اس پر ایمان رکھنے اور اس کی صحیح ترجمانی کرنے والوں کی تعداد

گھٹ کر آٹے میں نمک کے برابر رہ جاتی ہے اور ان افراد کا غلبہ ہو جاتا ہے جو اس کے نام کو محض اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ کی یہ کوتاہی ہمیشہ دیکھی گئی ہے کہ وہ کسی نظریے کو اس کے دورِ دعوت میں قابلِ التفات نہیں سمجھتی اور یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتی کہ یہ نظریہ کس قسم کی سیرت اور کردار پیدا کر رہا ہے۔ بلکہ تاریخ کی توجہ اس کی طرف اس وقت ہوتی ہے جب وہ اقتدار پر آجاتا ہے۔ حالانکہ اس دور میں اس نظریے کی حمایت کرنے والے افراد کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ واقعتاً وہ نظریہ ان کے اندر محرکِ عمل کی حیثیت سے داخل ہو چکا ہے یا اس نظریے سے حاصل ہونے والے مفادات ان کو اس کا ساتھ دینے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ ان محرکات کی تحقیق کیے بغیر یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ اس نظریے کے نام پر جو بھی عمل وجود میں آئے اسے اسی نظریے کی پیداوار سمجھ لیا جائے۔ جن افراد کا ضمیر کسی نظریہ کے حق ہونے کی گواہی نہ دے وہ ان کے لیے کبھی محرک کا کام نہیں دے سکتا۔ ان کے اعمال کو خود ان کی ذات کی طرف منسوب کرنا چاہیے نہ کہ اس نظریے کی طرف جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔

خدا کو ماننے والے بھی حکومت کے دور سے گزرے ہیں۔ یہ دور اپنی خوبیوں کے ساتھ اس وقت تک جاری رہا، جب تک کہ اہلِ اخلاص اس کی قیادت کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ مخلصین کا یہ طبقہ ختم ہونے لگا اور منافقین نے ان کی جگہ لینی شروع کر دی۔ پختہ سیرت افراد کم سے کم تر ہو گئے اور خام کردار انسانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اس دور میں خدا کے نام پر حکومت کا ڈھانچہ تو باقی تھا، لیکن خدا کا نام لینے والے بے شمار کمزوریوں اور خامیوں کا شکار ہو گئے۔ مذہبی نزاعات، فروعی جھگڑے باہمی اختلافات اور تکفیر و تفسیق کے ہنگامے اسی دور کی پیداوار ہیں۔ آج کے پڑھے لکھے لوگ حقیقتاً اسی دور پر تنقید کرتے ہیں اور ان ہی کمزور سیرت کے لوگوں کو سامنے رکھ کر اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔ اگر وہ ان اشخاص کی سیرت کا مطالعہ کریں جو صحیح معنی میں مومن اور خدا کے دین کے ترجمان ہیں تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑے گا اور وہ ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہوں گے۔

کسی نظریے پر غور و فکر کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ اس کا نام لینے والے ہر شخص کی زندگی کو دلیل بنایا جائے بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ براہ راست اس نظریے کا علمی و عقلی تجزیہ کیا جائے کہ اس سے انسان

ہیں کس قسم کا سیرت وکردار وجود میں آسکتا ہے اور کس قسم کا کردار اس سے مناسبت نہیں رکھتا ۔ تاریخ اگر اس تجربے کی تائید کرتی ہے تو ایک حقیقت کی تائید کرتی ہے اور تردید کرتی ہے تو سمجھا جائے گا کہ اس نظریے کے ماننے والے اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔

اس پہلو سے جب ہم غور کرتے ہیں تو ہماری عقل کہتی ہے کہ ایمان باللہ سے انسان میں اخلاقی گراوٹ نہیں پیدا ہو سکتی ۔ خدا کو ماننے کے بعد اس کے اعمال میں حسن وخوبی اور اس کے کردار میں لازمًا بلندی آنی چاہیے ۔ لیکن اس کے برعکس اگر اس کی روش، تہذیب وتمدن میں، سیاست ومعاشرت میں، انفرادی سلوک اور اجتماعی معاملات میں، غرض کسی بھی میدان میں راہ راست سے ہٹی ہوئی ہے تو یہ اس کے کردار کی خامی ہے نہ کہ اس کے ایمان کا نتیجہ ۔ اس لیے جو لوگ خدا پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، اگر وہ اعلیٰ سیرت کے مالک ہیں اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کر رہے ہیں تو یقینًا ہمارے نزدیک خدا کے دین کے ترجمان ہیں ۔ لیکن جن افراد کی زندگیوں میں یہ اخلاقی خوبیاں موجود نہیں ہیں ہم انہیں کبھی بھی خدا کے دین کا ترجمان نہیں کہہ سکتے، خواہ وہ حلق کی پوری قوت کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان کیوں نہ کر رہے ہوں ۔

تاریخ ہمارے سامنے دو طرح کی مثالیں پیش کرتی ہے ۔ کچھ مثالیں تو وہ ہیں جن سے ایمان باللہ کے بارے میں ہماری عقل جس نتیجے پر پہنچتی ہے، اس کی تائید ہوتی ہے ۔ اور بعض مثالیں ایسی ہیں جو اس نتیجے کی تردید کرتی ہیں ۔ اگر تاریخ صرف دوسری ہی قسم کے مثالوں سے روشناس ہوتی تو یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ شاید ہماری عقل کا اخذ کردہ نتیجہ صحیح نہیں ہے لیکن جب یہ نتیجہ اپنی تائید میں ایک دو نہیں بے شمار مثالیں پیش کرتا ہے تو یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ اس خالص عقلی نتیجے کو توڑ کر دیا جائے اور ان ادوار اور شخصیتوں کو دلیل کے طور پر استعمال کیا جائے جن میں خدا پر ایمان ایک زندہ حقیقت کے طور پر موجود نہیں تھا بلکہ مر چکا تھا۔

خدا پر ایمان نے انسانوں کی ایک بڑی تعداد میں تعصب وتنگ نظری کے بجائے وسعت خیال اور رواداری پیدا کی ہے، غصہ اور انتقام کی جگہ عفو ودرگزر کے جذبات ابھارے ہیں ۔ انہوں نے ہر ایک کے ساتھ اخوت وہمدردی کا سلوک کیا ہے، دشمنوں تک سے اس کا رویہ پیار اور محبت کا رہا ہے ۔ انسانیت کا یہ طبقہ خدا اور اس کے دین کے بارے میں ہر غلط استدلال کی کھلی ہوئی تردید ہے۔

(باب دوم)

فصل اوّل

خدا کی تلاش

خدا کا سوال ہمارے لیے ایک ان دیکھی حقیقت کا سوال ہے۔ ہمیں ایک ایسی حقیقت کو معلوم کرنا ہے، جو ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہے۔ یہ کام ہماری عقل کا ہے۔ لیکن عقل کو اس نازک کام پر لگانے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے حدود دکار کہاں تک وسیع ہیں اور اس کے کام کی صحیح نوعیت کیا ہے؟ اس کے بغیر ہم جان نہیں سکتے کہ خدا کی ذات اور اس کی صفات کو سمجھنے میں وہ کس حد تک ہماری راہنمائی کرسکتی ہے؟

عقل کے دو کام

عقل کے دو کام ہیں ایک یہ کہ اس کائنات کا ہمارے حواس جیسا کچھ مطالعہ کرتے ہیں، ٹھیک ٹھیک اس کی ترجمانی کرے، کیونکہ ہم براہ راست حواس سے معلومات نہیں حاصل کرتے، بلکہ عقل جب حواس کے مطالعۂ اشیاء کو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے تو ہمیں ان کا علم ہوتا ہے۔ اگر عقل اپنا کام انجام نہ دے تو حواس کا مطالعہ ہمارے لیے بے کار رہے۔ بعض اوقات ایک واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے وجود میں آتا ہے لیکن اس کا ہمیں شعور نہیں ہوتا، کیونکہ جس وقت آنکھ دیکھ رہی تھی عقل اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ سوتے میں کان کے پردوں سے آواز ٹکراتی ہے لیکن یہ آواز ہمارے لیے سکوں سے مختلف نہیں ہوتی۔ ایک پاگل کے حواس جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ اس کے لیے بالکل مفید نہیں ہے کیونکہ اس کی عقل اس کے حواس کے اعمال کو اپنی گرفت میں نہیں لیتی۔

عقل کا جہاں یہ کام ہے کہ وہ حواس کے مطالعہ کو ہم تک پہنچائے، وہاں اس کا یہ بھی فرض ہو کہ

اگر حواس اشیاء کے مطالعہ میں غلطی کر رہے ہوں تو اس کی اصلاح کرے اور بتائے کہ حواس نے کہاں غلطی کی ہے۔ اس لیے کہ ہم حواس پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ عقل پر اعتماد کرتے ہیں۔ اگر ہماری آنکھ کسی بڑی چیز کو فاصلہ سے چھوٹی دیکھتی ہے تو ہم کبھی بھی اس کو چھوٹی نہیں سمجھتے بلکہ اسے آنکھ کے مطالعہ کا نقص تصور کرتے ہیں کہ وہ دور سے کسی چیز کو اس کے حقیقی طول وعرض کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔ اسی طرح بیماری نے اگر ہمارا ذائقہ خراب کر دیا ہے تو ہم اپنے ذائقہ کی بنیاد پر کسی چیز کی لذت کا فیصلہ کرنے کی جرأت نہیں کرتے، کیونکہ عقل ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ اس وقت ہماری قوت ذائقہ صحیح معلومات نہیں فراہم کر رہی ہے غرض یہ کہ حواس کے مطالعہ کی ہر غلطی کو واضح کرنا عقل کا کام ہے۔ اسی وجہ سے جب ہم کسی شئے کے ادراک میں غلطی کرتے ہیں تو اس کا الزام حواس پر نہیں لگاتے بلکہ اپنی عقل کو قصور وار سمجھتے ہیں کہ وہ حواس کی غلطی کو سمجھ نہ سکی اور ان پر اس سے زیادہ اعتماد کر لیا جتنے اعتماد کے وہ اصلاً مستحق تھے۔

عقل کا دوسرا کام استنباط اور استدلال ہے۔ وہ صرف حواس کا مطالعہ ہمارے سامنے نہیں پیش کرتی بلکہ اس مطالعہ کی بنیاد پر غیر محسوسات تک پہنچ جاتی ہے۔ حواس کا یہ نقص ہے کہ جب تک کوئی چیز محسوس نہ ہو وہ اس کا ادراک نہیں کر سکتے اور جو چیز محسوسات کے دائرے سے باہر ہوتی ہے وہ ان کے مطالعہ سے بھی باہر ہوتی ہے۔ گرمی اور سردی، سختی اور نرمی کا احساس ان کو اسی صورت میں ہوتا ہے، جبکہ فی الواقع ان کا وجود ہو۔ آنکھ کے سامنے اگر کوئی چیز حائل نہ ہو تو وہ دیکھ سکتی ہے۔ لیکن پردے کے پیچھے وہ کسی چیز کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس کے برخلاف عقل اشیاء کا مجرد تصور کر سکتی ہے۔ بادل کے اندر سے آفتاب کو دیکھنا اس کے لیے دشوار نہیں ہے۔ جو چیزیں حواس کے مطالعے میں رکاوٹ ہیں وہ اس کے مطالعہ میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ اپنی اسی صلاحیت کی بنا پر وہ استدلال اور استنباط کرتی ہے۔ آنکھ اگر دور سے صرف دھواں دیکھ رہی ہے تو اس کی مدد سے عقل آگ کا تصور کر لیتی ہے۔ نغمہ کی آواز اس کو بتا دیتی ہے کہ پردے کے پیچھے کوئی نغمہ سرا ہے۔ نقش کا وجود اس کے اندر نقّاش کا یقین پیدا کر دیتا ہے۔ شکستہ کھنڈر اس کے سامنے ماضی کا نقشہ پیش کر دیتے ہیں اور نشانات قدم سے وہ منزل کا پتہ لگا لیتی ہے۔ اپنی اسی قوتِ استدلال کی بنا پر عقل اشیاء کی حقیقتیں اور ان کی خاصیات معلوم کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ آگ، پانی، مٹی اور کوئلہ کے اثرات کو دیکھ کر اس نے ان کی خصوصیات کا پتہ لگایا اور علم وفن، تہذیب و تمدّن اور صنعت وحرفت میں نئی نئی دریافتیں

کیں اور انہیں آگے بڑھایا۔[1]

خدا کائنات کی علت ہے

معلول کے ذریعہ علت کا تصور یہ عقل کا عام اصول ہے، اس سے وہ زندگی کے تمام معاملات میں کام لیتی ہے۔ عقل کے اسی مسلمہ اصول کا تقاضا ہے کہ وہ خدا کی ذات پر یقین کرے۔ اس کائنات کا ایک واقعہ کے طور پر موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ایک خالق ہے۔ انسان کو احساس کی مختلف قوتیں دی گئی ہیں، وہ اپنے جس احساس کو بھی یہاں کام میں لاتا ہے خدا کی کسی نہ کسی نشانی کو محسوس کرتا ہے۔ وہ جو بھی چیز دیکھتا اور سنتا ہے اس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کہاں سے آئی اور اس کو کس نے وجود عطا کیا؟ اور جب تک وہ خدا کو مان نہ لے یہ سوال ختم نہیں ہوتا۔ خدا کا انکار دراصل اپنے احساسات کا انکار ہے۔

مکان کے تصور کے ساتھ عقل اس کے بنانے والے کا آسانی سے تصور کر لیتی ہے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص مکان نہ بنائے وہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ ٹھیک اسی اصول کے تحت کائنات کو دیکھ کر اسے کائنات کے خالق کا تصور کرنا چاہیے۔ اگر عقل خدا کا تصور نہیں کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے فطری اصول سے انحراف کر رہی ہے وہ ایک واقعہ کو دیکھ رہی ہے لیکن اس کے محرک پر یقین نہیں کرتی، معلول کا مشاہدہ کر رہی ہے اور علت کا انکار کرتی ہے۔

ایک اعتراض

یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے وہ یہ کہ انسان اسی وقت معلول سے علّت کا تصور کرتا ہے جب کہ وہ علت کو جانتا ہو۔ ہم نے مکان ہی کو نہیں دیکھا

---

[1] عقل ایک کام اور بھی کر سکتی ہے وہ یہ کہ حواس کی مدد سے جن اشیاء کی صورتیں اسے معلوم ہوں، ان میں حسبِ منشا تغیر کر کے کوئی خیالی صورت ہمارے سامنے پیش کر دے۔ وہ حواس کے فراہم کردہ مواد سے ایک ایسی حسین تصویر بنا سکتی ہے جس کا حواس کبھی ادراک نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ایسے باغ کا تصور کرنا دشوار نہیں ہے جس کے پیڑ زمرد کے ہوں اور جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں۔ گو عالم واقعہ میں اس قسم کے باغ کا کہیں وجود نہیں ہے۔ عقل کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اسے حواس نے دودھ، شہد اور زمرد کا تصور الگ الگ دے رکھا ہے۔

چونکہ عقل کا یہ کام فرضی اور غیر واقعاتی ہے اس لیے ہم نے الگ سے اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اسی لیے انسان جب حقائق کی دنیا میں ہوتا ہے تو عقل اس قسم کے فرضی واقعات کا تصور کرنے سے گریز کرتی ہے۔

بلکہ اکثر یہ بھی دیکھا ہے کہ مکان اسی وقت وجود میں آتا ہے جب کہ اس کا کوئی بنانے والا ہو، اس لیے کسی بھی مکان کے تصور کے ساتھ اس کے بنانے والے کے تصور میں ہمیں کوئی زحمت پیش نہیں آتی۔ کیونکہ جب معلولات کی نوعیت ایک ہے تو ان کی علتیں بھی ایک ہی نوعیت کی ہونی چاہئیں۔ اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا یعنی ہم صرف مکان دیکھتے اور یہ نہ جانتے کہ وہ کیسے وجود میں آیا ہے تو ہرگز ہمارے ذہن میں یہ تصور نہ آتا کہ اسے کسی بنانے والے نے بنایا ہے۔ مطلب یہ کہ جہاں ہم معلول کے ذریعہ اس کی علت تک پہنچتے ہیں وہاں اس نوعیت کے سلسلہ علت و معلول کا اس کثرت سے ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ اس کے خلاف سوچ ہی نہیں سکتے۔ یہ دراصل اپنے سابقہ تجربات کی تصدیق و تصویب ہے۔ اس اصول کو ہم ایسی صورت پر چسپاں نہیں کر سکتے جہاں صرف معلول ہمارے سامنے ہو اور علت کو کبھی ہم نے نہ دیکھا ہو۔ کائنات اور خدا کے بارے میں ہمیں اسی دوسری صورت سے سابقہ درپیش ہے۔ ہم کائنات کا تو مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن اس کے خالق کو نہ تو کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھ سکتے ہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ کائنات کے مشاہدے سے عقل خدا کے یقین پر مجبور ہو۔

اعتراض کا جواب

لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ ہم معلول کے ذریعہ علّت کا تصور اس لیے کرتے ہیں کہ ہم نے علّت کا مشاہدہ کیا ہے۔ کیونکہ ہم نے جن چیزوں میں علت اور معلول کے تعلق کو دیکھا ہے وہ ان چیزوں سے مختلف ہیں جن کے درمیان ہم نے اس تعلق کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، خواہ وہ صورت و شکل کے اعتبار سے باہم مشابہ ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود ہمیں ان کی علّت میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ ہم نے چند مکانات کو دیکھا کہ وہ اسی وقت پائے گئے جبکہ ان کو بنانے والوں نے بنایا۔ اس بنیاد پر جب بھی ہم کسی مکان کو دیکھتے ہیں تو فوراً یہ یقین ہمارے اندر پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کا یقیناً کوئی بنانے والا ہے جس نے اسے بنایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بہت تھوڑے سے واقعات کی علتوں کا مشاہدہ کیا ہے ان کے مقابلہ میں بڑی تعداد ان واقعات کی ہے جن کی علتوں کو قطعاً ہم نے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی بھی علتیں ہیں۔ کیونکہ جب چند واقعات یہ بتا رہے ہیں کہ وہ علّت کے محتاج ہیں تو ان جیسے دوسرے واقعات بھی یقیناً بغیر علت کے وجود میں نہیں آسکتے۔ ان دونوں صورتوں میں ہمارے یقین میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جن چیزوں کی علت کا ہم نے مشاہدہ نہیں کیا ہے، ان کی علت پر بھی ہمیں اسی قدر یقین ہوتا ہے جس قدر کہ اپنے مشاہدے

سے معلوم کی ہوئی علتوں پر ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت ہم مجبور ہیں کہ خدا کی ذات پر یقین کریں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کی ذات ہمارے حواس سے ماورٰی ہے، لیکن سلسلۂ علت و معلول کی اگر کوئی حقیقت ہے اور اس حقیقت کا انکار ہم کر نہیں سکتے تو خدا تعالیٰ کا وجود بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اگر ہم خدا کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ اس کو ہم نے اس کائنات کی علت کی حیثیت سے نہیں دیکھا ہے تو پھر ہمیں ان تمام علتوں کا انکار کرنا چاہیے جن کا ہم نے کوئی مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ جو اصول ایک جگہ نافذ ہے وہ دوسری جگہ نافذ نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم ایک خاص حد میں علت و معلول کے انطباق کے عادی ہو چکے ہیں اور اسے وسیع کرنا نہیں چاہتے۔

علت ایک غیر مرئی حقیقت ہے

اس سے آگے غور کیجیے! کیا آج تک ہم نے کسی علت کو دیکھا ہے یا دیکھ سکتے ہیں؟ یہ ایک واقعہ ہے کہ علت ایک غیر مرئی اور غیر محسوس شے ہے، جو ہمارے احساسات کے حدود سے باہر ہے۔ ہم نے جو کچھ دیکھا ہے وہ علت نہیں بلکہ اس کے مظاہر ہیں۔ اگر ہمارے سامنے یہ مظاہر نہ ہوں تو ہم جان بھی نہیں سکتے کہ کونسی چیز کس واقعہ کی علّت ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں واقعہ، فلاں دوسرے واقعہ کی علت ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کے نتیجے میں دوسرا واقعہ وجود میں آیا۔ ہم جانتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے اور قتل سے آدمی ہلاک ہوتا ہے، اور اپنے اس علم پر ہمیں پورا یقین بھی ہے۔ اگر ہمیں یہ اطلاع ملے کہ زید کا مکان جل گیا، یا خالد قتل کر دیا گیا تو ہمیں اس امر میں کبھی ذرّہ برابر شبہ نہیں ہو سکتا کہ مکان کے جلنے کا سبب آگ ہے اور قتل کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ قتل اور ہلاکت اور آگ اور جلنے کے درمیان جو تلازم پایا جاتا ہے اسی کا نام علت ہے۔ آگ میں کوئی چیز ہے جس کی وجہ سے وہ جلاتی ہے۔ اسی طرح قتل اپنی کسی خصوصیت کی بنا پر ہلاکت کا سبب بنتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جو ہم سے چھپی ہوئی ہے۔ اگر آگ نے اپنی علت کا اظہار جلانے کی شکل میں نہ کیا ہوتا تو ہمیں اس کا قطعاً علم نہ ہوتا کہ وہ جلانے کی علت ہے اور وہ ہمارے لیے برف یا پتھر کی قسم کی ایک چیز ہوتی جن میں ہم جلانے کی علت نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح قتل سے آدمی کے ہلاک ہونے کا تجربہ ہم نے نہ کیا ہوتا تو ہم کبھی یہ جان نہیں سکتے تھے کہ قتل ہلاکت کی علّت ہے۔

خدائے تعالیٰ اس کائنات کی علت ہے۔ جب ہم علت کا مشاہدہ نہ کرنے کے باوجود اس پر یقین رکھتے ہیں تو خدا کے انکار کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ اگر خدائے تعالیٰ کا دیکھنا اس پر ایمان کے لیے ضروری

ہے تو ہمیں کسی بھی علّت پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔

بعض اور غیر مرئی حقیقتیں

صرف ایک علت ہی نہیں بلکہ بہت سی حقیقتیں ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن ان کے آثار و علامات کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ ان کا انکار نہ کریں۔ مثال کے طور پر ہمارے اعضاء و جوارح اس کے ہر فیصلے اور ہر حکم کے پابند ہیں، ان کا فرض ہے کہ وہ جس کام کا حکم دے اسے انجام دیں اور جس کام سے منع کرے اس سے باز رہیں۔ ارادے اور شعور ہی کی وجہ سے انسان کے اعمال کی اہمیت ہے، وہ اچھّے یا برے کہلائے جاتے ہیں اور اُن پر قانونی اور اخلاقی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ شعور اور قصد کو اگر ہمارے اعمال سے الگ کر لیا جائے تو وہ بے معنی حرکات ہیں، نہ تو ان کی خوبی کی داد دی جا سکتی ہے اور نہ خرابی کی مذمت ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قصد و شعور کے ساتھ وجود میں آنے والے اعمال ہیں اور ان اعمال میں جن کے پیچھے قصد و شعور نہیں ہوتا، ہم فرق کرتے ہیں۔ انسان قصد و شعور رکھتا ہے، لہٰذا اس کے احتساب کے لیے قانون وجود میں آیا ہے، اس کے برعکس جمادات و نباتات مسلوب الارادہ ہیں اس لیے ان کا احتساب کرنے والا کوئی قانون بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کسی پہاڑ کے دامن میں بیٹھے ہوئے ہوں اور پہاڑ پر سے ایک پتھر لڑھکتا ہوا آئے اور آپ کو ہلاک کر دے تو کوئی شخص پتھر سے باز پرس نہیں کرے گا۔ لیکن اگر کوئی انسان آپ پر گولی چلا دے تو قانون حرکت میں آجائے گا اور اسے سولی پر چڑھا دے گا، یہ فرق کیوں ہے؟ اس لیے کہ پتھر شعور سے خالی ہے اور انسان صاحبِ شعور ہے۔

غور کیجیے! اتنی بڑی حقیقت جس کی بنیاد پر ہم انسان کی موت و حیات کا فیصلہ کرتے ہیں، وہ قطعاً ہماری نگاہ سے چھپی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس پر یقین رکھنے پر مجبور ہیں۔

یہی معاملہ روح کا ہے۔ یہ بات ہر شبہ سے بالاتر ہے کہ ہمارے اندر ایک ایسی چیز ہے (آپ اسے جس نام سے چاہیں تعبیر کریں) جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے اور جب تک جسم سے اس کا تعلق ہے ہم زندہ ہیں اور جب یہ تعلق منقطع ہو جائے گا ہماری زندگی ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس یقین کے ساتھ آج تک کوئی شخص یہ نہیں معلوم کر سکا کہ روح کیا ہے اور جسم سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے، ہمارے حواس کی گرفت سے وہ ہمیشہ دور ہی رہی ہے۔ اسے ہم حواس کی نارسائی سمجھتے ہیں اور روح کا انکار نہیں کرتے۔

اب آپ فیصلہ کیجیے کہ اس سے زیادہ لغو اور غلط بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت بلکہ اصل حقیقت کا انکار اس لیے کریں کہ ہم نے اپنے حواس کے ذریعہ اسے محسوس نہیں کیا کہ وہ اس کائنات کی حقیقت ہے ؟ جسم کا محتاجِ روح ہونا ہمارے نزدیک روح کے وجود کی دلیل ہے اور شعور پر ہمارا الیقین اس لیے ہے کہ جسم کے اعضاء اس کے تابع ہیں تو یہ کائنات جس ہستی کی محتاج ہے کیا وہ اس کے وجود کی دلیل نہیں ہے ؟ اگر یہ دلیل ناکافی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ کسی دعوے کے اثبات کے لیے آج تک اس سے بڑی دلیل فراہم نہیں ہو سکی ہے ۔

خدا کے علت کائنات ہونے کا مفہوم

خدائے تعالیٰ کو اس کائنات کی علت ماننے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کائنات کا ظہور خدا کی ذات سے اسی طرح ہوا جس طرح علت سے معلول کا ظہور ہوتا ہے ؛ آفتاب کا وجود روشنی کی علت ہے ۔ جب آفتاب طلوع ہوگا لازمًا روشنی پھیلے گی ، یہ آفتاب کا ارادی فعل نہیں ہے ، بلکہ وہ اپنی صفات وخصوصیات کے لحاظ سے مجبور ہے کہ طلوع ہونے کے ساتھ ساتھ روشنی بھی لائے ، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا کہ طلوع تو ہو لیکن روشنی نہ دے ۔ دوسرے الفاظ میں خدا کو اس کائنات کی علّت ماننے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پیدا کرنے میں خدائے تعالیٰ کا قصد و ارادہ شامل نہیں ہے ، بلکہ اس کائنات کا وجود خدا کے وجود کا جبری و لازمی نتیجہ ہے ۔

اور پھر علت و معلول کے تعلق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علت کے ساتھ ہی معلول بغیر کسی تاخیر کے وجود میں آتا ہے اور جب تک علت باقی رہتی ہے معلول بھی باقی رہتا ہے ، معلول اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب کہ خود علت فنا ہو جائے ۔ یعنی خدا اور کائنات کے درمیان علت و معلول کے تعلق کو ماننے کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس بات کو بھی مان لیں کہ کائنات کا وجود و بقا خدا کے وجود و بقا کے ساتھ وابستہ ہے ۔ جب سے خدا ہے یہ کائنات بھی ہے اور جب تک خدا ہے یہ کائنات بھی باقی رہے گی ۔

علت و معلول کا یہ تصور خدا اور کائنات کے تعلق پر منطبق نہیں ہوتا ۔ کیونکہ خدا اور کائنات کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت اگر ٹھیک وہی ہے جو علت اور معلول کے تعلق کی ہے ، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ کائنات کے بارے میں ہمارا مطالعہ غلط ہے ۔ کائنات کے مطالعہ سے ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ

کائنات از خود وجود میں نہیں آئی، بلکہ وہ اپنے ظہور میں ایک ایسی ہستی کی محتاج ہے، جس کا وجود اس کائنات کے وجود سے پہلے تھا اور جو اپنی علّت آپ ہے۔ گویا ہم یہ مانتے ہیں کہ کائنات اس ہستی کے بعد وجود میں آئی جس نے اسے پیدا کیا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ وہ ہستی اس کائنات کی اسی طرح علت ہے جس طرح آفتاب روشنی کی علت ہے تو اس زمانی فرق کا انکار کرتے ہیں جو اس کائنات اور اس کو پیدا کرنے والی ہستی کے درمیان ہے۔ اس سے از خود ہمارے اس یقین کی تردید ہو جاتی ہے کہ کائنات کو کسی ہستی نے پیدا کیا ہے۔

اسی بات کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں۔ کائنات اور سببِ کائنات۔ ظاہر ہے سببِ کائنات کا وجود کائنات کے وجود سے پہلے تھا ورنہ وہ کائنات کا سبب نہیں بن سکتا تھا اگر یہ کہا جائے کہ سبب کائنات اور کائنات دونوں ایک ساتھ پائے گئے تو یہ تقدیم و تاخیر ختم ہو جاتی ہے اور ہم ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کائنات کسی عملِ تخلیق کا نتیجہ نہیں ہے۔

کیا خدا کائنات کا محض محرک اوّل ہے؟

کائنات کی تخلیق کے بارے میں علت کے مذکورہ بالا تصور کو موجودہ دور کے علمی حلقوں نے قبول نہیں کیا ہے۔ البتہ ان حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ کائنات اپنے آغاز میں تو ایک سبب اور محرک کی محتاج رہی ہے، لیکن اب اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر واقعہ جو یہاں وجود میں آتا ہے از خود دوسرے واقعہ کو جنم دیتا ہے جب تک کائنات میں یہ قوت باقی ہے وہ باقی رہے گی اور جس دن یہ قوت ختم ہو جائے گی وہ کائنات کے فنا کا دن ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ کائنات کی موجودہ ہیئت سے پہلے اس کا مواد یہاں موجود تھا یہ مواد ذرات کی شکل میں تھا اور جامد و ساکن پڑا ہوا تھا، پھر یہاں کوئی ایسا نامعلوم واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں مختلف حرکت کرنے والے سیارے وجود میں آگئے۔ سیاروں کی یہی حرکت ان میں ہر قسم کی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے اسی سے ہماری زمین بھی مختلف انقلابات سے گزرتی ہے، موسم بدلتے ہیں، خشک سالی و سیلاب آتے ہیں، موت و حیات کا سلسلہ قائم ہے۔ غرض جس طرح مشین کو ایک مرتبہ بٹن دبا کر چلا دیا تو وہ چلتی رہتی ہے اسی طرح کائنات میں ایک مرتبہ حرکت اور جنبش ہوئی اور اب وہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ یہ جنبش کیسے ہوئی؟

کائنات کی یہ مشینی توجیہہ یہاں کی ہر چیز کے بارے میں جبر کا فیصلہ سناتی ہے اور اس حکمت و بصیرت کی تردید کرتی ہے جس کا مشاہدہ انسان اپنے چاروں طرف کرتا ہے۔ گویا یہ ایک ایسا چمن ہے جس کی سرسبزی و شادابی کے پیچھے نہ تو کوئی حکمت ہے اور نہ ہی اس کا اجڑنا اور برباد ہونا کوئی معنی رکھتا ہے۔ یہاں کا ہر انقلاب اس سلسلۂ واقعات کا منطقی ظہور ہے جو اسی دن قائم ہوگیا تھا جس دن یہ کائنات وجود میں آئی۔ اس توجیہہ سے لازم آتا ہے کہ خود انسان کے وجود اور اس کے تمام اعمال کو اسی سلسلۂ واقعات کی ایک کڑی مانا جائے جو یہاں ایک منطقی ترتیب سے ظہور میں آرہے ہیں۔ وہ خواہ مفلس ہو یا دولتمند، مریض ہو یا تندرست، عالم ہو یا جاہل، سب کچھ حالات کی طبعی رفتار کا لازمی ظہور ہے۔ انسان کا اپنی خوش قسمتی پر فخر کرنا اور بدقسمتی پر افسوس کرنا دونوں بے معنی ہیں۔ کوئی شاہ ہے تو یہ اس کے شاہ ہونے کا تقاضا ہے اور کوئی محکوم اور رعیت ہے تو اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ یہاں نہ کسی کو مصیبت میں فریاد کرنے کا حق ہے اور نہ راحت کوئی ایسی چیز ہے کہ اس سے انسان کے اندر جذبۂ شکر و مسرت پیدا ہو۔

کائنات کے اندر اس وسیع جبر کو اگر مان لیا جائے تو عدل و انصاف اور حکومت و سیاست کے سارے دفتر کو نذر آتش کرنا پڑے گا۔ نہ تو کسی کی ظلم و زیادتی پر گرفت کی جا سکتی ہے نہ کسی کی مظلومیت پر ہمدردی۔ کوئی شخص اپنے بھائی کے گھر ڈاکہ ڈالتا ہے تو بھی ٹھیک کرتا ہے اور اپنی دولت اس پر صرف کرتا ہے تو بھی ٹھیک کرتا ہے۔ ہم نہ تو کسی کے علم و فضل کی تعریف کر سکتے ہیں اور نہ کسی کی جہالت و نادانی کی مذمت۔ اس لیے کہ یہاں کا ہر واقعہ جبر کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔ انسان اس کے کرنے یا نہ کرنے میں مطلق آزاد نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی یہ مشینی توجیہہ اس کی مجموعی ساخت سے کسی طرح مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کائنات کے اندر ہر آن اور ہر لمحہ تخریب و تعمیر کا عمل جاری ہے۔ ریاضی کا کوئی بھی تجزیہ وقت کے کسی ایسے حصے کو الگ نہیں کر سکتا جس میں یہاں ہزارہا چیزیں وجود میں نہ آتی ہوں اور ہزارہا چیزیں فنا نہ ہوتی ہوں۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ اس کائنات کے لیے محرکِ اوّل ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو ہر وقت اس کی نگرانی کر سکے۔ یہ کائنات اپنے آغاز کے لیے جن وجوہ کی بنا پر ایک خالق کی محتاج ہے، ٹھیک ان ہی وجوہ کا تقاضا ہے کہ اس کے خالق کو بقا و دوام اور حکمت و شعور کے اوصاف سے بھی متصف مانا جائے جو ہر چیز کو ایک خاص مقصد اور خاص منصوبے کے تحت وجود میں

لاتا ہے اور ایک خاص مدت تک اس سے کام لینے کے بعد اسے ختم کردیتا ہے۔ اس کائنات پر جب تک کسی بلند و برتر ذات کا مستقل فیضان نہ ہو ایک لمحہ کے لیے اس کا باقی رہنا ممکن نہیں ہے۔ کوئی وقتی محرک اس کائنات کے اندر تخلیق کا عمل مسلسل جاری نہیں رکھ سکتا[1]

کیا عقل سے خدا کا تفصیلی تعارف ممکن ہے؟

کائنات کے خالق کو ایک باشعور اور حکیم و دانا ذات ماننے کے بعد آئیے اب اس سوال پر غور کریں کہ اس کی ذات و صفات کا علم کس حد تک ہم حاصل کرسکتے ہیں۔ خدا کے بارے میں ہر سوال جو ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے حقیقت میں وہ اس کائنات کے بارے میں سوال ہے۔ اس کائنات کا آغاز کیا ہے اور انجام کیا؟ کیا یہ کوئی حقیقت ہے یا محض ذہن کا فریب؟ یہاں زندگی اور موت، گردش و سکون، انقلاب و تغیر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور اس کی کیا حکمت ہے؟ کائنات کے بارے میں اس طرح کے جتنے سوالات ہوسکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر شخص ان سب سے لازماً دوچار ہو اور نہ واقعہ یہ ہے، بلکہ ان میں سے بعض سوالات ہر انسان کے ذہن میں ابھرتے ہیں اور وہ خدا پر یقین کی شکل میں ان کا جواب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کائنات میں اس کو حکمت نظر آتی ہے تو خدا کو حکیم ثابت کرتا ہے کسی مصیبت زدہ پر رحم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو خدا کو رحیم مانتا ہے۔ یہاں ہر چیز کی فطری ضرورت پوری ہوتی ہے تو خدا کو رازق خیال کرتا ہے۔ گویا وہ کائنات کی روشنی میں خدا کی ذات و صفات کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس لیے جس نہج سے وہ کائنات کو دیکھے گا اسی نہج سے خدا کا تصور کرسکے گا۔ آپ علت کے اندر ان ہی صفات و خصوصیات کو ثابت کرسکتے ہیں جن کا مشاہدہ آپ نے معلول میں کیا ہے، نہ اس سے کم کا آپ یقین کرسکتے ہیں اور نہ زیادہ کا تصور کرسکتے ہیں۔

اس کی مزید وضاحت تھوڑی سی تفصیل سے ہوسکتی ہے۔

ایک دیہاتی کسان دیکھتا ہے کہ زمین خشک ہے، کھیتی اجڑ رہی ہے، ہر جاندار موت کی چکی میں پس رہا ہے، انسان رزق حاصل کرنے اور اپنی جان بچانے کے لیے جتنی کوششیں کرتا ہے سب ناکام ہو رہی ہیں۔ ایسے میں وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تاکہ اپنی اور سارے انسانوں کی فریاد اس تک

---

[1] اس فلسفہ پر قرآن کی روشنی میں تفصیلی تبصرہ "کائنات میں خدا کا عمل" کے عنوان سے آگے آرہا ہے۔

پہنچائے، ابھی اس کی دعا اور فریاد ختم ہونے بھی نہیں پاتی کہ فضا میں تغیر آجاتا ہے، جہاں بارش کے کوئی آثار نہیں تھے وہاں ہر طرف گھٹا چھا جاتی ہے اور آن کی آن میں پانی برسنے لگتا ہے۔ خشک اور کھنکھناتی زمین جل تھل ہو جاتی ہے اور چند ہی دن میں جن مقامات پر خاک اڑ رہی تھی ان میں بہار آجاتی ہے، بھوکے غذا پاتے ہیں، انسان اور حیوان موت کے چنگل سے باہر نکل آتے ہیں، اور کسان کا دل خدا کی فریاد رسی اور بے پناہ رحمت کے یقین سے معمور ہو جاتا ہے۔

خشک سالی بہت سے مقامات پر آتی ہے اور انسانوں کی اکثریت اس سے کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوتی ہے۔ لیکن ایک کسان، جس کی زندگی کا انحصار اپنی کھیتی پر ہے، وہ موسلادھار بارش کو دیکھ کر خدا کے رحم و کرم، محبت و ہمدردی، فریاد رسی اور غمخواری کے تصور پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا شخص جو قحط کے اثرات سے محفوظ ہے، وہ اس واقعہ کو کائنات کے خالق پر غور و فکر کا عنوان تک بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

ایک سرطان کا مریض جو ڈاکٹروں اور حکیموں سے پوری طرح مایوس ہو چکا ہو اور جس کو اس کا قطعی یقین ہو کہ اب اس کا رشتۂ حیات منقطع ہونے والا ہے، اگر وہ ہر طرف سے نظر پھیر کر خدا کے دربار میں ہاتھ پھیلائے اور اس کی اکھڑی ہوئی سانس دوبارہ واپس آجائے تو اس کے لیے یہ تصور کرنا آسان ہے کہ خدا زندگی اور موت پر قادر ہے۔ لیکن جو شخص اس تجربے سے نہ گزرے، ہو سکتا ہے کہ وہ موت و حیات کے اسباب اسی مادی دنیا میں تلاش کرے اور خدا کی اس صفت کا تصور اس کے لیے دشوار ہو۔

ایک تیسرے شخص کو لیجیے جو کائنات کا مطالعہ اس پہلو سے کرتا ہے کہ یہاں اشیاء کی اپنی الگ الگ خاصیتیں ہیں اور وہ اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اشیاء کو یہ خاصیتیں کہاں سے ملیں؛ ان میں جو خاصیتیں پائی جاتی ہیں کیا ان کے علاوہ دوسری خاصیتیں ان میں نہیں پائی جا سکتی تھیں؟ اگر آگ جلاتی ہے تو اس کی عقل حیران ہے کہ کیوں آگ کے اندر جلانے کی صفت ہے، اور کیوں لکڑی اس صفت سے خالی ہے اور اس میں آگ کے بالکل متضاد صفت پائی جاتی ہے؟ اپنے غور و فکر کے نتیجے میں وہ اس یقین تک پہنچتا ہے کہ یہاں خدا ہے اور وہی اشیاء کو ان کی خاصیتیں عطا کرتا ہے۔ لیکن جو شخص اشیاء کی خاصیتوں پر غور ہی نہ کرے وہ اس رخ سے خدا کی صفات کا مطالعہ کر ہی نہیں سکتا۔

کائنات کے مطالعہ سے خدا کی صفات کو جاننے اور سمجھنے کے بہت سے پہلو ہیں ہم نے چند پہلوؤں

کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر کائنات میں نظم و ہم آہنگی ہے، استحکام ہے، حکمت و دانائی ہے ان خصوصیات کا تقاضا ہے کہ خدا کو حکیم و دانا اور منتظم کائنات بھی مانا جائے۔ لیکن اس طرز مطالعہ میں ایک زبردست خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ مطالعہ ہمیشہ ناقص رہتا ہے۔ جو شخص کائنات کا مطالعہ صرف اسی پہلو سے کرے کہ وہ چند خصوصیات کا مجموعہ ہے ضروری نہیں کہ وہ خدا کی صفات کو شعوری طور پر تسلیم بھی کرے بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ وہ صرف چند ہی صفات کا تصور کر سکے گا۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے کی جا سکتی ہے۔

آپ ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جو اپنے ظاہر و باطن ہر پہلو سے کامل ہو، وہ تندرست و توانا جسم رکھتا ہو، اچھا مقرر اور محرر ہو، آرٹسٹ اور صنعت کار ہو با اخلاق اور شریف ہو۔ غرض یہ کہ ایسا شخص جس کے اندر کسی نقص کی نشان دہی نہ کی جا سکے۔ اب اس کے جاننے والے ہیں کہ ان میں سے کسی نے اس کی مضبوط جسمانی ساخت دیکھی ہے اور وہ اس کا معترف ہے، کسی نے اس کی صرف تقریر سنی ہے اور وہ اس کو ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ کسی نے اس کی تحریر دیکھی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک کامیاب محرر ہے، کسی کے سامنے اس کے فن کا نمونہ ہے۔ لہٰذا اس کے ذہن میں اس کا تعارف ایک اچھے فنکار کا ہے، اسی طرح جس شخص کو اس کے اخلاق کا تجربہ ہے وہ اس کو ایک شائستہ کردار انسان مانتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی رائے اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے بارے میں ان سب کی واقفیت ناقص اور ادھوری واقفیت ہے۔ اس کی شخصیت کی تکمیل جن بے شمار خصوصیات سے ہوئی ہے ان جاننے والوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے ان سب خصوصیات کی مدد سے اس کو سمجھا ہو۔

کائنات خدا کی ترجمان ہے

خدا کی ذات و صفات کا معاملہ بھی بالکل یہی ہے۔ یہ کائنات خدا کی ترجمان ہے اور وہ مختلف پہلوؤں سے اس کا تعارف کراتی ہے، لیکن انسان کی رسائی اس کائنات کی ساری حقیقتوں تک نہیں ہو پاتی وہ صرف چند زاویوں سے اس کو دیکھ سکتا ہے اور جس زاویے سے اسے دیکھتا ہے اسی زاویے سے خدا کا تصور بھی کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے سامنے چند آثار و علامات ہیں جن کی مدد سے وہ ایک بہت بڑی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کائنات کے تفصیلی علم کے لیے جن صلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ قطعاً اسے حاصل نہیں ہیں۔

کائنات کو سمجھنے کی دو شرطیں

کائنات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے دو شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ پہلی شرط ہے وسیع علم۔ اس کائنات کی ایک ایک شے کے بارے میں جب تک واقفیت نہ ہو اس کا سمجھنا دشوار ہے۔

دوسری شرط ہے حقیقت کے مطابق علم۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے محض اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اس کا مطلق علم ہو جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے متعلق تمام معلومات صحیح ہوں، غلط معلومات کبھی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتیں۔

یہ دونوں شرطیں انسان کو حاصل نہیں ہیں۔ اس کا علم بہت ہی محدود ہے کیونکہ اس کے پاس علم کے جو ذرائع ہیں وہ کائنات کی بہت سی حقیقتوں کو سمجھنے میں اس کی بالکل مدد نہیں کرتے۔ آج تک وہ یہی جان نہیں سکا کہ کائنات کا آغاز کب ہوا، اس کا مقصد کیا ہے، اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے ؟ اس کو ابھی تک اصول کشش کی حقیقت نہیں معلوم، جو ساری کائنات میں پھیلا ہوا ہے اور جو ہمارے اس کرۂ زمین کو آفتاب سے جوڑے ہوئے ہے۔

اسی طرح اس کو جو کچھ بھی علم حاصل ہے وہ حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔ چنانچہ کائنات کے بارے میں ہمیشہ وہ غلط تصورات کا شکار رہا۔ اس کو علم کا ایک ذرہ نصیب ہوا تو جہالت کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے حصے میں آیا، اس کو اوہام پر حقیقت کا دھوکا ہوا اور اس نے باطل کو حق سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا کبھی اس نے کائنات پر بھوتوں اور پریوں کا تسلط مانا تو کبھی بے جان مادہ کو اس کا خالق سمجھ بیٹھا زمین اور آسمان اور خشکی اور تری کے بارے میں اس کا جہل ہمیشہ اس کے علم پر غالب رہا۔ ظاہر ہے اس بنیاد پر وہ یا تو خدا کے وجود ہی کا انکار کرے گا یا اس کے بارے میں غلط اور باطل تصور رکھنے پر مجبور ہوگا۔ کسی آرٹسٹ کی مہارتِ فن، قابلیت اور صلاحیت کے بارے میں آپ اسی وقت صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں جبکہ خود آپ کے اندر اس کے آرٹ کی تمام باریکیوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہو۔

یہ ہے کائنات کے بارے میں انسان کے علم کا حال! لیکن جب ہم اس پہلو سے دیکھتے ہیں کہ یہ کائنات خدا کے وجود کا محض ایک نشان ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اگر کائنات کا وسیع علم حاصل ہو بھی جائے تو وہ خدا کا صرف مجمل تصور ہی کر سکتا ہے تفصیلی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کائنات میں انسان کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ خدا کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کے آثار و علامات کو دیکھتا ہے۔ آثار و علامات

کسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں اس کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں فراہم کرتے۔ آپ بیابان میں انسان کے قدم کے نشانات دیکھ کر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ ادھر سے کسی انسان کا گزر ہوا ہے لیکن اس سے آگے یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ عالم تھا یا جاہل، جوان تھا یا بوڑھا، مریض تھا یا تندرست، نیک اخلاق تھا یا بد اخلاق۔ غرض یہ کہ انسان ہونے کی حیثیت سے اس کے متعلق بہت سے سوالات کا آپ کے پاس کوئی یقینی جواب نہیں ہوگا۔ ایسے مواقع پر انسان قیاس سے کام لیتا ہے لیکن قیاس کا اصول یہ ہے کہ وہ جتنا محدود ہوگا اتنا ہی یقینی ہوگا اور اس کو جس قدر وسعت دی جائے گی اسی قدر اس میں غلطی کا احتمال بڑھتا جائے گا اور ہمارے یقین میں کمی آجائے گی۔ مثال کے طور پر مچھلی پانی میں زندہ رہتی ہے اس سے آپ یہ قیاس کریں کہ ہر وہ چیز جس میں مچھلی کی خصوصیات ہوں پانی میں زندہ رہ سکتی ہے تو آپ کا یہ قیاس یقینی ہوگا۔ لیکن اس قیاس سے آپ نے کوئی نئی بات نہیں دریافت کی۔ یہ آپ کے مشاہدہ کا صرف اعادہ ہے۔ اسی قیاس کو آپ وسیع کریں اور اس طرح سوچیں کہ مچھلی جان دار ہے اور وہ پانی میں سانس لیتی ہے اس لیے انسان بھی پانی میں سانس لے سکتا ہے کیونکہ وہ بھی جاندار ہے تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اس قیاس سے آپ نے ایک نئی بات معلوم کرنے کی کوشش کی اور وہ غلط نکلی۔

خدا کی ذات ہمارے حواس کے ادراک سے ماوراء ہے۔ اس کے وجود کا یقین ہمیں اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن خدا ہے کیا اور وہ کن صفات کا حامل ہے۔ اسے ہم قیاس کے ذریعہ سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ قیاس میں حقیقت کا عنصر کم اور ظن و تخمین کا حصہ زیادہ ہوتا ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کائنات خدا کے وجود ہی کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ اس کے بہت سے صفات کا تعارف بھی کراتی ہے، خود خدا کے وجود کا مجرد تصور ہمیں حاصل نہیں ہوتا بلکہ صفات ہی کی مدد سے ہم اس کا تصور کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کائنات سے خدا کی بہت سے صفات کا علم ہوتا ہے اور ان ہی صفات کے ذریعہ ہم خدا کا تصور کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ذکر صرف ان چند صفات کا نہیں ہے بلکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خدا کو تسلیم کرنے کے بعد بہت سے سوالات ابھرتے ہیں، کیا ان سب کا جواب ہم اس کائنات سے معلوم کر سکتے ہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ یہی چیز ناممکن ہے۔

انسان کی کمزوری

خدا کی ذات و صفات پر غور کرتے ہوئے ہمیں انسان کی ایک کمزوری کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ وہ یہ کہ اس کائنات کے اندر بعض حقیقتیں ایسی ہیں جو انسان کے لیے ذاتی تجربے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً مرض، صحت، خوشی، غم، محبت، نفرت، بخل ایثار، تشنگی، سیرابی وغیرہ۔ لیکن یہ کائنات کی بہت ہی محدود حقیقتیں ہیں۔ ان کے ذریعہ خدا کا جو تصور قائم ہوگا وہ بھی محدود ہوگا۔ اس کے برعکس بعض وسیع تر حقیقتیں یہاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر قانونِ کشش، یا سیاروں کی گردش کے اصول وغیرہ۔ یہ حقیقتیں خدا کے بارے میں تصور بھی زیادہ وسیع دیتی ہیں لیکن ان وسیع تر حقیقتوں تک ایک تو انسان کے علم کی رسائی نہیں ہوتی، دوسرے یہ کہ جس حد تک بھی ان حقیقتوں کا شعور اس کو ہوتا ہے، تاریخ کا تجربہ ہے کہ وہ خدا کے بارے میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کو سامنے نہیں رکھتا۔ اس نے ہمیشہ خدا کو اپنی ذات پر قیاس کیا اور اپنے ذاتی تجربات وکیفیات کی روشنی میں اس کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے خدا کے علم وحکمت کو اپنے علم وحکمت سے مشابہ سمجھا اور اس کے اقتدار اور قدرت کو اپنے محدود اقتدار وقدرت پر قیاس کیا اور یہ وسیع کائنات جس نوعیت کے علم وحکمت اور اقتدار وقوت کا تقاضا کرتی ہے اس کے تصور سے اس کا ذہن خالی رہا۔

انسان بہت سے نقائص اور کمزوریوں سے آلودہ ہے۔ اگر وہ خدا پر سوچتے وقت اپنی ذات کو بنیاد بنائے گا تو لازماً ان نقائص اور کمزوریوں سے خدا کو پاک نہیں قرار دے سکتا۔ اس کے ذہن میں رنج وراحت، لذت والم، محبت ونفرت جیسی صفات خاص مفہوم رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ محبت کا لفظ بولتا ہے تو اس سے دل کا میلان اور جھکاؤ مراد ہوتا ہے۔ اور جب وہ کسی چیز سے محبت کرتا ہے تو اس کی طرف بڑھتے ہوئے اور اس کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہوئے ایک طرح کی لذت اور سرور محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ فلاں شخص سے نفرت ہے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس شخص کی وجہ سے وہ ایک طرح کے انقباض اور نفسیاتی ضرر سے دوچار ہے۔ اور پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ محبت اور نفرت کی حالت میں اس سے بعض غیر عقلی واقعات کا صدور ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ جس سے نفرت کرتا ہے کبھی اس سے بلا وجہ انتقام لے بیٹھتا ہے اور جس سے محبت کرتا ہے اسے جوشِ محبت میں بلا استحقاق انعام واکرام سے نواز دیتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا انسانوں سے محبت یا نفرت کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا وہ بھی انسانوں کی وجہ سے کسی قسم کے نفسیاتی نفع وضرر سے

گزرتا ہے؟ کیا اس کے ہاں بھی نوازش و انتقام کا کوئی اصول نہیں ہے؟

جن لوگوں نے خدا کو اپنی ذات پر قیاس کیا وہ ان لوازمات کے ماننے پر مجبور ہوئے۔ انہوں نے سوچا کہ جس طرح ایک بااقتدار حاکم کے ہاں جزا و سزا کا کوئی اصول نہیں ہوتا بلکہ اس کا بدلتا ہوا مزاج ہی کسی کو سزا دینے یا نوازنے کا فیصلہ کرتا ہے، اسی طرح خدا کے ہاں بھی جزا و سزا کا کوئی اصول نہیں ہے جس طرح دنیا کے شاہ اپنے اپنے محبوب افراد کی سفارش پر ایک ایسے شخص کو نعمتوں سے نواز دیتے ہیں جو حقیقتاً عقوبت کا مستحق ہوتا ہے اور کبھی ان محبوب افراد کے کہنے پر ایک بے جرم انسان کو مجرم کی صف میں کھڑا کر دیتے ہیں، اسی طرح خدا بھی اپنے مقربین کی سفارش پر افراد کی قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہی حال صفات کا ہے۔ ان صفات کو خدا کے لیے ثابت کرتے ہوئے انسان نے ان کے وہی معنی سمجھے جو اس کے اپنے ذہن میں ہیں اور جن کا اسے اس دنیا میں تجربہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ خدا کے بارے میں غلط تصورات سے بچ نہیں سکا۔

انسان نے خدا کا جو تصور کیا اس میں صرف خصوصیات ہی اس کی نہیں ہیں بلکہ خدا کی شکل و صورت بھی اسی جیسی ہے، وہ اسی کی طرح ہاتھ پیر رکھتا ہے، بولتا اور رکھتا ہے حتیٰ کہ آرام کرنے کی بھی ضرورت محسوس کرتا ہے۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق اس طرح کے تصورات میں آپ تمام مشرک قوموں کو مبتلا پائیں گے۔ حالانکہ عقل کہتی ہے کہ خدا کو اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے انسانوں سے قطعی مختلف ہونا چاہیے۔ ہم نے خدائے تعالیٰ کا اقرار اسی لیے کیا کہ اس کائنات میں خدا کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو اپنے اندر وہ صفات رکھتی ہو جن سے ہم کسی کو متصف ماننا چاہتے ہیں۔ اگر خدا اور انسان اپنی صفات کے لحاظ سے ایک سے ہیں تو ہم خدا کو ماننے پر ہرگز مجبور نہ ہوں گے۔ خدا کو جب تک کائنات کی ساری مخلوقات سے منفرد اور یکتا نہ تسلیم کیا جائے خدا اور مخلوق کا فرق ہمارے لیے ایک ذہنی فرق ہوگا، حقیقت واقعہ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

خدا کی ذات و صفات کے بارے میں انسان کی فکری لغزشوں سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس کو سمجھنے کی کوشش ترک کر دیں۔ خدا اگر اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور ہم اس کے مخلوق اور محکوم ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کا تفصیلی علم حاصل کریں۔ یہ ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔

اس سے اعراض کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہمارا سارا وجود اور یہ وسیع کائنات جس حقیقت کی طرف دعوت دے رہی ہے، ہم اس کو سمجھنے اور اس کو اپنی زندگی میں اتارنے سے گریز کر رہے ہیں۔

خدا کی کامل معرفت ضروری ہے

لیکن کسی حقیقت کو پوری طرح اپنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا صحیح اور مکمل شعور حاصل ہو ورنہ ہمارا ذہن و فکر ہمیشہ اس سے اجنبی رہے گا اور کبھی مانوس نہ ہوگا۔ انسان بہت سی حقیقتوں کا اعتراف کرتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ یہ حقیقتیں اس سے کس چیز کا مطالبہ کرتی ہیں اور کس چیز سے منع کرتی ہیں۔ اس لیے اس اعتراف کے باوجود اس کی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کا مجمل یقین کبھی محرک عمل کا کام نہیں دے سکتا۔ وہ ہماری زندگی میں حکمراں قوت بن کر اسی وقت داخل ہوگا جب کہ ہمارے ذہن میں اس کا شعور غیر مبہم اور بالکل واضح ہو۔ ورنہ ہم ایک طرف خدا کو ماننے کا دعویٰ کریں گے اور دوسری طرف ہماری زندگی پر اس کا اثر کہیں نہیں دکھائی دے گا۔

اس کا واضح ثبوت ہمیں فلاسفہ کے گروہ میں ملتا ہے۔ ہر دور میں فلاسفہ کی ایک بہت بڑی تعداد نے خدا کی ہستی کا اقرار کیا ہے۔ کائنات کے گہرے مطالعہ اور غور و فکر نے ان پر یہ حقیقت کھول دی کہ یہ کائنات ایک معمہ ہے جس کو خدا کے تصور کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ کائنات کی ہر چیز خدا کی گواہی دے رہی ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک خدا کو جھٹلانا خود اس کائنات کو جھٹلانے کے مترادف تھا۔ لیکن اس زبردست یقین کے باوجود وہ اپنی عملی جد و جہد کے لیے کوئی ایسا نقشہ نہیں پا سکے جو خدا کے تصور سے مطابقت رکھتا ہو۔ خدا پر ان کے یقین نے اس کائنات کے بارے میں ابھرنے والے بہت سے سوالات کو تو حل کر دیا لیکن خود ان کی زندگی جن سوالات سے دوچار رہے ان کا جواب وہ فراہم نہیں کر سکے۔ ان کا فکر جس بے پناہ یقین سے معمور ہے اس کی ادنیٰ سی جھلک بھی ان کے معمولاتِ حیات میں نمایاں نہیں ہوئی۔ خدا پر ان کا اعتماد ایک بے نور چراغ ہے جس کی مدد سے وہ زندگی کا راستہ نہیں طے کر سکتے۔ انھوں نے خدا کو تسلیم تو کیا لیکن خدا پرست نہیں بن سکے۔ چنانچہ جو فلاسفہ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور جو اس یقین سے محروم ہیں دونوں کی عملی زندگیوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں پایا جاتا۔ خدا کا اقرار کرنے والے فلسفیوں کی زندگی بھی ان ہی خطوط پر چلتی ہے جن خطوط پر خدا کا انکار کرنے والے فلسفیوں کی زندگی چل رہی ہے۔ وہ فکری لحاظ سے تو ایک دوسرے سے

بہت دور ہوتے ہیں لیکن عمل کی دنیا میں یہ دوری ختم ہوجاتی ہے اور دونوں ایک ہی سطح اور ایک ہی حیثیت میں نظر آنے لگتے ہیں کیونکہ جس طرح منکرین خدا کے پاس خدا کی دی ہوئی کوئی روشنی نہیں ہے اسی طرح خدا کا اعتراف کرنے والے بھی اس روشنی سے محروم ہیں دونوں زندگی کے مسائل میں اپنی فکر و رائے ہی کو حکم ماننے پر مجبور ہیں۔

ایسی حالت میں ہماری نظر پیغمبروں کے گروہ پر پڑتی ہے جو ان تمام حقائق سے واقف معلوم ہوتے ہیں جن کے جاننے سے ہم ہر طرح عاجز اور بے بس ہیں۔ وہ کائنات کے آغاز و انجام اور خدا کی ذات و صفات کے بارے میں ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک اور متعین جواب دیتے ہیں۔ وہ پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ بتاتے ہیں کہ خدا کی ذات کن صفات کی حامل ہے اور کونسی صفات اس کی ذات کے منافی ہیں، خدا سے ہمارا کیا رشتہ ہے اور زندگی کے تمام معاملات میں ہم اس سے کیسے ربط و تعلق جوڑ سکتے ہیں؟ ان تمام باتوں میں وہ سیدھے ہماری عقل سے خطاب کرتے ہیں اور عقل ان کی باتوں سے پوری طرح مطمئن ہوجاتی ہے۔ البتہ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ ساری معلومات ان کو براہ راست خدائے تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوتی ہیں اور ایک ایسے ذریعہ (وحی) سے حاصل ہوتی ہیں جو سوائے ان کے کسی دوسرے انسان کے پاس نہیں ہے۔ کیا کوئی عقلمند ان کی تعلیمات سے اس لیے انکار کرسکتا ہے کہ ان کا ذریعہ علم اس کے جانے بوجھے ذرائع علم سے مختلف ہے۔ اور وہ اس سے ناآشنا ہے؟

فصل دوم

ایمان بالرّسالت

انسان اگر خدائی کا دعویٰ کرے تو یہ اس کا اپنے بارے میں سب سے بڑا دعویٰ ہوگا۔ اس کے بعد جو بڑے سے بڑا دعویٰ اس کے لیے ممکن ہے وہ یہ ہے کہ وہ خدا نہیں خدا کا رسول ہے۔ کسی کے خدا کا رسول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو انسانوں کے درمیان خدا کا نمائندہ بنا کر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس کو یہ منصب اور مقام حاصل ہے کہ انسانوں کو بتا سکے کہ ان کا خدا ان سے کیا چاہتا ہے؟ ان کی خوشی کن کاموں میں اور وہ ناخوش کن چیزوں سے ہوتا ہے؟ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا قائد اور راہ نما ہے، سارے انسان اس لیے ہیں کہ اس کے پیچھے چلیں۔ ان کو حق نہیں ہے کہ اس کی کسی بات کی مخالفت کریں۔ وہ اس سرزمین پر جو بھی کام انجام دینا چاہے نوع انسانی کے ایک ایک فرد پر لازم ہے کہ اس میں اس کا ساتھ دے۔ جو اس کی اطاعت کرے وہ خدا کا فرماں بردار ہے اور جو اس کی راہ میں مزاحم ہو وہ خدا کا باغی اور نافرمان ہے۔

یہ دعویٰ جتنا بڑا ہے، انسانیت پر اس کے اتنے ہی وسیع اور گہرے اثرات ہیں۔ اس دعویٰ کو انسانوں میں کے ایک گروہ نے ماننے سے انکار کیا تو ایک گروہ نے اس کو پورے شرحِ صدر کے ساتھ قبول کیا۔ اگر آپ اس دعوے کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کرنا چاہیں تو اس کو ماننے والوں کی تعداد نہ ماننے والوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ کبھی کسی دور میں کوئی نظریہ انسانیت پر اس قدر اثر انداز نہیں ہوا جس قدر کہ دعوی رسالت اثر انداز ہوا ہے۔

تاریخ میں بے شمار نظریات اٹھے۔ ان میں سے بہت ہی کم ایسے ہیں جن کو انسانیت نے قبول کیا ہو۔

جن چند نظریات کو انسانیت نے قبول کیا ان کو بھی ثبات اور دوام نہیں حاصل ہو سکا۔ بعض نظریات ایسے بھی ملیں گے جن کی ایک عرصہ تک ذہن و فکر پر حکومت رہی اس کے بعد زمانے نے انہیں اکھاڑ پھینکا۔ لیکن یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ہر دور میں رسالت کا دعویٰ بلند ہوتا رہا اور جب بھی یہ دعویٰ بلند ہوا ایک جماعت ایسے افراد کی ضرور پائی گئی جس نے اس کے حق ہونے کی گواہی دی۔ پوری تاریخ میں کسی بھی اپنے دور کی آپ نشاندہی نہیں کر سکتے جب کہ تمام انسانوں نے بالاتفاق اس دعوے کو رد کر دیا ہو۔ زمانہ حق و باطل کے جانچنے کی زبردست کسوٹی ہے۔ تصور رسالت کا اس طرح زندہ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ زمانہ اس کے حق ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر یہ تصور باطل ہوتا تو آغاز انسانیت سے اب تک اس کو برداشت نہ کرتا۔

آج بھی اس عظیم دعوے کی گونج ہر طرف سنائی دے رہی ہے اور تاریخ سفارش کرتی ہے کہ آگے بڑھ کر اس کو قبول کیا جائے۔ آپ اس دعوے کو لغو اور مہمل کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نوعِ انسان کی اکثریت کو —— جو اس کے حق ہونے پر مطمئن ہے —— بے وقوف سمجھتے ہیں اور اس کے اطمینان کو جھوٹا اطمینان قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ اکثریت صرف عوام کی نہیں ہے بلکہ اس میں بے شمار ایسے افراد بھی نظر آتے ہیں کہ اگر اعلیٰ سطح کے انسانوں کی کوئی فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان کا مقام سب سے نمایاں ہوگا۔

ممکن ہے آپ انسانیت پر اتنا بڑا الزام لگانے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس انتہائی واضح اور منضبط دلائل ہوں، ورنہ انسانیت کی نگاہ میں خود آپ کا مرتبہ و مقام گھٹ جائے گا۔

رسولؐ کا پہلا دعویٰ

آئیے ہم غور کریں کہ خدا کا رسولؐ ہمارے سامنے کن دعووں کے ساتھ آتا ہے اور ان کی حقیقت کیا ہے؟

خدا کے رسول کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ یہ وسیع کائنات خدا کی ہے۔ وہ اس کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ خدا ہی نے اس کائنات کو پیدا کیا اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ یہاں کی ہر چیز پر خدا کی حکومت ہے اور وہ جس تغیر و انقلاب سے بھی گزرتی ہے خدا کے امر اور فیصلہ سے گزرتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول کے اس دعوے کو کائنات کی معلوم حقیقتوں سے پوری طرح

ہم آہنگ ہونا چاہیے ورنہ وہ کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ کائنات ایک واقعہ کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے تمام کاموں میں بعض متعین اصول کی پابند ہے۔ یہاں جو بھی واقعہ وجود میں آتا ہے ان ہی اصولوں کے تحت وجود میں آتا ہے۔ اس لیے کائنات کے بارے میں وہی دعوٰی صحیح ہو سکتا ہے جو ان اصولوں سے مطابقت رکھتا ہو۔ جو دعوٰی اس واقعہ کی، جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں، تردید کرے یا اس کے متعین اصول و قوانین کو غلط اور مہمل قرار دے، ہمارے نزدیک وہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

اس اصول کی روشنی میں رسول کے اس دعوے کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری نگاہوں سے چھپی ہوئی ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ کائنات جیسی کچھ ہے اس کو اسی طرح تسلیم کرتے ہوئے یہ دعوٰی اس کی مکمل توجیہ کرتا ہے۔ اس کو ماننے کے بعد کائنات کی معلوم حقیقتیں یہاں کی نامعلوم حقیقتوں سے مل کر ایک مربوط اور مسلسل کڑی بن جاتی ہیں اور ان میں کہیں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں رہتا۔

یہ کائنات کچھ اس ڈھنگ سے بنی ہے کہ یہاں ہر واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب بنتا ہے۔ انسان ان واقعات کا تو مطالعہ کر سکتا ہے اور بہت سے واقعات کا مطالعہ کرتا بھی ہے، لیکن کوئی واقعہ کسی دوسرے واقعہ کا سبب کیوں بنتا ہے، اس سے وہ ناواقف ہے۔ بالفاظ دیگر کائنات میں کیا ہو رہا ہے اس کو تو ہم جان سکتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کیوں ہو رہا ہے؛ علمی زبان میں اسی بات کو اس طرح بیان کیا جائے گا کہ اشیاء کی علتیں ہمیشہ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات کے بارے میں انسان کا علم ایک حد تک پہنچ کر رک جاتا ہے اس سے آگے اس کا گزرنا ممکن ہے۔ خدا کے رسول اس حد سے آگے ہمیں لے جاتے ہیں۔ وہ ہمیں ان حقائق سے باخبر کرتے ہیں جن کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

مجھے اور آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ غذا کے ذریعہ قوت اور انرجی حاصل ہوتی ہے اور غذا کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم ہے کہ غذا سے انرجی کیسے حاصل ہوتی ہے ؟ خدا کے رسول اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں خدا ہے۔ اس نے غذا میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اس کے استعمال سے جسم میں قوت اور انرجی پیدا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ہواؤں کے چلنے کے کچھ اصول ہیں، برسات کے متعین اوقات ہیں، فصلوں کے خاص موسم ہیں۔ لیکن آپ کو نہیں معلوم کہ ان میں یہ نظم اور باقاعدگی کہاں سے آگئی خدا کے رسول اس کے لیے فرشتوں کا تصور پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

کہ اس کائنات میں چاروں طرف خدا کے مقرر کیے ہوئے فرشتے پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اس کے نظم و نسق کے ذمہ دار بنائے گئے ہیں، یہاں ہمیں نظم اور باقاعدگی اس لیے نظر آتی ہے کہ خدا کے فرشتے خدا کے حکم سے یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں حالات اپنی متعین رفتار سے چلتے رہتے ہیں، لیکن کبھی ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جن سے ان حالات میں انقلاب آجاتا ہے، آپ نہیں بتا سکتے کہ یہ اسباب کیونکر پیدا ہوئے اور کیسے اس انقلاب کا سبب بن گئے؟ زمین کا سینہ اس قابل ہے کہ آپ اس پر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہی زمین پھٹ پڑتی ہے اور آپ انتہائی بے بسی کے ساتھ اس میں دھنس جاتے ہیں۔ ہوا جو زندگی کا ذریعہ ہے، کچھ خاص اسباب اس کو بعض اوقات اس قدر طیش میں لے آتے ہیں کہ وہ کسی زندہ وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اس وقت آپ حیران ہوتے ہیں کہ وہ ہوا جو نسیم سحر بن کر چلتی تھی کیوں آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر گئی؟ آپ کی یہ حیرانی ختم ہو جاتی ہے جب خدا کے رسول اس کو اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ کائنات کا اقتدار خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہ یہاں کے حالات میں جب چاہتا ہے انقلاب لاتا ہے۔ کوئی اس کے ارادے کو روکنے والا نہیں ہے۔

اس طرح جن واقعات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں، خدا کا رسول ان کی حقیقی علت ہمیں بتاتا ہے۔ اس علت کو ماننے کے بعد ان واقعات کی مکمل توجیہ ہو جاتی ہے۔ خدا کا تصور اس کائنات سے متعلق ہمارے ذہن میں ابھرنے والے ہر سوال کا قطعی اور واضح جواب ہے۔ اس سے ہم جان جاتے ہیں کہ یہ کائنات کیا ہے؟ اور اس میں جو واقعات ہوتے ہیں وہ کیوں ہوتے ہیں؟

دوسرا دعویٰ

خدا کے رسول کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جبکہ انسان کے عروج و زوال کا فیصلہ اس کے اعمال کی بنیاد پر ہوگا اس نے موجودہ زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کے نتیجے میں وہ یا تو سربلند ہوگا یا پستی میں چلا جائے گا۔

یہ دعویٰ کائنات میں انسان کی پوزیشن سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے۔ اس کائنات میں ہر طرف قانون کی حکومت ہے جس سے کوئی بھی شے آزاد نہیں ہے۔ سیاروں کی گردش کے جو اصول ہیں وہ ان سے باہر نہیں ہو سکتے۔ ہوا اور پانی کا جو نظام مقرر ہے اس کی کبھی مخالفت نہیں ہوتی۔ لیکن انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی زندگی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔

ایک حصّہ کائنات کے وسیع قانون میں بندھا ہوا ہے۔ اس کی پیدائش اور موت اسی قانون کے تابع ہے۔ اس پر لڑکپن جوانی اور بڑھاپے کے مختلف ادوار اسی قانون کے تحت آتے ہیں اور یہی قانون ہے جو اس کو زندہ رہنے کے لیے غذا کے استعمال اور بقائے نسل کے لیے جنسی تعلق پر مجبور کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنا اختیار رکھتا ہے۔ اس کائنات میں جو وسیع جبر ہے انسان کی زندگی کا یہ حصّہ اس سے آزاد ہے۔ نہ دریا اپنے اختیار سے رواں ہے اور نہ پہاڑ اپنی مرضی سے جمے ہوئے ہیں، لیکن انسان حرکت و سکون، عمل اور ترکِ عمل دونوں کا اختیار رکھتا ہے وہ کسی طرف قدم اٹھانے اور اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینے میں بالکل آزاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ قانون کی اس کائنات میں کیا انسان کی زندگی کا یہی ایک پہلو ایسا ہے جس میں لاقانونیت پائی جاتی ہے۔ خدا کے رسول کا جواب یہ ہے کہ انسان کی آزادی کو چیک کرنے والا قانون موجود ہے جس کے تحت وقت آنے پر اس کے اعمال کا جائزہ لیا جائے گا۔

رسول کے اس جواب کی تصدیق پوری کائنات کر رہی ہے۔ یہاں ہر طرف عروج وزوال کے قوانین پھیلے ہوئے ہیں۔ ان ہی کے تحت ہر چیز ابھرتی یا فنا ہوتی ہے۔ نہ بہار ان سے آزاد ہے اور نہ خزاں۔ موت وحیات دونوں پر ان قوانین کا قبضہ ہے۔ اگر انسان اسی کائنات کا ایک جزء ہے تو ہم رسول کے اس دعویٰ کو ماننے پر مجبور ہیں۔ جس طرح طبعیات کی دنیا میں عروج وزوال کے قوانین کام کر رہے ہیں۔ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ انسان کے عمل کی دنیا میں بھی اسی طرح کے قوانین پائے جائیں۔ اگر انسان کے اعمال کے لیے کوئی ضابطہ نہیں ہے اور وہ ہر قانون سے آزاد ہیں تو یہ ایک ایسا نرالا واقعہ ہے جو اس کائنات کی مجموعی ساخت سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ یہ کائنات صاف بتا رہی ہے کہ رسول کا دعویٰ حقیقت کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے دعویٰ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

اب آپ رسول کے دعویٰ کے اس پہلو پر غور کیجیے کہ انسان کے بارے میں دائمی عروج وزوال کے فیصلہ کا ایک وقت ہے اور وہ اس زندگی کے بعد آنے والا ہے۔

اگر انسان کے عمل کی دنیا قوانین سے گھری ہوئی ہے تو صاف بات ہے کہ انہیں ظاہر ہونا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ زندگی میں وہ ظاہر نہیں ہو رہے ہیں۔ یہاں انسان اس طرح

کام کر رہا ہے کہ اس کے ایک ہی عمل کا نتیجہ کبھی اچھا نکلتا ہے اور کبھی وہ بُرے نتائج پیدا کرتا ہے۔ لطف و محبت کا صلہ انسان کو کبھی یہ ملتا ہے کہ اس کے ساتھ مزید لطف و محبت کا سلوک کیا جاتا ہے اور کبھی ظلم و زیادتی کی شکل میں وہ ظاہر ہوتا ہے۔ اس صورت حال کی ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ انسانی اعمال کی دنیا نتائج سے خالی ہے، لیکن یہ توجیہہ اس کائنات کے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اس کائنات کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کا ہر واقعہ اپنا ایک اثر اور نتیجہ رکھتا ہے۔ پھر ہم کیسے تصور کر سکتے ہیں کہ صرف انسان کے اعمال ایسے ہیں جن کا کوئی نتیجہ اور حاصل نہیں ہے۔ اس لیے عقل سے قریب تر بات یہ ہوگی کہ انسان کے اعمال کو بے نتیجہ قرار دینے کے بجائے رسول کے اس دعویٰ کو مان لیا جائے کہ انسان کے اعمال کے نتائج ہیں اور ان کا ظہور ایک خاص وقت میں ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ایسے کسی خاص وقت کے امکان کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ کائنات اس طرف ہمیں لے جا رہی ہے کہ اس میں ایک ایسا تغیر اور انقلاب آنا چاہیے جب کہ انسان کے اعمال کے نتائج ظاہر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کو ناممکن قرار دیں۔

یہ اس کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کائنات میں ہونے والا ہر واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان کے اعمال میں چھپے ہوئے نتائج کے ظاہر ہونے کا نہ صرف عقلی امکان ہے بلکہ واقعاتی امکان بھی موجود ہے۔ یہاں کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ اس قدر حیرت انگیز ہوتا ہے کہ اس کے وجود میں آنے سے پہلے کوئی بھی شخص مشکل ہی سے یقین کر سکتا ہے کہ وہ اس شکل میں وجود میں آئے گا۔ فرض کیجیے آپ کسی درخت کی نشو و نما سے بالکل ناواقف ہیں اور آپ کے سامنے ایک چھوٹا سا دانہ رکھ کر کہا جاتا ہے کہ اس کو مٹی میں دفن کرنے کے چند دن بعد اس سے اکھوا نکلے گا اور پھر وہ بڑھ کر اس قدر پھیل جائے گا کہ کئی گز زمین کو گھیر لے گا جس کے سائے میں سینکڑوں افراد پناہ لے سکیں گے تو آپ کے لیے یہ خبر اتنی تعجب خیز ہوگی کہ آپ اس پر شاید یقین نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے اس لیے ہمیں اس میں کوئی ندرت نہیں محسوس ہوتی۔ حالانکہ یہ واقعہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اتنا ہی عظیم ہے جتنا یہ واقعہ کہ انسان کے عمل کے جو نتائج آج ظاہر نہیں ہو رہے ہیں کسی وقت ظاہر ہونے لگیں گے۔

تیسرا دعویٰ رسول کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ انسان، خدا کی ذات و صفات اور اس کی مرضی کو

خود سے نہیں معلوم کر سکتا۔ اس کے اندر یہ جاننے کی صلاحیت نہیں ہے کہ خدا کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کے بارے میں کونسا تصور صحیح ہے اور کون سا تصور اس کی ذات کے خلاف ہے؟ اس کی مرضی کیا ہے؟ وہ کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کون سے کام اس کی ناراضگی کا سبب بنتے ہیں؟ خدا کے بارے میں اس طرح کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انسان قاصر ہے۔

رسولؐ کا یہ دعویٰ انسان کے بارے میں ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ انسان کو علم کے جو ذرائع حاصل ہیں اُن میں حواس کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن حواس کی مدد سے انسان صرف طبعیات کی دنیا کو سمجھ سکتا ہے۔ طبعیات کی دنیا سے باہر جو حقیقتیں کام کر رہی ہیں ان کے سمجھنے میں حواس بالکل اس کے مددگار نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ طبعیات کی دنیا خود بھی بعض غیر طبعی حقیقتوں کی طرف اس کی رہنمائی کرتی ہے لیکن یہ رہنمائی بہت ہی محدود ہوتی ہے۔ خدا کی ذات اس کائنات میں کسی طبعی واقعہ کے طور پر پائی نہیں جاتی بلکہ وہ ایسی حقیقت ہے جو انسان کے حواس سے بہت دور ہے۔ انسان کو اس کی ذات کا مجمل شعور اس لیے ہوتا ہے کہ اس کائنات میں اس کی طرف واضح اشارے موجود ہیں لیکن اس سے آگے وہ کسی طرح اس کی ذات وصفات کی تفصیلی کیفیت نہیں جان سکتا۔ یقیناً انسان یہ معلوم کر سکتا ہے کہ سورج کا درجہ حرارت کیا ہے اور ہماری زمین کتنے فاصلے پر رہ کر اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہے لیکن وہ ہرگز یہ نہیں بتا سکتا کہ خدا کی رضا اور غضب کے کیا اصول ہیں؟ بڑے سے بڑے ستیارے کے طول و عرض کا جاننا اس کے لیے ممکن ہے لیکن وہ کسی طرح خدا کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

یہاں ہم اس مسئلہ کو ایک خاص پہلو سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ انسان اس دنیا میں جو بھی کام انجام دیتا ہے اس کی قدر وقیمت اس کے نتائج کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ انسان کے اعمال کو اگر ان کے نتائج سے الگ کر لیا جائے تو وہ ایسی حرکات ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اعمال میں نتائج کا اعتبار اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم انسان کے کسی بھی عمل کو مطلقاً اچھا یا بُرا کہہ سکیں کیونکہ ہر عمل کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک رخ سے دیکھئے تو اس میں خیر نظر آئے گا اور دوسرے رُخ سے دیکھیے تو وہ شر معلوم ہوگا۔ سچائی اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ اس میں کسی واقعہ کا جیسا کچھ کہ وہ ہے اظہار کر دیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا بہت بڑا فائدہ ہے۔ اس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور مخاطب دھوکہ نہیں کھاتا۔ لیکن فرض کیجیے کوئی مظلوم آپ کے پاس پناہ لیتا ہے، ظالم اس کی تلاش میں ہے اور وہ آپ سے

اس کے بارے میں دریافت کرتا ہے۔ آپ اس سے حقیقت واقعہ کا اظہار کر دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں مظلوم ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس وقت بلاشبہ آپ نے سچی بات کہی ہے لیکن کوئی بھی شخص اس سچائی کی داد نہیں دے سکتا کیونکہ اس سے ایک مظلوم کی جان چلی گئی۔ اگر آپ واقعہ کے خلاف بات کہتے تو گویہ اصطلاحاً جھوٹ ہوتا لیکن مظلوم کی جان بچ جاتی اور ہر شخص اس جھوٹ کو پسند کرتا۔

گویا عمل کی دنیا میں انسان ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں اسے خود فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس کا کونسا عمل کس وقت کیا نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ اسی لحاظ سے وہ اس عمل کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرتا ہے۔ لیکن کسی عمل کے بارے میں انسان کا یہ فیصلہ دنیوی نتائج کے اعتبار سے ہوگا اس کے پاس اس کا کوئی دلیل نہیں کہ جس عمل کو وہ ترجیح دے رہا ہے یقیناً وہ خدا کی رضا کا بھی موجب ہوگا اور جس عمل کو وہ چھوڑ رہا ہے، وہ وہی ہے جس سے خدا ناخوش ہوتا ہے۔ اسی مقام پر خدا کا رسول انسان کی مدد کرتا ہے اور اسے یقین کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

مثال کے طور پر عفوو درگذر اور انتقام دو متضاد اعمال ہیں۔ عفوو درگذر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر ہونے والی زیادتی کو نظر انداز کر جائے اور زیادتی کرنے والے کے ساتھ کوئی بُرا معاملہ نہ کرے۔ اس کے بالمقابل انتقام یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے اس کی زیادتی کا بدلہ لیا جائے۔ آپ نہیں بتا سکتے کہ انسان ظالم کو معاف کر کے خدا کو خوش کر سکے گا یا خدا اس وقت خوش ہوگا جب کہ انسان اپنی ذات کی مدافعت میں حملہ آور سے انتقام لے۔ اسی طرح ایثار و قربانی اور خود غرضی کو لیجیے۔ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے اگر آپ ان میں سے پہلی صفت کو اچھی صفت اور دوسری صفت کو بری صفت قرار دیتے ہیں تو یہ ایک صحیح بات ہوگی لیکن اگر آپ ان صفات کے ساتھ خدا کی رضا و عدم رضا کو متعلق کرتے ہیں تو آپ کسی بھی منطق کے ذریعہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کونسی صفت خدا کے نزدیک پسندیدہ اور کونسی ناپسندیدہ ہے؟ ایک شخص صرف اپنی ذات کی فکر کرتا ہے اور جو کچھ ملتا ہے اسے اپنے عیش و آرام میں صرف کرتا ہے۔ دوسرا شخص خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت پہنچاتا ہے، اور خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی دوسرا شخص خدا کا محبوب ہو، کیونکہ اس نے ایک مصیبت زدہ انسان کی مدد کی اور اسے تباہ ہونے سے بچایا، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی ایک عقلی امکان ہے کہ اس پر خدا کی طرف سے یہ الزام لگایا جائے کہ اس نے اپنی ذات کی

قدر نہیں کی اور اس کو خدا نے جو قوتیں اور صلاحیتیں دی تھیں ان کا اس نے حق نہیں پہچانا۔ اس طرح خدا کے نزدیک دوسرا شخص مجرم اور پہلا شخص قابل تعریف قرار پا سکتا ہے۔ بتائیے کس بنیاد پر ہم ان دونوں امکانات میں سے ایک کو ترجیح دیں اور دوسرے کو مرجوح قرار دیں؟

اس سے آگے آپ ان افعال کے بارے میں غور کیجیے جو خاص خدائے تعالیٰ کے لیے انجام دیے جاتے ہیں، انسان خدائے تعالیٰ کی نعمتوں میں ڈوبا ہوا ہے، شب و روز اس پر خدا کے انعامات کی بارش ہو رہی ہے۔ انسان ان احسانات کا تصور کرتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر اپنے محسن کی حمد و ثنا جاری ہو جاتی ہے یہ احساس کبھی کبھی اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ انسان خدا کی تعریف میں گم ہو جاتا ہے اور اس کا پورا وجود خدا کی حمد کے ترانے پڑھنے لگتا ہے۔ جو واقعہ اس قدر فطری ہے اس کے بارے میں بھی ہم یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں کہ خدا لازماً اس سے خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے خدا کی حمد و ثنا بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی بڑا رئیس کسی ضرورت مند کو ایک معمولی اور حقیر سا عطیہ دے اور وہ بھرے مجمعوں میں اس کا اظہار کرتا پھرے۔ ظاہر ہے یہ اس رئیس کی تعریف نہیں تنقیص ہو گی اور ہر شخص اس کے بخل کی مذمت کرے گا کہ اس کے روبرو ایک شخص نے اپنا ہاتھ پھیلایا لیکن اس نے اپنی حیثیت اور مرتبے کے مطابق اسے کچھ نہیں دیا۔ یہی حال خدا اور بندے کا ہے۔ خدائے تعالیٰ تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کے پاس ہر چیز کے بے شمار خزانے ہیں۔ انسان کو اس کے پاس سے جو کچھ ملتا ہے وہ بہت تھوڑا اور حقیر ہے۔ اگر خدائے تعالیٰ انسان کی ساری خواہشات پوری کر دے تو بھی اس کے خزانوں میں اتنی کمی نہیں آسکتی جتنی کمی ایک پرندہ کے سمندر میں اپنی پیاس بجھانے سے آتی ہے۔ ایسی ہستی کے معمولی سے انعامات کی تعریف میں انسان کا غلو، ہو سکتا ہے کہ اس کو پسند نہ آئے اور وہ اس کی برہمی کا سبب بن جائے۔

اسی طرح انسان خدا کے لیے جو تعظیمی حرکات بجالاتا ہے، وہ خدا کے بارے میں اس کے اندرونی احساسات کی حقیقی تصویر ہوتے ہیں لیکن ان میں اس وقت تک کوئی معنویت نہیں پیدا ہوتی جب تک کہ وہ خود خدا کے نزدیک بامعنی اور اہم نہ قرار پائیں۔ انسان کی مجبوری یہ ہے کہ وہ کسی طرح جان نہیں سکتا کہ خدا اس کی ان حرکات کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ مثال کے طور پر سجدہ ہے۔ یہ انسان کے نزدیک خدا کی تعظیم کے مکمل اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ ذریعہ

خدا کی نظر میں بھی پسندیدہ ہے یا نہیں؟ انسان کے سجدہ کرنے سے خدا خوش ہوتا ہے یا یہ ہیئت اسے ناگوار گزرتی ہے۔

اس طرح کے امکانات ہر معاملہ میں موجود ہیں۔ ہم ان میں سے کسی بھی امکان کو دوسرے امکان پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس کے لیے یقین کی ضرورت ہے۔ اور یقین کے اسباب ہمارے پاس نہیں ہیں۔ اگر اس حال میں ہمارا ایمان خدا کے رسول پر ہے تو وہ یقین کے ساتھ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سے کس امکان کو خدا کی سند حاصل ہے اور کونسا امکان محض ہمارے ذہن کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن اگر ہم خدا کے رسول کو نہیں مانتے ہیں تو ہمارے پاس یقین کے دو ذرائع ہیں۔ ایک اپنے تجربات اور دوسرے فطرت، لیکن اس معاملہ میں یہ دونوں ذرائع بالکل ناکافی ہیں۔ ہم ان پر اعتماد نہیں کر سکتے۔

کسی چیز کی افادیت اور عدم افادیت کا علم انسان کو تجربے سے ہوتا ہے۔ انسان کے ایک تو وہ تجربات ہیں جن کو وہ طبعیات کی دنیا میں کرتا ہے۔ تجربات کی دوسری قسم وہ ہے جو اخلاق کی دنیا میں اسے ہوتے ہیں۔ طبعیات کی دنیا میں ہونے والے تجربات اس کے آئندہ عمل کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ پانی سے پیاس بجھتی ہے اور چقماق کی رگڑ سے آگ پیدا ہوتی ہے، تو پیاس بجھانے کے لیے پانی کا اور آگ پیدا کرنے کے لیے چقماق کا استعمال شروع کر دیا۔ طبعیات کی دنیا میں انسان کے یہی تجربات ہیں جو مادی علوم کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اب تک وہ تجربے کے ذریعہ بہت سی چیزوں کا مفید یا مضر ہونا معلوم کر چکا ہے۔ آئندہ اس میں اور بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔

طبعیات کی دنیا میں جو اصول و قوانین کام کر رہے ہیں چونکہ وہ اٹل ہیں۔ اس لیے یہاں جو تجربات ہوتے ہیں وہ بھی یقینی ہوتے ہیں۔ لیکن اخلاق کی دنیا کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہاں اعمال کے نتائج متعین نہیں ہیں۔ اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ کس عمل کا کس وقت کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ طبعیات کی دنیا میں انسان کا تجربہ ہے کہ پانی نہ ملنے سے پودا خشک ہو جاتا ہے۔ اس تجربے کے خلاف کبھی کوئی واقعہ ظاہر نہیں ہوتا، لیکن ظلم کا ایک ہی نتیجہ ہمیشہ سامنے نہیں آتا۔ کبھی ظالم کو اس کے کیے کی سزا ملتی ہے اور کبھی مظلوم ظلم سہتا رہتا ہے اور ظالم کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ زمین پر کسی عمارت کی تعمیر کے لیے بنیاد کا ہونا ضروری ہے۔ انسان سوچ نہیں سکتا کہ بنیاد کے بغیر بھی کوئی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے، لیکن وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جھوٹ کو فروغ نہیں ہے، جب کہ وہ دیکھتا ہے کہ بسا اوقات سوسائٹی

میں سچ بار نہیں پاتا اور جھوٹ خوب پھیلتا رہتا ہے۔

یہاں ایک اور حقیقت قابل غور ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ کہیں کہ اخلاق کی دنیا میں بھی بعض اعمال مفید اور بعض مضر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے جو اعمال مفید ہیں ان کے کرنے پر انعام ملتا ہے اور مضر اعمال کے ارتکاب پر سزا دی جاتی ہے۔ اگر اخلاق کی دنیا میں نتائج کا اعتبار ممکن نہیں تو سچائی، امانت و دیانت، انصاف، ہمدردی اور ایثار جیسی صفات کی تعریف اور ان کے بالمقابل صفات کی مذمت نہیں ہونی چاہیے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اخلاق کی دنیا میں اعمال کی تعریف یا مذمت ان کے سماجی نتائج کی بنیاد پر ہوتی ہے، اور یہاں گفتگو ان کے انفرادی نتائج کے بارے میں ہے۔ انسان اپنے طبعی اعمال کے نتائج سے تو براہِ راست دوچار ہوتا ہے۔ لیکن اخلاقی نوعیت کے جتنے کام وہ انجام دیتا ہے ان کا فائدہ یا نقصان اس کی ذات کو نہیں بلکہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔ کسی طبعی واقعہ سے گزر کر آپ خود اس کے نفع وضرر کو محسوس کر سکتے ہیں۔ جب کہ کسی اخلاقی عمل کے بارے میں آپ کو اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اخلاق کی دنیا میں ہمیشہ دوسروں کے نفع ونقصان کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ جب ہم کسی اخلاقی عمل کو اچھا کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا بہتر صلہ دوسروں کو ملتا ہے اور کسی اخلاقی عمل کو بُرا کہنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ دوسروں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہے۔ ایک سچے شخص کی اس لیے تعریف کی جاتی ہے کہ اس کی سچائی سے دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے اور جھوٹے کی مذمت کی وجہ یہ ہے کہ جھوٹ سے دوسرے کا نقصان ہوتا ہے۔ یہاں یہ بالکل ضروری نہیں کہ ایک سچے انسان کو اس کی سچائی کا کوئی اچھا بدلہ ملے اور جھوٹا لازماً کسی برے انجام سے دوچار ہو۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ سچا گھاٹے میں رہے اور جھوٹے کو اس کا جھوٹ کام دے جائے۔ انسان ٹھوکر کھاتا ہے تو خود درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے پڑوسی کے گھر آگ لگاتا ہے تو اپنا نہیں دوسرے کا نقصان کرتا ہے۔

اس طرح اخلاقی اعمال حقیقت میں سماجی اعمال ہیں۔ ان کا نفع ونقصان سماج کے حصے میں جاتا ہے۔ جو شخص اچھے اخلاق کا پابند ہے وہ سماج کا محسن ہے اور سماج کو ایک مفید ادارہ بننے میں مدد دے رہا ہے۔ جس شخص کی طرف سے بُرے اخلاق کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ سماجی مجرم ہے۔ کیونکہ اس سے سماج کو نقصان پہنچتا ہے۔

جن اعمال کا نفع اور نقصان دونوں سماج کی طرف لوٹتے ہوں ان کے بارے میں فرد یہ کیسے جان سکتا ہے کہ وہ اس کی ذات کے لیے مفید ہیں یا مضر؟ جب کہ اس کے پاس اس کے معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ جو بھی کام کرتا ہے اس کا سماج کے لیے مفید یا مضر ہونا تو جانتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کا یہ عمل خود اس کی ذات کے لیے بھی مفید ہے یا نہیں؟

کہا جا سکتا ہے کہ سماج کا نفع و نقصان فرد سے الگ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ سماج کے اچھے نتائج سے فرد کو فائدہ پہنچتا ہے اور سماج کے بُرے نتائج سے اس کا نقصان ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات صحیح ہے، لیکن سماج کے نتائج پورے سماج میں پھیل جاتے ہیں۔ اس سے سماج کے بہی خواہ و بدخواہ سب ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرد کا حصہ ان میں غیر متعین ہوتا ہے۔ کوئی شخص بتا نہیں سکتا کہ اس کے کس عمل کا سماج اس کو کیا بدلہ دے رہا ہے؟ اس وقت ہم سماج کے لیے نہیں بلکہ فرد کے لیے اخلاقی اعمال کی افادیت وعدم افادیت سے بحث کر رہے ہیں۔ خدا کا شعور اجتماعی شعور نہیں ہے، بلکہ یہ فرد کا اپنا احساس ہے، اس لیے فرد یہاں اپنے اعمال کا اسی پہلو سے جائزہ لے گا کہ وہ خدا کو خوش کرنے میں کس حد تک مفید یا مضر ہیں؟ اپنے کس عمل سے وہ خدا کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے اور کونسا عمل اس کو اس کی رحمت سے دور کرنے والا ہے؟

جن معاملات میں انسان کے سامنے واضح دلائل نہیں ہوتے۔ ان میں وہ اپنی فطرت کی آواز پر کان لگاتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرنے لگتا ہے۔ یہ آخری عدالت ہے جس کی طرف انسان اس وقت رجوع کرتا ہے جب کہ وہ ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ فطرت کا فیصلہ اس کے لیے آخری فیصلہ ہوتا ہے اس کے پیچھے انسان کا یہ احساس کام کرتا ہے کہ فطرت خیر پسند ہے۔ وہ کبھی برائی کا مشورہ نہیں دے سکتی جس طرف وہ جھک جائے یقیناً اس میں انسان کے لیے بھلائی ہوگی، کیونکہ اس کائنات میں قدرت کا یہ اصول ہے کہ اگر کسی چیز کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ خیر ہی کا انتخاب کرتی ہے اور شر اور برائی سے بچی رہتی ہے۔ پودا زمین سے ان ہی اجزاء کو منتخب کرتا ہے جو اس کی نشو و نما میں مفید اور معاون ہوں۔ یہ عالمگیر اصول اس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ انسان کی فطرت کبھی شر کو پسند نہیں کر سکتی۔ وہ اسی چیز کا انتخاب کرے گی جس میں ہمارے لیے خیر ہو۔ اس لیے جب کوئی معاملہ دو متضاد پہلو سامنے لا رہا ہو تو ان میں سے جس پہلو کے حق ہونے پر ہماری فطرت مطمئن ہو اسی کو اختیار

کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ وہی حق ہے اور اس کا مخالف پہلو باطل ہے۔ فطرت کا اگر یہ فیصلہ ہے کہ جھوٹ کے مقابلے میں سچ خدا کو پسندیدہ ہے۔ امانت سے وہ خوش اور خیانت سے ناخوش ہوتا ہے تو یقین ہے کہ حقیقت یہی ہوگی۔ اس کے خلاف نہیں ہوسکتا۔

لیکن ہمارا خیال ہے کہ فطرت کی راہنمائی کے معاملے میں انسان کو کائنات کی دوسری چیزوں پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ کائنات کی جو چیز جس وقت جس حالت میں ہے ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہی اس کی فطرت ہے لیکن انسان کی کسی بھی حالت کے بارے میں ہم اس یقین کا اظہار نہیں کرسکتے۔ قدرت نے جس چیز کا جو ضابطہ مقرر کردیا ہے وہ اس پر جمی ہوئی ہے۔ اس سے پھیرنے والی کوئی قوت اور کوئی داعیہ اس کے اندر نہیں پایا جاتا، لیکن انسان متضاد داعیات رکھتا ہے اس کے اندر جہاں عفو و درگذر کا جذبہ پایا جاتا ہے وہاں انتقام کا جذبہ بھی موجود ہے۔ انسان کے خارج میں ایسے اسباب موجود ہیں جن سے اس کے ان جذبات و داعیات کو تقویت پہنچتی ہے اور جو جذبہ قوی ہوتا ہے، وہ اسکی فطرت پر اثرانداز ہوتا ہے۔ خارج کے ان اسباب کے نتیجے میں یہ بھی ممکن ہے کہ ایک غیر فطری جذبہ انسان کے اندر اس قدر قوت حاصل کرلے کہ اس کے مقابلہ میں فطری جذبہ مضمحل ہوکر رہ جائے اور مخالفِ فطرت ہنگاموں میں فطرت کی آواز بالکل دب جائے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت کے اصول کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب پر سارے انسان کبھی متفق نہیں ہوئے۔ کسی کے نزدیک دشمن سے بدلہ لینا درندوں کی صفت ہے تو کوئی عفو و درگذر کو بزدلی کا ہم معنی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک مخالف قوتوں سے کش مکش اور جنگ انسان کی فطرت ہے۔ تواضع ہمدردی اور محبت کو دیکھ کر ایک شخص کہے گا کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فطرت زندہ ہے دوسرا شخص ان ہی صفات کو مسکینیت کا اظہار قرار دے گا اور ان کو انسان کیلیے نقصان دہ اور اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھے گا۔ جنسی تعلق کے لیے سماجی بندشیں کسی کے نزدیک ضروری ہوں گی اور کوئی ان کو غیر فطری کہہ کر رد کردے گا۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان ابھی تک اس سوال کو حل نہیں کرسکا ہے کہ اس کی فطرت کیا ہے؟ ظاہر ہے ایک ہی چیز سیاہ اور سفید دونوں نہیں ہوسکتی۔ ایک عمل فطری ہے تو لازماً اس کے مخالف عمل کو غیر فطری ہونا چاہیے۔ لیکن جو شخص جس عمل کو اپنے لیے پسند کرتا ہے اسی کو مطابق فطرت سمجھتا ہے۔ اس عمل کی مخالفت اس کے نزدیک فطرت کی مخالفت کے ہم معنیٰ ہوتی ہے۔ آپ جس روش کو حق

سمجھتے ہیں سارے انسان اس کو حق نہیں سمجھتے اور آپ جس روش کو باطل قرار دیتے ہیں اس کے باطل ہونے پر بھی سب متفق نہیں ہیں۔ اس وقت آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو شخص آپ کی مخالفت کرتا ہے وہ دیدہ ودانستہ باطل کے پیچھے چل رہا ہے۔ اور باطل کو باطل سمجھتے ہوئے حق کے مقابلے میں اسے ترجیح دے رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کو عمل کی آزادی حاصل ہے اور وہ اس کو فطرت کے فیصلے کے خلاف استعمال کر سکتا ہے، لیکن نظریات کا اختلاف بھی ایک حقیقت ہے۔ یہ اختلاف انسانوں کو بسا اوقات ایک دوسرے سے بہت دور پہنچا دیتا ہے اور زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں وہ آپس میں ملتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ جو جس راہ پر آگے بڑھتا ہے اسی کو سیدھی اور سچی راہ سمجھتا ہے اس کے علاوہ فکر و نظر کی جتنی راہیں ہیں وہ سب اس کے نزدیک باطل ہوتی ہیں۔

نظریات کا یہ اختلاف انسان کی فطرت پر ہمارے اعتماد کو باقی نہیں رکھتا۔ جب فطرت خارجی عوامل سے اس قدر متاثر ہو سکتی ہے کہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھنے لگے تو ہم خدا کی مرضی معلوم کرنے کے لیے اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ خدا اگر حق کو پسند کرتا ہے تو یقیناً باطل اس کو ناپسند ہوگا اور انسان کی فطرت کا یہ حال ہے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔

اب آپ یہاں پیدا ہونے والے ایک سوال پر غور کیجیے۔ وہ یہ کہ کیا فطرت کی اس طرح تربیت ممکن ہے کہ اس پر غلط محرکات اثر انداز نہ ہوں اور وہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہے کیا اس صورت میں اس کو خدا کی مرضی کا صحیح علم ہو سکتا ہے؟ بعض لوگ اس کا جواب اثبات میں دے دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہر دور میں ایسے افراد پائے گئے ہیں جن کی فطرت خارج کے غلط محرکات سے متاثر نہیں ہوئی اور ان کو خدا کی مرضی کا صحیح شعور حاصل ہوا۔ چنانچہ خدا کے بارے میں ان کے خیالات کی تائید خود خدا کے رسولوں نے کی ہے۔ انہوں نے جس عمل کے بارے میں کہا کہ اس سے خدا خوش ہوتا ہے خدا کے رسولوں نے بھی اسے خدا کی رضا کا سبب بتایا۔ انہوں نے جس عمل کو خدا کو ناخوش کرنے والا سمجھا خدا کے رسولوں نے اتفاق کیا کہ واقعتہً اس سے خدا ناخوش ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک صحیح الفطرت انسان خدا کی مرضی معلوم کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے ہمارے پاس خدا کی مرضی کو جاننے کے دو ہی ذرائع ہیں یا تو ہم خدا کے رسولوں پر اعتماد کریں جو اس دعوے کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں کہ خدا کی مرضی کا علم ان کو براہِ راست خدا کی طرف سے حاصل ہوتا ہے یا اپنی فطرت کی رہنمائی قبول کریں۔ خدا کے رسولوں نے بعض انسانوں کی فطرت کی تصدیق کر کے یہ بتا دیا کہ فطرت کو

خدا کی مرضی کا صحیح علم ہو سکتا ہے۔ ایک صحیح الفطرت انسان خدا کی خوشی و ناخوشی کا علم حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے ذریعہ کا محتاج نہیں ہے۔ اگر وہ خدا کے رسول پر ایمان لے آئے یا وہ خود رسول بنا دیا جائے دونوں صورتوں میں خدا کے بارے میں اسے ان ہی باتوں کا علم ہوگا جن کی طرف فطرت پہلے ہی اس کی راہنمائی کر چکی تھی۔

یہ دلیل اپنے دعویٰ کے اثبات میں بہت ہی ناقص اور کمزور ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ فطرت خارج کے اچھے یا بُرے محرکات سے اثر قبول کرتی ہے، تو ہمارے پاس اس اطمینان کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ کس معاملہ میں وہ خدا کی مرضی کا صحیح ادراک کر رہی ہے اور کس معاملہ میں اس پر کوئی غلط محرک اثر انداز ہو رہا ہے؟ خدا کے رسولوں نے جن لوگوں کی فطرت کی تائید کی ہے، ہو سکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر ان کی فطرت سابقہ رسولوں کی تعلیمات سے متاثر رہی ہو۔ مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمین پر جو پہلا انسان وجود میں آیا وہ خدا کا رسول تھا۔ اس کے بعد کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں خدا کے رسول آتے نہ رہے ہوں۔ ان کی وجہ سے ہمیشہ انسانوں کے ایک گروہ میں خدا کا صحیح تصور زندہ رہا ہے۔ اس لیے یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ جن لوگوں کو خدا کا صحیح شعور ملا ہے وہ ان کی اپنی فطرت کی رہنمائی سے زیادہ خدا کے رسولوں کی تعلیمات کا نتیجہ ہو۔ پھر یہ کہ خدا کے بارے میں بعض افراد کی فطرت کے فیصلوں کی اگر رسولوں نے تائید کی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فطرت کبھی غلطی کر ہی نہیں سکتی۔ اس بات کا امکان بہر حال باقی ہے کہ ہماری فطرت کہیں نہ کہیں لغزش کھا جائے۔ ایک چیز کو ہم حق سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رہیں اور وہ حقیقتہً باطل ہو۔

یہ بات بھی واقعہ کے خلاف ہے کہ ماحول کے بگاڑ سے جن لوگوں کی فطرت غبار آلود نہیں ہوئی اور جو باطل کے غلط اثرات سے محفوظ رہے، وہ خدا کی مرضی کو پانے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے کہ جن لوگوں نے اپنی فطرت کی راہنمائی میں خدا کی ذات و صفات کو سمجھنے اور اس کی مرضی کو معلوم کرنے کی کوشش کی وہ اس دنیا سے کٹ گئے اور جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ان کی یہ روش صاف ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے۔ خدا کی ذات و صفات کے بارے میں غور و فکر نے ان کو حیرانی و سرگشتگی کے عالم میں پہنچا دیا اور وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ان کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ زندگی کے مختلف معاملات میں خدا

کیا چاہتا ہے، اس کی مرضی کیا ہے اور اسے کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے؟

یہاں ہم اس حقیقت کو نہیں بھول سکتے کہ اس دنیا میں انسان کا موجود ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی کامیابی و ناکامی کے اسباب بھی اسی دنیا میں اس کو ایک وقت دیا گیا ہے جس میں وہ دنیا کو استعمال کرکے کامیاب یا ناکام ہو سکتا ہے۔ جو شخص دنیا سے بھاگتا ہے وہ ان قیمتی اسباب کو کھو رہا ہے، جو اس کی کامیابی کے لیے یہاں فراہم کیے گئے ہیں۔ وہ اپنے حق میں کامیابی کے دروازے بند کر رہا ہے اور ناکامی کو دعوت دے رہا ہے۔ ایک سپاہی کی کامیابی یہ ہے کہ تلوار چلاکر اپنے حاکم کی طرف سے مدافعت کرے اور دشمن کو ہلاک کر دے لیکن اگر وہ تلوار پھینک دے اور دشمن کا مقابلہ کرنے سے گریز کر جائے تو اپنے مقصد میں اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔ وہ نتیجۃً اس سپاہی سے مختلف نہیں جو اپنی تلوار حاکم کے خلاف استعمال کرتا اور اس سے جنگ کرتا ہے۔

چوتھا دعویٰ

اب رسول کا چوتھا دعویٰ سنیے۔ خدا کی ذات وصفات اور اس کی مرضی کا علم انسان کو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ خود خدا اسے بتائے کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے؛ خدا اپنے بارے میں یہ معلومات صرف ان انسانوں کو فراہم کرتا ہے جن کو وہ اپنا رسول مقرر کرتا ہے۔ عام انسانوں کو یہ معلومات رسولوں کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں کیونکہ براہ راست خدا ان تک یہ معلومات نہیں پہنچاتا۔ رسولوں سے بے نیاز ہو کر وہ کسی اور طریقے سے خدا کی مرضی نہیں معلوم کر سکتے۔

رسول کا یہ دعویٰ دوسرے الفاظ میں اس بات کا دعویٰ ہے کہ خدا کو ماننے والا انسان خدا کے بارے میں جس بنیادی سوال سے دوچار ہے رسول کے پاس اس سوال کا جواب موجود ہے۔ وہ خدا کے بندوں کی حقیقی ضرورت پوری کرنے آیا ہے۔

غور کیجیے! انسان خدا پر یقین کیوں رکھتا ہے؟ اس کا سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اس کائنات کے اندر زبردست خلا محسوس کرتا ہے جس کو وہ خدا پر یقین کے ذریعہ پُر کرنا چاہتا ہے وہ جدھر دیکھتا ہے اپنے آپ کو خدا کا محتاج پاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ خدا کی مدد کے بغیر اس کائنات میں بالکل بے سہارا ہے۔ انسان اپنے اس خلا اور احتیاج کو دور کرنے کے لیے مجبور ہے کہ ہر قدم پر خدا سے اپنا رشتہ اور تعلق قائم رکھے۔ تاکہ راحت کا اس سے امیدوار رہے اور مصیبت میں اس کی

پناہ لے سکے۔ نعمت میں اس کا شکر ادا کرے اور تکلیف میں اس کی مدد چاہ سکے۔ لیکن اس کی بے بسی یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ خدا کو کن الفاظ میں یاد کرے، کس طرح اس کی حمد کرے۔ اس سے کیسے قریب ہو اور اسکی رحمت کو کیسے اپنی طرف متوجہ کرے۔

کیا خدا کو ماننے والے انسانوں کی یہ فطری طلب پوری نہ ہوگی؟ عقل کہتی ہے کہ اسے لازماً پورا ہونا چاہیے اس کائنات میں خدائے تعالیٰ کا فیضان عام ہے۔ یہاں ضرورت ہے تو ساتھ ہی اس کو پورا کرنے کا سامان بھی ہے۔ یہ کائنات فطرت کے مطالبات کو رد نہیں کرتی بلکہ ان کی تکمیل کرتی ہے۔ انسان اپنے مادی وجود کی بقا کے لیے جن چیزوں کا محتاج ہے وہ ایک ایک کر کے اس کو دی گئی ہیں۔ ایسی کائنات میں ناممکن ہے کہ انسان خدا کو خوش کرنا چاہے اور اسے نہ معلوم ہو کہ اس کا خدا اس سے کیا چاہتا ہے وہ کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناخوش، انسان خدا سے قرب کے لیے تڑپ رہا ہو اور وہ اس سے قریب نہ ہو سکے۔

خدا کو ماننے والے بے شمار انسانوں کی ایک ایسی طلب جس کے بارے میں عقل کہتی ہے کہ اسے پورا ہونا چاہیے، خدا کے رسول کا دعویٰ ہے کہ وہ اس طلب کا جواب رکھتا ہے۔ رسول کے اس دعوے کو ماننے کے بعد ان کی یہ فطری طلب پوری ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ اس دعوے کو رد کرتے ہیں تو یہ ساری کائنات انکی مانگ پوری کرنے سے عاجز ہے۔ وہ ایک ایسی پوزیشن میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ ہاتھ پھیلائے چاروں طرف دیکھتے ہیں لیکن ان کی احتیاج رفع نہیں ہوتی۔ وہ تشنگی تو محسوس کرتے ہیں لیکن ان کو کہیں پانی نہیں ملتا جس سے وہ اپنی تشنگی دور کر سکیں۔

رسولوں کے اس دعوے کو ماننے کے لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ وہ اپنے دعوے میں سچے ہیں؟ رسولوں کے اپنے دعوے میں سچے ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انسان خدا کے بارے میں پیدا ہونے والے جن سوالات کا جواب معلوم کرنے سے عاجز ہے وہ ان کا صحیح اور قطعی جواب دیتے ہیں۔ خدا کی ذات و صفات کو جس نے بھی اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی حیرانی اور سراسیمگی کے سوا کچھ اس کے ہاتھ نہیں آیا۔ لیکن خدا کے رسول خدا کی ذات و صفات کی تفصیل پورے جزم و یقین کے ساتھ ہمیں سناتے ہیں۔ خدا اس کائنات کا نظم کس طرح کر رہا ہے اس کی رحمت و غضب کے کیا اصول ہیں۔ اس کے علم کی کیفیت کیا ہے؟ ان تمام سوالات کا عقل سے قریب اور یقینی جواب

ان کے پاس موجود ہے۔ خدا کے بارے میں جو معلومات انسان کو رسولوں کے ذریعہ ملی ہیں وہ خدا سے تعلق کی بنیاد بن سکتی ہیں۔ ان تعلیمات سے بے نیاز ہو کر انسان خدا سے کبھی اپنا رشتہ نہیں قائم کر سکتا۔ خدا کی تلاش میں وہ جنگل کے مسافر کی طرح بھٹکتا پھرے گا لیکن منزل تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔

آپ کہیں گے کہ خدا کے بارے میں رسول جو معلومات پیش کرتا ہے وہ یقیناً عقل سے قریب تر اور صحیح ہیں لیکن رسول کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ معلومات اس کو براہِ راست خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس پر یقین کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ رسول کے بیان کی تصدیق کر لی جائے۔ کیونکہ عام انسانوں سے خدا خطاب نہیں کرتا اس لیے وہ اس کی حقیقت سے بالکل بے خبر ہیں۔ ایک ایسا دعویٰ جس کی صداقت کے جاننے کا ذریعہ خود مدعی کا بیان ہو قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اس اعتراض کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت جس ذریعہ سے علم حاصل کرتی ہے اسی کو سارے انسانوں کے علم کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ کوئی فرد ایسے کسی ذریعۂ علم کا دعویٰ نہیں کر سکتا جس سے انسانوں کی بڑی تعداد ناواقف ہو۔ اس لیے اگر واقعتہً خدا کی طرف سے اس کے رسولوں کو کسی بات کا علم ہوتا بھی ہے تو عام انسان اس پر یقین نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اس ذریعہ علم سے آشنا ہیں۔

یہ بالکل بے دلیل اعتراض ہے۔ رسول کے دعوے کی تائید ہمارے مطالعۂ کائنات سے ہوتی ہے۔ اس کائنات کو اگر ہم ایک واقعہ کے طور پر تسلیم کرتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا ادراک اسی حد تک کیا جا سکتا ہے جس حد تک ہم اس کو محسوس کرتے ہیں۔ آنکھ سے رنگ اور روشنی کا پتہ چلتا ہے، کان آواز کو اخذ کرتے ہیں، چھونے سے سختی اور نرمی کا علم ہوتا ہے چکھ کر لذت اور ذائقہ کا پتہ چلایا جاتا ہے۔ سونگھنے سے بو کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احساس کی ساری قوتیں تمام انسانوں کو حاصل نہیں ہیں بلکہ یہ قوتیں کسی کو کم اور کسی کو زیادہ ملی ہیں۔ کوئی بینائی کی قوت رکھتا ہے اور کوئی اس سے محروم ہے۔ کسی کے پاس سننے کی صلاحیت ہے اور کسی کو یہ صلاحیت نہیں ہے۔ یہی حال دوسری قوتوں کا بھی ہے۔ احساس کی قوتیں جس شخص کو جتنی زیادہ حاصل ہیں وہ اس کائنات کا اتنا ہی زیادہ ادراک کرتا ہے اور جس کو یہ قوتیں جس مقدار میں کم ملی ہیں، کائنات کا ادراک بھی اس کو اسی مقدار میں کم ہوتا ہے۔ جو چیزیں آنکھ ہی سے دیکھی جا سکتی ہیں آنکھ والے انسان کے لیے تو ان کا وجود ہے، لیکن جو نابینا ہے اس کے لیے

ان کا وجود و عدم برابر ہے۔ جس شخص کو سماعت کی قوت حاصل ہے وہ آواز کے حسن و قبح کو محسوس کرتا ہے لیکن بہرے کے لیے نغمہ اور آواز بے معنی چیز ہے۔

یہ واقعہ کہ انسانوں کو احساس کی قوتیں کم و بیش ملی ہیں اور اسی تناسب سے وہ موجودات کو کم یا زیادہ محسوس کرتے ہیں، اس بات کا امکان پیدا کر دیتا ہے کہ کچھ انسان ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کو احساس کی قوتیں زیادہ حاصل ہوں۔ اور وہ اپنی ان قوتوں کی وجہ سے کائنات کی ایسی حقیقتوں کو محسوس کر رہے ہوں جن کو انسان کی اکثریت کسی طرح محسوس نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی شخص اپنے لیے ایسی کسی قوت کا دعویٰ کرتا ہے تو ہمارے پاس اس کے دعوے کی تردید کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ آنکھ والا شخص اندھے کے مقابلے میں کائنات کا زیادہ ادراک کرتا ہے۔ اندھے کے لیے یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ وہ آنکھ ہی کا انکار کر دے یا ان چیزوں کو نہ مانے جن کو صرف آنکھ والا شخص ہی دیکھ سکتا ہے۔

غور کیجیے، اندھا مشاہدات کے انکار کی کیوں نہیں جرأت کرتا اور وہ ان پر آنکھ والے شخص کی طرح یقین رکھتا ہے؟ اس کی سیدھی اور صاف وجہ یہ ہے کہ بے شمار انسانوں نے اسے مشاہدات کے وجود کا یقین دلایا ہے۔ مشاہدات کا انکار وہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ ان سب کو جھوٹا نہ قرار دے لے۔ لیکن انسانوں کی ایک بڑی تعداد کے بارے میں اس قدر بے اعتمادی کا اظہار آسان نہیں ہے اس لیے اندھا آنکھ والوں کی شہادت کو قبول کرتا ہے اور مشاہدات پر یقین رکھتا ہے۔

اس اصول کے تحت رسول کے دعویٰ رسالت سے بھی انکار نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہم کسی متعین شخص کو خدا کا رسول مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ کسی بھی اندھے کے سامنے مشاہدات کی گواہی دینے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوگی جتنی تعداد کہ رسالت کا دعویٰ کرنے والوں کی ہے۔ یہ تعداد گو تاریخ کے ایک لمبے دور میں پھیلی ہوئی ہے لیکن ان کے دعوے کا مجمل علم ہم میں سے ہر شخص کو ہے۔ گویا ہم میں سے ہر شخص کے سامنے بے شمار افراد انسانی اپنے رسول ہونے کا اعلان کر رہے ہیں۔ جب ہم کسی اندھے کے لیے آنکھ والوں کی شہادت کو جھٹلانا صحیح نہیں سمجھتے تو دعوے رسالت کی تکذیب کا بھی ہمیں حق حاصل نہیں ہے۔ اگر خدا اپنی مرضی سے براہ راست ہمیں آگاہ نہیں کرتا تو یہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ جن لوگوں کو خدا اپنی مرضی کا علم عطا کرتا ہے انہیں جھوٹا قرار دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ بعض انسانوں کو بعض غیر معمولی قوتیں عطا کرتا ہے۔ جن حقیقتوں تک عام انسانوں کی رسائی نہیں ہوتی ان تک وہ آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ جن چیزوں کو اور لوگ مشکل سے دیکھ سکتے ہیں وہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ ایسے انسان تہذیب و تمدن، اخلاق و سیاست، علم و فن جس میدان میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اپنے حیرت انگیز کارناموں کی وجہ سے اس میں امامت اور راہنمائی کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ دنیا ان کے پیچھے چلتی ہے اور ان کی قیادت میں اپنی تہذیبی و تمدنی ضروریات پوری کرتی ہے۔ یہ غیر معمولی افراد دراصل انسان کی مختلف ضرورتوں کی تکمیل کا خدائی ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ خدا کے رسولوں کا ہے۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ایک حقیقی ضرورت پوری کرتا ہے۔ انسانیت زندگی کے کسی بھی میدان میں قیادت اور راہنمائی کی اتنی محتاج نہیں ہے جتنی وہ خدا کے رسولوں کی محتاج ہے۔ تہذیب و تمدن کے میدان میں جو امام پیدا ہوتے ہیں وہ انسانیت کو کچھ نیا سامان دیتے ہیں۔ اخلاق کی دنیا میں جو شخص قیادت کرتا ہے وہ انسانیت کو اخلاق کے اصول و آداب سے روشناس کراتا ہے۔ امام سیاست کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے حریف کو شکست دے کر سیاست کی دنیا پر قابض ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا کے رسول کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خدا کی ذات و صفات، اس کی مرضی اس کے احکام، اس کی رحمت کا حال اور اس کے غضب کی کیفیت سے انسان کو آگاہ کرتا ہے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن کے جاننے کا انسان کے پاس سوائے رسول کی زبان و بیان کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ طبعیات کی دنیا میں راہنمائی کرنے والے افراد کے کارنامے روزانہ کے واقعات کے مقابلے میں جیسی کچھ عظمت اور شان رکھتے ہیں ویسی ہی عظمت رسولوں کے کارناموں کی ان کارناموں کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

فکر و عمل کی جو قوتیں انسانوں کو حاصل ہیں ان سے وہ مادی دنیا کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے مادی دنیا میں کوئی بڑا کام انجام دینے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ ان کی قوتیں بڑھی ہوئی ہوں۔ چنانچہ مادی علوم میں جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ امامت اور راہنمائی کا مقام عطا کرتا ہے ان کی قوتوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ اگر عام انسانوں کو ایک حصہ قوت حاصل ہوتی تو وہ سو حصے قوت رکھتے ہیں۔ لیکن خدائے تعالیٰ اپنے رسولوں پر مادیات کی دنیا سے باہر کی بعض پوشیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے ان حقیقتوں کے مطالعہ کے لیے ان کو نئے ذرائع اور نئی قوتیں عطا کرتا ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہیں۔ خدا کے رسول جن حقیقتوں کا اظہار کرتے ہیں اگر ہم ان کو صحیح مانتے ہیں تو یہ بھی

ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ کوئی ایسا ذریعۂ علم رکھتے ہیں جو کسی دوسرے انسان کو نصیب نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اپنے مخصوص ذرائع علم سے ان حقیقتوں تک پہنچ ہی نہیں سکتے۔

خدا کے رسول، کائنات، خدا اور انسان کے بارے میں ایک پورا نظام فکر و عمل پیش کرتے ہیں اس نظام کو سمجھنے اور اپنانے کے لیے ان کے دعوئے رسالت پر ایمان ناگزیر ہے۔

فصل سوم

رسول کی پہچان

خدا کا رسول رسالت کی حقیقت سے براہِ راست واقف ہوتا ہے۔ اس لیے اس کو اپنے رسول ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے وہ شعوری طور پر جانتا ہے کہ اسے منصبِ رسالت حاصل ہے اور خدا اس سے خطاب کر رہا ہے۔ رسالت اس کے لیے کوئی قیاسی اور استدلالی چیز نہیں ہوتی بلکہ ایک مشاہداتی حقیقت ہوتی ہے۔ جس طرح ہم اپنے کسی ذاتی تجربے اور مشاہدے کے بارے میں شک نہیں کرتے ٹھیک اسی طرح خدا کے رسول کو بھی اپنی رسالت کے بارے میں کوئی شک اور تردد نہیں ہوتا۔

رسالت کے بارے میں اس نوعیت کا یقین اس شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا جو خدا کا رسول نہیں ہے۔ رسالت کی کیفیت کا اس کو تجربہ یا مشاہدہ نہیں ہوتا اس لیے وہ اس کی حقیقت کو براہ راست جان بھی نہیں سکتا۔ سوال یہ ہے کہ پھر رسالت پر اس کے یقین کا کیا ذریعہ ہے؟ وہ کس بنیاد پر خدا کے رسولوں پر ایمان لائے؟ وہ کیسے معلوم کرے کہ کون شخص خدا کا رسول ہے اور کون خدا کا رسول نہیں ہے؟ مذہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے اطمینان کے لیے خدا کا رسول اپنی رسالت کے ثبوت میں بعض دوسرے دلائل کے ساتھ معجزات بھی پیش کرتا ہے :۔

معجزات

معجزہ ایک مذہبی اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی واقعہ جس ترتیب کے ساتھ اس عالم میں ظاہر ہوتا ہے رسول کی صداقت کے ثبوت میں وہ ترتیب بدل جائے فرض کیجیے رسول کے کہنے پر لکڑی

سانپ اور اژدہے کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو یہ معجزہ ہوگا کیونکہ کسی جاندار کے وجود میں آنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ یا رسول کی دعا سے زلزلہ اور طوفان آجائے تو یہ معجزہ کہلائے گا کیونکہ زلزلہ اور طوفان کے اسباب معلوم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ان اسباب میں انسان کی دعا شامل نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات دنیا کی تقریباً تمام قوموں اور جماعتوں میں مشہور ہیں۔ ان میں سے بہت سے واقعات تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اترتے، اس لیے ان پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ساتھ ہی بعض واقعات اس تسلسل اور تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ ان کا انکار کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

بعض لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس قسم کے واقعات رسول کے دعوئ رسالت کا ثبوت ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ہر واقعہ کے کچھ اسباب ہوتے ہیں جن کے نتیجہ میں وہ وجود میں آتا ہے۔ بغیر سبب کے کوئی واقعہ نہ اب تک وجود میں آیا ہے اور نہ آئندہ کبھی وجود میں آ سکتا ہے۔ ہاں یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی واقعہ کے تمام اسباب سے ہر شخص واقف ہو۔ عام انسانوں کو صرف ان ہی اسباب کا علم ہوتا ہے جو بالکل ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ یہی اس واقعہ کے حقیقی اسباب ہیں اور کوئی دوسرا سبب اسے وجود میں نہیں لا سکتا۔ لیکن یہ ان کی کم نظری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات بہت سے مخفی اسباب بھی واقعات کو وجود میں لاتے ہیں۔ اسی نوعیت کے واقعات کو رسول معجزہ کا نام دیتا ہے اور انہیں اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ حالانکہ جب بھی کسی واقعہ کو وجود میں لانے والے اسباب جمع ہو جائیں گے وہ لازماً وجود میں آئے گا،" خواہ رسول اس کو اپنے دعوئ رسالت کے ثبوت میں پیش کرے یا نہ کرے۔ یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ مخفی اسباب کی بنا پر واقعات ہمیشہ نہیں ظاہر ہوتے بلکہ اس طرح ان کا ظہور شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ لیکن ان کی اس ندرت کی وجہ سے سادہ لوح عوام رسول کے اس دعوٰی پر ایمان لے آتے ہیں کہ وہ اس کے معجزات ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعاً معجزات نہیں ہیں۔ اسے عوام کا قصور فہم کہنا چاہیے کہ وہ ان پوشیدہ اسباب کو نہیں دیکھ سکے جو ان واقعات کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر دریا کا پانی کچھ دیر کے لیے دو حصوں میں بٹ جائے اور درمیان میں خشکی ظاہر ہو جائے تو رسول اس کو معجزہ کہے گا۔ حالانکہ دریا میں مدوجزر ہمیشہ ہوتا ہی رہتا ہے، البتہ عام طور پر اس میں شدت نہیں ہوتی۔ کبھی یہ مدوجزر زیادہ شدید ہو کر ایسی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے جسے رسول معجزہ سے تعبیر کرتا ہے۔

لیکن معجزات کی تردید میں یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو رسالت کے انکار کے لیے کوئی بہانہ تلاش کررہا ہو۔ ایک شخص آپ کے سامنے خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ آپ اس سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں اور وہ پتھر سے اونٹ نکال کر آپ کے روبرو کھڑا کر دیتا ہے۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ہر شخص یہی کہے گا کہ یہ رسول کے دعویٰ کے ثبوت میں ظاہر ہوا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص اس کی یہ توجیہ کرتا ہے کہ اس کو وجود میں لانے والے اسباب پہلے سے موجود تھے تو اس توجیہ کو کوئی بھی صاحبِ فہم انسان معقول نہیں قرار دے سکتا۔ معجزہ اگر ناقابل قبول ہے تو یہ توجیہ اس سے کہیں زیادہ ناقابل قبول ہے۔ یہ کہنا کہ اس واقعہ کے اسباب ظاہر نہیں تھے بلکہ چھپے ہوئے تھے، ہمارے نزدیک بالواسطہ دعویٰ رسالت کی تائید کرنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جس واقعہ کو وجود میں لانے والے اسباب پوشیدہ تھے ان کا علم رسول کو پہلے سے کیسے ہوگیا؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بہت سے اسباب و واقعات جو ہماری نظر سے نہاں ہیں وہ رسول کے لیے بالکل کھلے ہوئے ہیں۔ اس وسیع کائنات کو ہم نے بہت کم جانا ہے۔ اس کا بڑا حصّہ ہمارے لیے ایک سربستہ راز ہے۔ آج تک کوئی شخص نہ تو پوری کائنات کو سمجھ سکا ہے اور نہ کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔ اس حال میں رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو اس کائنات کی بہت سی ان حقیقتوں کا علم ہے جن سے ہم ناواقف ہیں۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں وہ کہتا ہے کہ یہ مردہ جو تمہارے سامنے پڑا ہوا ہے خدائے تعالیٰ ابھی اس کو زندہ کرنے والا ہے اور اس کے کہنے کے مطابق مردہ میں جان آجاتی ہے کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ اپنے دعوی میں سچا ہے اور اس کو ایسی حقیقتوں کا علم ہے جو آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہیں؟

اب آپ ایک دوسرے سوال پر غور کیجیے۔ وہ یہ کہ رسالت کے دعویٰ کے ساتھ کسی واقعہ کا غیر عادی طور پر ظاہر ہونا دعویٰ کرنے والے کی صداقت کی دلیل کیسے بن جاتا ہے؟ اگر کسی کے حکم سے خشک زمین سے پانی کا چشمہ اُبل پڑے تو اس سے یہ بات کیسے ثابت ہوگئی کہ اس کے پاس وحی آتی ہے اور وہ براہ راست خدا کا کلام سن رہا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ منطقی معنی میں رسالت کی دلیل نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی قدرت کا ایک غیر معمولی مظاہرہ ہے جو رسول کے دعویٰ کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے رسول یہ ثابت کرتا ہے کہ خدا سے اس کا تعلق ایک خاص نوعیت کا ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں ہے اور اسی تعلق کو وہ وحی و رسالت کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص کہتا ہے کہ وہ فلاں

حکومت کا سفیر اور نمائندہ ہے اور اس کا ثبوت اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ اس حکومت کو ایک سفارشی خط لکھتا ہے اور اس کی سفارش منظور ہو جاتی ہے۔ یہ واقعہ اس کے سفیر ہونے کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہو لیکن اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا حکومت سے بہت گہرا اور قریبی ربط وتعلق ہے اور یہ ربط وتعلق دعویٰ کرنے والے کے بقول سفارت کا ہے۔ اسی طرح معجزہ رسول کے دعوی رسالت کے ساتھ مل کر اس کی صداقت کی دلیل بن جاتا ہے۔

جو لوگ خدا پر یقین رکھتے ہیں ان کے لیے معجزہ کا ظہور بعید از امکان نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس کائنات میں بڑے سے بڑا واقعہ ہو سکتا ہے۔ معجزہ نام ہے اس بات کا کہ واقعات جس ترتیب سے وجود میں آرہے ہیں اس ترتیب سے ہٹ کر کوئی واقعہ وجود میں آجائے، اور یہ ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اگر خدا ہے اور واقعات کی ترتیب اسی کی قائم کردہ ہے تو وہ اس کی اپنی مرضی سے بدل بھی سکتا ہے۔ البتہ خدا پر جن لوگوں کا ایمان نہیں ہے وہ معجزات کا انکار کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں انہیں اس کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ کم سے کم اس امکان کو نہیں رد کر سکتے کہ واقعات اپنی ترتیب بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے کہ واقعات جس ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں وہ ناقابل ترمیم ہے، اور اس کی جگہ کوئی نئی ترتیب قائم نہیں ہو سکتی۔ انسان جب تک ان تمام اسباب کا احاطہ نہیں کر لیتا جو کسی واقعہ کے وجود کا ذریعہ بنتے ہیں اس وقت تک وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ کونسا واقعہ کب اور کس شکل میں ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کائنات میں واقعات کی جو ترتیب قائم ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ اس ترتیب میں تبدیلی کا اب تک مشاہدہ نہیں کیا گیا، لیکن اس سے اس کا امکان ختم نہیں ہوتا۔ اور اگر کوئی واقعہ اس ترتیب کے خلاف ثابت ہو تو اس کا انکار، ضد اور ہٹ دھرمی اور اپنے مشاہدہ پر اصرار کے ہم معنی ہوگا۔

معجزات رسالت کا جزء نہیں ہوتے بلکہ وہ رسالت کی حقیقت سے خارج چیز ہیں۔ رسول اس دعویٰ کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اس کو خدا کی ذات وصفات اور اس کی مرضی کا تفصیلی علم ہے۔ اگر رسول سے کسی معجزہ کا صدور ہوتا ہے تو یہ اس دعویٰ کی اصل حقیقت میں شامل نہ ہوگا بلکہ اس کی صداقت کا ایک خارجی ثبوت ہوگا۔ رسول کی صداقت کو براہ راست جانچنے اور اس کی اصلیت کو سمجھنے کے دو ذرائع ہیں۔ رسول کی تعلیمات اور رسول کی سیرت۔

رسول کی تعلیمات

خدا کے رسول کی پہچان یہ ہے کہ وہ انسانوں کو خدا کا صحیح اور تفصیلی علم عطا کرتا ہے۔ خدا کا اپنے بندوں سے کیا رشتہ ہے اور وہ ان سے کیا چاہتا ہے؟ اس کی رضا و غضب کے کیا اصول ہیں؟ موت و حیات کا سلسلہ کیوں قائم ہے؟ اس کی قدرت کے کیا معنی ہیں؟ کیا اس کی صفات انسانوں کی صفات سے مشابہ ہیں یا ان سے مختلف؟ اگر وہ اپنی صفات میں انسانوں سے مشابہ ہے تو انسانوں میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ اگر وہ اپنی صفات میں انسانوں سے مختلف ہے تو اس کے علم و حکمت اور قدرت و اقتدار کے کیا معنی ہیں؟ خدا جس شخص کو اپنا رسول منتخب کرتا ہے اس پر یہ تمام حقیقتیں کھول دیتا ہے اور یہ حقیقتیں جس حد تک انسانی عقل کی گرفت میں آسکتی ہیں رسول ان کو پوری وضاحت اور تعین کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ جو شخص خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرے اور اس کو خدا کے بارے میں تفصیلی علم نہ ہو تو ہم سمجھیں گے کہ وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

رسول خدا کا جو تعارف کرا رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ خدا کی ذات وصفات کی جو تفصیلات آپ اس کی زبان سے سن رہے ہیں وہ مطابق حقیقت ہیں یا نہیں؟ اس کا جواب کسی علمی تصنیف میں تلاش کرنے یا کسی فلسفی سے دریافت کرنے سے پہلے اپنی عقل اور فطرت سے معلوم کیجیے۔ وہی اس معاملہ میں آپ کی پہلی راہنما ہے۔ کیونکہ خدا کا رسول، خدا کا جو تعارف کراتا ہے اس کی بنیاد آپ کی فطرت میں ہوتی ہے۔ وہ خدا کا کوئی ایسا تصور کبھی نہیں دیتا جس سے آپ کی فطرت نا آشنا ہو۔ خدا کے یقین کی جو بنیاد انسان کے اندر پہلے سے موجود ہے، خدا کا رسول اس کو ڈھاتا نہیں بلکہ اور مستحکم کرتا ہے۔ وہ شخص ہرگز خدا کا رسول نہیں ہے جو یقین کی اس چمک کو بجھا دے، جو انسان کے باطن میں پائی جاتی ہے۔ خدا کے رسول کی پہلی علامت یہ ہے کہ اگر کسی کے ضمیر میں ایمان و یقین کا ایک ذرہ بھی ہے تو اسے بڑھا کر آفتاب و ماہتاب بنا دے۔ اور جو قدم ابتدائے منزل میں ہے اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ اس بات کو کسی قدر وضاحت سے میں یہاں پیش کروں گا۔

انسان کو خدا کے وجود پر یقین اس لیے نہیں ہوتا کہ رسول اس کے وجود کا دعویٰ کر رہا ہے، بلکہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ کائنات اس کی محتاج ہے۔ جب وہ سوچتا ہے کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی اور کیسے کام کر رہی ہے تو اس کا سینہ اس یقین سے معمور ہو جاتا ہے کہ خدا کے بغیر نہ تو اس کائنات کا

وجود میں آنا ممکن ہے اور نہ وہ خدا کے بغیر ایک لمحہ اپنا کام کرسکتی ہے۔ لیکن یہ یقین مجمل ہوتا ہے، خدا کا رسول اسے تفصیل عطا کرتا ہے۔ اس میں بہت سے پہلو مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں، خدا کا رسول ان کو کھول کر بیان کرتا ہے، اس میں بہت سے تضاد اور تناقض ہوتے ہیں، خدا کا رسول ان کو رفع کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی کسی فکری خامی کی وجہ سے صحیح نہج پر کائنات کا مطالعہ نہ کرسکے اور خدا کے بارے میں غلط تصور کا شکار ہو جائے یا اس کا انکار ہی کر بیٹھے، اس وقت خدا کے رسول کا کام یہ ہے کہ وہ اس کے ذہن و فکر کی اصلاح کرے تاکہ وہ صحیح ڈھنگ سے سوچ سکے اور صحیح نتیجہ تک پہونچنا اس کے لیے آسان ہو جائے۔

اس طرح انسان اپنے غور و فکر کے ذریعہ پہلے خدا کے وجود پر یقین حاصل کرتا ہے اس کے بعد اس کو رسول پر ایمان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جس شخص کا غور و فکر اسے خدا تک نہ پہنچائے وہ خدا کے رسول پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام انسانوں کی ذہنی سطح ایک نہیں ہوتی۔ کوئی شخص منطقی ترتیب کے ساتھ خدا کے بارے میں سوچ سکتا ہے اور کسی کے لیے خدا کا بالکل سادا سا تصور ہی ممکن ہے۔ بہر حال انسان جس نوعیت کی بھی صلاحیت رکھتا ہو، رسالت پر ایمان کے لیے ضروری ہے کہ کسی بھی پہلو سے اس کے اندر کم سے کم خدا کا ابتدائی یقین پیدا ہو جائے۔ یہی ابتدائی یقین وہ کسوٹی ہے جس پر انسان رسول کی صداقت کو پرکھتا ہے۔ خدا کی ذات و صفات کی وہ ہزار تفصیلات پیش کرے، انسان اپنے اس یقین کی روشنی میں سمجھ سکتا ہے کہ کیا یہ وہی خدا ہے، جس کی ضرورت اس کے ذہن نے اس کائنات کے لیے محسوس کی تھی یا وہ کوئی ایسا خدا ہے کہ جس کی یہ کائنات محتاج نہیں ہے۔ انسان خدا کے رسول کو رسول اسی وقت مان سکتا ہے جب کہ خدا کے بارے میں اس کی تعلیمات ان تصورات سے ہم آہنگ ہوں جو اس کو اپنی فطرت سے ملے ہیں۔ اگر خدا کا رسول خدا کا کوئی ایسا تصور پیش کرتا ہے جس سے اس کی فطرت مانوس نہیں ہے تو وہ اس کو رد کر دے گا کہ یہ وہ خدا نہیں ہے جو میرا مطلوب ہے اور جس کی مجھے تلاش ہے۔

ہماری اس بحث سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان کے ذہن میں خدا کا جو اجمالی تصور ہوتا ہے، رسول صرف اس کی تفصیل کرتا ہے۔ اس کے پاس فی نفسہٖ خدا کے وجود پر دلائل نہیں ہوتے یا وہ ان کو پیش نہیں کرتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا کے رسول کے پاس خدا کے وجود پر قوی ترین دلائل ہوتے ہیں جو شخص خدا کا منکر ہوتا ہے رسول ان دلائل کو اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان دلائل سے جب وہ مطمئن ہو جاتا ہے اور خدا کا

ایک حقیقت کے طور پر ماننے لگتا ہے تو اس کے بعد رسول کے دعویٰ رسالت پر غور کرتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ جن وجوہ و اسباب کی بنا پر وہ خدا کو مان رہا ہے، رسول کی تعلیمات اس سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں؟ اگر رسول کی تعلیمات اس سے ٹکرا رہی ہوں تو کبھی وہ اس کو رسول تسلیم نہیں کر سکتا۔

مثلاً جو شخص خدا پر یقین رکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ کائنات نہ تو آپ سے آپ وجود میں آئی اور نہ آپ سے آپ چل رہی ہے، بلکہ اس کا ایک پیدا کرنے والا ہے اور وہی اس کو چلا رہا ہے۔ فرض کیجیے اگر رسالت کا دعویٰ کرنے والا شخص خدا کی ذات کا اس طرح تعارف کراتا ہے کہ اس سے کائنات کے لیے خدا کا وجود ضروری نہ قرار پائے تو انسان اپنے اس یقین کی بنیاد پر مدعی رسالت کی تعلیم کو باطل اور خلاف واقعہ سمجھے گا۔ اس کائنات میں اصول و ضابطہ کی فرماں روائی دیکھ کر انسان یہ تصور اخذ کرتا ہے کہ خدا اپنے تمام کاموں میں با اصول ہے، اور بے ضابطگی اس کی شان کے خلاف ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کو بے اصول ثابت کر کے اس کے یقین کو رد کرنا چاہے تو وہ اس کو جھوٹا اور افترا پرداز قرار دے گا۔ اسی طرح انسان خدا کو ہر پہلو سے مستغنی اور اپنے ارادہ و عمل میں آزاد تصور کرنے پر مجبور ہے، اس لیے وہ کبھی اس شخص کو خدا کا رسول نہیں مانے گا جو خدا کو محتاج اور اپنے فیصلوں میں کسی دوسرے کا پابند بتائے۔

رسول کی تعلیمات پر غور و فکر کی ایک اور بنیاد ہے جسے ہم رسولوں کی شہادت کہہ سکتے ہیں۔ مذہب کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی کہ خدا کے رسول نے کسی متعین شخص کا نام لے کر یا اس کی صفات، زمانہ اور مقام کی صراحت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ خدا کا رسول ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں اس شخص کے رسول ہونے میں ان لوگوں کو کوئی شبہ نہیں ہو سکتا جو گواہی دینے والے کو خدا کا رسول مانتے ہیں۔ وہ جو بات بھی خدا کا نام لے کر پیش کرے گا اس کو وہ خدا ہی کی طرف سے سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

شہادت کی ایک دوسری قسم بھی ہے اور وہ ہے رسولوں کی تعلیمات کی شہادت۔ جس فرد یا افراد کو ہم خدا کا رسول مانتے ہیں وہ اگر کسی شخص کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں تو اس گواہی کا تعلق خاص اسی شخص سے ہوگا جس کے بارے میں گواہی دی جا رہی ہے۔ ہم اس کو پھیلا نہیں سکتے۔ لیکن رسولوں کی تعلیمات کے ذریعہ ہم ہر مدعی رسالت کے رسول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جو شخص رسالت کا دعویٰ کر رہا ہے اگر اس کی تعلیمات دوسرے رسولوں کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں تو یہ اس کے رسول ہونے کا ایک قوی ترین ثبوت ہوگا۔ رسالت کا دعویٰ کوئی نیا دعویٰ نہیں ہے۔ انسانیت اس دعویٰ سے مانوس ہے۔

یہ دعویٰ ماضی کے مختلف ادوار میں بلند ہوتا رہا ہے۔ بلکہ مذہبی کتابوں کا تو بیان ہے کہ اس زمین پر پہلا شخص جو آیا وہ خدا کا رسول تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ اس سے وجود میں آنے والی نسل اس کو خدا کے رسول ہی کی حیثیت سے جانتی اور مانتی رہی ہوگی اس کو کبھی یہ شبہ نہیں ہوا ہوگا کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔ اس کے بعد جس شخص نے بھی اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہوگا انسانوں نے اس پہلے رسول کی تعلیمات کی روشنی میں اس کی صداقت کو جانچا ہوگا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا رسولوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اور انسان بہتر طریقہ پر سمجھنے لگا کہ خدا کے رسول کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں؟ اور وہ کیا پیغام دیتا ہے؟

یہ ایک فطری بات ہے کہ جس شخص کے حالات، نظریات اور مزاج سے آپ واقف ہوں اگر ان کے خلاف کوئی اطلاع آپ کو پہنچے تو آپ بآسانی اس پر یقین نہیں کرتے بلکہ اطلاع دینے والے کی صداقت کے بارے میں شبہ کرنے لگتے ہیں۔ تاریخ کی ان ہی روایات کو مستند سمجھا جاتا ہے جو تواتر کے ساتھ منقول ہیں، شاذ روایات کو جو ان کے خلاف پڑتی ہیں رد کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح خدا کے رسولوں نے خدا کا ایک تصور پیش کیا ہے۔ گو اس تصور میں بہت سے اختلافات پیدا ہو چکے ہیں۔ لیکن ان اختلافات کو ہٹانے کے بعد بعض باتوں پر سب لوگ متفق ہیں۔ دنیا اصولی طور پر جانتی ہے کہ اخلاق و سیرت اور تہذیب و تمدن کے بارے میں رسولوں کی کیا تعلیمات ہیں؟ ان کے نزدیک انسان خدا کی رحمت کا کب مستحق ہوتا ہے اور کب اس پر خدا کا غصہ نازل ہوتا ہے؟ کونسے اعمال خدا کے پسندیدہ ہیں اور کونسے ناپسندیدہ؟ اس کے ہاں عدل ہے یا وہ ظلم بھی کرتا ہے؟ جو شخص خدا کا رسول ہے وہ کبھی ان تعلیمات کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ دس آدمی جس حقیقت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اگر گیارھویں آدمی نے بھی اس حقیقت کو دیکھا ہے تو اس کو حقیقت کے بیان میں ان دس آدمیوں سے اتفاق کرنا چاہیے۔ اگر وہ اپنے بیان میں ان سے اختلاف کرتا ہے تو سمجھا جائے گا کہ حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ رسولوں کے ذریعہ جو تعلیمات ملی ہیں ان کی روشنی میں انسان خدائی تعلیمات اور غیر خدائی تعلیمات کے درمیان آسانی سے فرق کر سکتا ہے اور یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ رسالت کا دعویٰ کرنے والوں میں کون واقعتاً خدا کا رسول ہے اور کون خدا پر افترا پردازی کر رہا ہے۔

رسول کی سیرت

طبعیات کی دنیا میں جو دعویٰ کیا جائے، براہ راست تحقیق کے ذریعہ اس کی صداقت معلوم

کی جا سکتی ہے۔ لیکن جس دعویٰ کا تعلق طبعیات سے باہر کی دنیا سے ہو اس پر یقین کا حقیقی ذریعہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ہم دعویٰ کرنے والے کے بیانات پر اعتماد کریں۔ اس کو سچا اور راست باز مان لیں۔ رسول ہمارے سامنے جن حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے ہم براہِ راست تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ ان کی تردید یا تصدیق کی پوزیشن میں نہیں ہوتے، کیونکہ وہ ہمارے لیے خالص استدلالی حقیقتیں ہیں۔ ان کی تفصیلی کیفیت ہم صرف رسول کی زبان سے معلوم کرسکتے ہیں اور رسول کے رسول ہونے کا ایک بہت بڑا اور اہم ثبوت خود اس کی سیرت ہے۔ اس کی کتابِ زندگی کھولیے اور دیکھ لیجیے کہ وہ رسول ہے یا نہیں؟ انسان کے عمل کا رشتہ اس کے ماضی سے بندھا ہوتا ہے۔ اس کی پچھلی زندگی، اس کی موجودہ زندگی کی ترجمان ہوتی ہے۔ جس شخص کے ماضی کا آپ نے گہرا مطالعہ کیا ہے اس کے حال اور مستقبل کے بارے میں آپ صحیح رائے دے سکتے ہیں۔ انسان جس منزل کی طرف سو قدم بڑھ چکا ہے لازمًا اس کا اگلا قدم بھی اسی منزل کی طرف اٹھے گا۔ بعض اوقات انسانوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ اپنے ماضی سے بغاوت ہے۔ حالانکہ ان تبدیلیوں کے اسباب ان کی پچھلی زندگی میں بہت دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔

خدائے تعالیٰ جس شخص کو اپنے رسول کی حیثیت سے انسانوں کے درمیان کھڑا کرتا ہے وہ سیرت و کردار کی سب سے اونچی سطح پر ہوتا ہے۔ خدا کا رسول جن لوگوں سے خطاب کرتا ہے وہ اس کی سچائی، امانت، دیانت اور عہد کی پابندی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں۔ ان میں سے جس شخص کو جس پہلو سے اس کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے وہ اس کی سیرت کو بے داغ اور بے عیب دیکھتا ہے۔ وہ اگر اس کے ساتھ کبھی تجارت کرتے ہیں، یا اس سے لین دین کا انہیں اتفاق ہوتا ہے تو ہر حال میں اس کو امین اور دیانتدار پاتے ہیں۔ وہ ان کو معاملہ کا پکا، بات کا سچا اور عہد کا پابند نظر آتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خدا کے رسول، منصبِ رسالت کے ملنے سے پہلے بھی نیکی اور شرافت کے روشن چراغ ہوتے ہیں۔ بداخلاقی، بدعہدی، ظلم، جھوٹ اور مکر و فریب کی تاریکی میں دنیا ان سے راہنمائی حاصل کرتی ہے۔ اخلاقی زوال اور پستی سے انسان انسانیت ہی سے مایوس ہونے لگتا ہے تو ان کو دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھتی ہے۔ انسان جب کسی امین اور دیانت دار شخص کا تصور کرتا ہے تو اس کے ذہن کے سامنے ان ہی کی تصویر آتی ہے۔ اس کو کسی پابندِ عہد اور بات کے سچے انسان کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ بے اختیار ان ہی کی طرف دوڑتا ہے۔ وہ جب مخلص اور خیر خواہ انسان کا خیال کرتا ہے تو اس کو وہی افراد

یاد آتے ہیں، جو بعد میں خدا کا پیغام اس کو سنانے والے ہوتے ہیں۔

ایسے بلند سیرت افراد میں سے جب کوئی فرد اپنی قوم کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے تو ان میں جو خود غرض اور ہٹ دھرم نہیں ہوتے وہ اس اعلان کی تردید کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے۔ جس شخص کی زبان جھوٹ سے کبھی آلودہ نہ ہوئی ہو، وہ جرأت نہیں کر سکتے کہ اس کو جھوٹا قرار دیں۔ وہ سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ جس شخص کو انہوں نے سالہا سال تک انسانوں کا خیر خواہ اور مخلص پایا ہو اس کو دعوی رسالت کی وجہ سے کیونکر انسانیت کا دشمن کہا جائے؟ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کل تک جس شخص سے کسی ایک فرد نے دھوکا نہ کھایا ہو آج وہ پوری قوم کو دھوکا دے سکتا ہے؟ ان کی عقل یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی کہ جس نے کبھی کسی انسان کو صدمہ نہ پہنچایا ہو اب وہ پوری انسانیت کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

رسول کے دعوی رسالت کا عموماً وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو حق کو کسی دوسرے کی زبان سے سننا نہیں چاہتے۔ جو آسانی سے اپنے باطن کے احساسات کو دبا تو سکتے ہیں، لیکن کسی کی قیادت اور راہنمائی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ جن کو اپنے ضمیر کی آواز کو جھٹلانے اور خدا کی رحمتوں سے دور ہونے کا افسوس نہیں ہوتا، البتہ اپنے مفادات اور اقتدار و حکومت کے چھوٹ جانے کا غم گھلاتا رہتا ہے۔

رسول کی سنجیدگی

انسان کی سیرت کے چند خاص پہلو ہیں جو اس کی بات میں وزن پیدا کرتے ہیں اور اس کو غور و فکر کے قابل بناتے ہیں ان میں سب سے نمایاں حیثیت اس کی سنجیدگی کو حاصل ہے۔ انسان کی سنجیدگی عموماً اس کی صداقت کی ایک زبردست دلیل بن جاتی ہے اور سننے والا مزید کسی دلیل کا مطالبہ کیے بغیر اس پر یقین کرنے لگتا ہے۔ انسان اگر اپنی بات میں سنجیدہ نہیں ہے تو خواہ وہ علم و فضل کے کتنے ہی بلند مقام سے کیوں نہ بول رہا ہو کوئی شخص اس کو قابل التفات نہیں سمجھتا۔ بسا اوقات مخاطب بڑی سے بڑی حقیقت کو جھٹلا دیتا ہے اگر اس کو سنجیدگی کے ساتھ اس کے سامنے نہ لایا جائے اور کبھی کسی مہمل بات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جبکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ وہ سنجیدگی کی حامل ہے۔ سنجیدہ دعویٰ آپ اپنی عظمت کا ثبوت ہے۔ انسان کی سنجیدگی اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا ہے بلکہ وہ ان کو ایک حقیقی واقعہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ دنیا اس کی باتوں کو ہنسی کھیل نہیں سمجھتی بلکہ اہمیت کی نظر سے دیکھتی ہے۔

کوئی شخص اپنے دعوٰی میں سنجیدہ ہے یا نہیں؟ اس کو ناپنے کا کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے سنجیدگی و عدم سنجیدگی کا فیصلہ دو اور دو چار کی طرح ریاضی کے کسی فارمولے کی بنیاد پر ہم نہیں کر سکتے۔ بلکہ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جسے دعوٰی کرنے والا اور جس کے سامنے دعوٰی کیا جاتا ہے دونوں پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔ جب کوئی فکر انتہائی شدت اور اہمیت کے ساتھ کسی کے دل میں اتر جاتی ہے تو اس کا پورا وجود اس میں ڈھل جاتا ہے اور جب وہ کسی کے سامنے اس کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ایک ایک لفظ اور اس کی ایک ایک حرکت و ادا سے اس فکر کی اہمیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ اگر کسی کے گھر آگ لگ جائے اور وہ لوگوں کو اس کی اطلاع دے تو اس کا پورا وجود اس واقعہ کا ترجمان بن جائے گا اور جو شخص بھی اسے سنے گا اس سے دلیل کا مطالبہ کیے بغیر اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے گا۔

خدا اور آخرت کا یقین اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جن لوگوں پر یہ حقیقت کھلتی ہے، ان کو دنیا کی ہر چیز ہیچ نظر آنے لگتی ہے اور یہی ایک حقیقت ان پر چھا جاتی ہے۔ وہ اس کی عظمت و ہیبت سے کانپتے رہتے ہیں اور اس حقیقت کا اظہار انسانوں کے سامنے اس طرح کرتے ہیں گویا غور و فکر کے قابل یہی ایک حقیقت ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ انسان چھوٹے چھوٹے واقعات میں کھو چکا ہے اور اس کی نگاہ سے یہ عظیم حقیقت چھپی ہوئی ہے تو وہ انتہائی دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ اس کو اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اس غم میں گھلتے رہتے ہیں کہ انسان خدا سے غافل ہے۔ وہ اس کو ہر طرف سے پھیر کر خدا کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جن افراد تک پہنچ سکتے ہیں ان تک پہنچتے ہیں اور ان کو ان کی عاقبت سے باخبر کرتے ہیں۔ وہ ہر کھلے مجمع میں جاتے ہیں اور ہر انفرادی صحبت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ بے قرار ہوتے ہیں کہ خدا کا کوئی بندہ خدا کے عذاب کی زد میں نہ آجائے۔ ان کو سب سے بڑی فکر یہ ہوتی ہے کہ ان کا پیغام لوگوں کے دلوں میں اتر جائے۔ ان کے کسی مخاطب کا سینہ ان کی دعوت سے خالی نہ رہے۔

خدا کے رسول پوری دردمندی اور اخلاص کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اپنی دعوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ اس راہ میں ہر طرح کے مصائب اور مشکلیں آتی ہیں لیکن ان کی پیشانی پر بل نہیں پڑتے وہ دشواریوں سے گھبرا کر اپنی دعوت سے باز نہیں آتے بلکہ اس کو اور شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں دعوت کا انکار ان کے نزدیک اس کی اہمیت کو بڑھا دیتا ہے اور وہ اپنی قوت کا ایک ایک شمّہ اس کی وضاحت

میں لگادیتے ہیں۔ ان کی یہ تڑپ اور بے چینی صاف بتاتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے کوئی بہت بڑا خطرہ دیکھ رہے ہیں، جس سے وہ ہراس شخص کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں جس تک ان کی آواز پہنچے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی شخص اس خطرہ سے ناواقف نہ رہے۔

خدا کے رسول جن قوموں سے خطاب کرتے ہیں ان کے سنجیدہ اور باہوش افراد رسولوں کی اس روش کو دیکھ کر یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان پر کسی عظیم ترین حقیقت کا انکشاف ہوا ہے۔ وہ کچھ ایسے واقعات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اس یقین کی وجہ سے ان کو اپنے موجودہ موقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جب وہ اپنے موقف کے حق میں مضبوط دلائل نہیں پاتے ہیں تو آگے بڑھ کر رسول کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

پختہ یقین

رسول کی سیرت کا دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کو اپنی بات پر بے پناہ یقین ہوتا ہے۔ جو شخص بھی رسول سے قریب ہوتا ہے وہ اس یقین کی گرمی محسوس کرتا ہے۔ اس کا سینہ جس ایمانی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے، وہ بات بات میں جھلکتی رہتی ہے۔ زندگی کے کسی مرحلہ اور کسی حال میں آپ اس کو اس کیفیت سے خالی نہیں دیکھیں گے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا واقعہ اور سانحہ رسول کے اس یقین کو کبھی متزلزل نہیں کرتا کہ وہ خدا کا نمایندہ ہے اور اسے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔ بلکہ ہر سنگین واقعہ سے اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر سخت سانحہ سے اس کے یقین کو تقویت ملتی ہے۔ خوشی اور غم کے مواقع پر انسان کا باطن کھل کر سامنے آجاتا ہے اور اس کے اندرونی احساسات ظاہر ہو جاتے ہیں۔ آدمی کے حقیقی جذبات اس وقت چھپے نہیں رہ سکتے۔ جب وہ اپنے بیوی بچوں اور بے تکلف صحبتوں میں لمحاتِ مسرت گزار رہا ہو۔ اسی طرح جس شخص کو اچانک سانپ ڈس لے یا اس کی جوان اولاد اس کے سامنے دم توڑ دے اس وقت اس کی زبان سے نکلنے والے کلمات اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہوتے ہیں کہ زندگی اور موت کے بارے میں اس کا حقیقی نقطۂ نظر کیا ہے؟ انسان اپنے نازک ترین لمحات میں کسی مفروضہ اور خیالی تصور کا کبھی سہارا نہیں لے سکتا۔ وہ ایسی ہی چیز پر اعتماد کر سکتا ہے جو حقیقت بن کر اس کے رگ و ریشہ میں اتر چکی ہو۔

خدا کے رسول خدا کی ذات پر اپنے جس اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، وہ اس بات کا زبردست ثبوت ہے کہ خدا سے ان کا بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ خدا کی یاد ان پر جس طرح تنہائی میں، مجلس میں،

بات چیت میں، اٹھنے بیٹھنے میں، خوشی اور غم میں چھائی رہتی ہے اسے دیکھنے والی آنکھیں، ان کے بارے میں کبھی تصنع اور ریاکاری کا شبہ نہیں کرسکتیں۔ خدا کے رسول اپنی شخصیت کو خدا کی مرضی میں گم کر دیتے ہیں اور تمام اختیارات سے دست کش ہوجاتے ہیں۔ ظاہر ہے جو شخص اپنے آپ کو اس طرح خدا کے حوالے کر چکا ہو، ناممکن ہے کہ خدا کے بارے میں اس کے احساسات جھوٹے ہوں اور وہ دنیا کو فریب دے رہا ہو۔

قول و عمل میں مطابقت

رسول انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خدا کی راہ میں لگا دیں۔ کیونکہ کل قیامت کے روز خدا کی رحمتیں اس شخص کے حصہ میں آنے والی ہیں جو اپنا سب کچھ خدا کے لیے لٹا دے، اور جو ایسا نہ کرسکے اس کو خدا کے عذاب سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔

رسول کی یہ دعوت اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت ہی غیر معمولی دعوت ہے۔ کیونکہ انسان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں اور جو وسائل و ذرائع اس کو میسر ہیں ان کی اس کے نزدیک بڑی قدر و قیمت ہے۔ وہ جو کچھ حاصل کرسکتا ہے اسی سرمایہ سے حاصل کرسکتا ہے۔ ان کو کھونا دنیا کی ہر نعمت سے اپنے آپ کو محروم کرلینا ہے۔ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے بعد انسان کا کسی مقصد کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ رسول کی اس دعوت کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کا اپنا کچھ نہیں رہا۔ اس کے سارے وسائل و ذرائع جن سے وہ اس دنیا کی کامیابی ڈھونڈھ سکتا تھا، خدا کے لیے وقف ہوگئے۔ اب وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتا۔ اس کی ہر خواہش خدا کے احکام کے تابع ہوگئی۔

انسان اتنا بڑا اقدام کرنے سے پہلے دیکھے گا اور ہزار بار دیکھے گا کہ جس شخص پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے خود اس کا طرز زندگی کیا ہے؟ کیا وہ محض ایک قول ہے یا اس کے دل سے نکلی ہوئی آواز؟ وہ اگر خلوص کے ساتھ اس کو حق سمجھتا ہے تو اس کی پوری زندگی اس کی گواہی دے گی۔ اس پر عمل میں ہزار دشواریاں اور زحمتیں ہوں لیکن اس کا قدم کبھی کسی دوسری راہ پر نہیں پڑ سکتا۔ ورنہ یہ اس کے قول کی آپ اپنی تردید ہوگی۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی بات کی سب سے بڑی تائید خود اس کی زندگی سے ہوتی ہے۔ وہ اپنی بات پر زمین و آسمان کی ہزار دلیلیں فراہم کرے، اگر اس کا عمل اس کی بات کے خلاف ہے تو وہ بے وزن ہو جائے گی انسان اپنی زبان سے جو لفظ نکالتا ہے اپنے ایک ایک عمل سے اس کے حق یا باطل ہونے کی شہادت فراہم کرتا ہے اور یہ شہادت بعض اوقات اتنی موثر بن جاتی

ہے کہ منطقی دلائل میں اتنی تاثیر محسوس نہیں کی جاتی۔ جب انسان پر کوئی فکر اس طرح چھا جاتی ہے کہ نہ تو طمع اور لالچ اس کو اس سے پھیرتے ہیں اور نہ وہ کسی مصیبت اور پریشانی سے گھبراتا ہے تو دنیا اس کی اہمیت تسلیم کرنے لگتی ہے اور یہ ماننے پر مجبور ہوتی ہے کہ یہ ایسا فکر ہے جس کے لیے قربانی دی جاتی ہے اور دی جاسکتی ہے۔

خدا کے رسولوں پر جس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، وہ اس کے بارے میں "اول المسلمین" ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ جس منزل کی طرف بلاتے ہیں خود اس کے سب سے پہلے مسافر ہوتے ہیں، وہ جس راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں، اس راہ کی گرد ان کے جسم پر موجود ہوتی ہے۔ وہ جب حق کی راہ میں مصیبتیں اور دشواریاں جھیلنے کی تلقین کرتے ہیں تو ان کے پاؤں کے آبلے شہادت دیتے ہیں کہ کس طرح حق کے لیے تکلیفیں جھیلی جاتی ہیں۔ وہ حق سے کنارے رہ کر اس کے فضائل و مناقب بیان نہیں کرتے، بلکہ ان کی زبان اس وقت کھلتی ہے جبکہ ان کی پوری زندگی پر حق کی حکومت قائم ہو جاتی ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی تعلیمات ایک ہی حقیقت کے ترجمان ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر دوسرے کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ان کے خیالات بتاتے ہیں کہ ان کی زندگی کیا ہے اور ان کی زندگی ظاہر کرتی ہے کہ وہ دوسروں سے کیا چاہتے ہیں۔ ان کی زبان سے ان کے نظریات کی قولی تشریح ہوتی ہے اور ان کی زندگی اس کی عملی تعبیر پیش کرتی ہے۔

رسولوں کی تاریخ کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ ان پر ان کے دشمنوں تک نے نفاق کا الزام نہیں لگایا، انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ خدا کے رسول جس بات کا دعویٰ کرتے ہیں، عمل سے اس کی تکذیب کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات جس طرف راہنمائی کرتی ہیں، ان کی سیرت اس کے خلاف لے جاتی ہے۔ قول و عمل کی یہ مطابقت اور ہم آہنگی آپ اور کہیں نہیں دیکھ سکتے۔

بے غرض دعوت

رسولوں کی سیرت کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنے کام میں بے غرض اور مخلص ہوتے ہیں۔ اس سے ان کے دعوؤں میں خاص وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں کسی بات میں ذاتی غرض شامل ہو جائے اس کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اگر آپ انسانیت کے مفاد ہی کی کوئی بات کہیں لیکن اس کے پیچھے کوئی ذاتی غرض کام کر رہی ہو تو آپ کے حق میں مخاطب کی نفسیات بدل جائیں گی۔ وہ بمشکل یقین کر سکتا ہے کہ جو شخص اپنا فائدہ چاہتا ہو وہ دوسروں کی فلاح کا داعی ہوگا۔

کسی دعویٰ کے پیچھے غلط مقاصد بھی ہو سکتے ہیں اور صحیح مقاصد بھی۔ دو آدمیوں کی زبان سے ایک ہی بات نکلتی ہے، لیکن اغراض مختلف ہوتے ہیں۔ ایک شخص قوم کی خدمت کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اپنی دنیا بنانے اور اپنی خستہ حالت کو ٹھیک کرنے لگتا ہے۔ دوسرا شخص یہی دعویٰ کرتا ہے اور اپنی آباد دنیا کو اُجاڑ کر قوم کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی شخص کی پیشانی پر پہلے سے لکھا ہوا نہیں ہوتا کہ کون اپنے دعویٰ میں مخلص ہے اور کون اس کو اپنی دنیا کمانے کا ذریعہ بنانے والا ہے۔ اس کا علم آپ کو ان کی سیرت سے ہوگا۔ ان کی کل تک کی مصروفیت اور جد و جہد کو دیکھ کر آپ فیصلہ کر سکیں گے کہ آئندہ ان کی زندگی کا رُخ کیا ہوگا۔ جو شخص اپنی پچھلی زندگی میں مفادِ انسانیت کا دشمن رہا ہو اس کے کسی بھی دعویٰ کے بارے میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہوگا کہ یہ دامِ مکر و تزویر ہے۔ اس شخص کا مخلص ہونا فطری طور پر دلیل کا محتاج ہے، جس کے خود غرض اور غیر مخلص ہونے کا ثبوت ماضی میں موجود ہے۔ جو ہاتھ کل تک تخریب میں مصروف رہا ہو، انسان کے لیے ناممکن ہے کہ بغیر کسی دلیل کے آج اس کو تعمیر کرنے والا سمجھ بیٹھے۔ لیکن جس شخص کے بارے میں آپ کا تجربہ اس کے برعکس ہو، جس کو آپ ایک بے غرض اور سچے انسان کی حیثیت سے جانتے ہوں، انسانوں کے ساتھ جس کی ہمدردی اور خیر خواہی ہر شبہ سے بالاتر ہو، اور کسی بھی معاملہ میں اس پر کوئی اخلاقی گرفت نہ کی جا سکی ہو، اس کو جھوٹا کہنا صداقت اور شرافت کی موت ہے، خواہ وہ کتنا ہی اونچا سے اونچا دعویٰ کیوں نہ کر رہا ہو اور اس کی بات ہماری سمجھ میں آ رہی ہو یا نہ آ رہی ہو۔ اگر ایسے انسان بھی اخلاقی گراوٹ میں مبتلا ہو سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اخلاق کی بلندی، سیرت کی مضبوطی، کردار کی پختگی دنیا سے اٹھ گئی۔ اب کسی کو نہ تو یہ حق پہنچتا ہے کہ کسی معاملہ میں اپنی صداقت کا دعویٰ کرے اور نہ اس کو سچا ماننا کسی کے لیے جائز ہے۔ خدا کے رسول رسالت کا دعویٰ اتنے بلند مقام سے کرتے ہیں کہ دشمنوں تک کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دنیا بنانے کے لیے اُٹھے ہیں اور اپنے اس پیغام کے ذریعہ کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس طرح خدا کے رسول اپنی پختہ سیرت اور مضبوط دلائل کے ذریعہ انسانوں پر خدا کی طرف سے حجت قائم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد جو شخص ان پر ایمان لے آتا ہے وہ خدا کی نعمتوں کا مستحق ہوتا ہے اور جو شخص ان کا انکار کرتا ہے وہ خدا کے دربار سے دور کر دیا جاتا ہے۔

فصل چہارم

آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اگر آپ انسانی تاریخ کا اس کی ابتدا سے انتہا تک مطالعہ کریں تو آپ کو سب سے بڑی اور صاحبِ عظمت شخصیت جو ملے گی وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہوگی۔ آپ انسان تھے، لیکن اتنے عظیم انسان کہ آج تک کسی دوسرے انسان کو اتنی بڑی عظمت نصیب نہیں ہوئی۔ دنیا کے تمام بڑے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا کیا جائے تو آپ کا مقام سب سے نمایاں اور سب سے اونچا ہوگا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے عظمت و بلندی آپ کی ذات پر ختم ہوگئی اور ہر بڑا آدمی آپ کے مقابلے میں اپنی بڑائی سے دست بردار ہوگیا۔

ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں آپ نے دعویٰ کیا کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور سارے عالم کی نجات آپ کی اتباع میں ہے۔ یہ بہت بڑا دعویٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تنہا آپ کو دنیا کا قائد اور راہنما مانا جائے اور ہر معاملے میں صرف آپ کی پیروی کی جائے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اتنے بڑے دعوے کو انسانوں نے قبول کیا، اور اس طرح قبول کیا کہ وہ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا اور ان کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگا۔ آپ نے دنیا کو اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ خدا کی بندگی کا پیغام دیا کہ بہت ہی مختصر مدت میں ایسے افراد تیار ہوگئے جو اس پیغام کی عملی تصویر تھے، وہ آپ کی اتباع میں اس طرح گم ہوئے کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اپنی آزادی سے دست بردار ہوگئے۔ وہ خدا کے وفادار بندے تھے اور خدا کو اسی ڈھنگ سے یاد کرتے تھے جس ڈھنگ سے خدا کو یاد کرنے کا آپ نے حکم دیا تھا ان کی سیاست و عدالت بالکل ان اصولوں پر قائم تھی جو آپ نے بتائے تھے۔ وہ دوسروں کے ساتھ معاملہ ٹھیک ان بنیادوں پر کرتے تھے جن کی آپ نے تعلیم دی تھی۔ ان کی صبح و شام، ان کی موت و حیات اور ان کی خوشی اور غم آپ کی

ہدایات کے تابع تھے۔ آپ کی زبان سے جو کلمات نکلتے ان کے لیے سند بن جاتے اور آپ کے عمل سے جو بات ظاہر ہوتی وہ اُن کے لیے اسوہ قرار پاتی۔

آپ کا پیغام انقلابی پیغام تھا۔ یہ ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت تھی۔ یہ دعوت جس وقت حجاز کی سرزمین سے بلند ہوئی تو سارے ملک میں ہنگامہ مچ گیا اور ہر طرف سے اس کی مخالفت ہونے لگی۔ لیکن یہ ایک سچی دعوت تھی اور سچائی میں اتنا وزن ہوتا ہے کہ زیادہ عرصے تک اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مخالفت کا زور ٹوٹتا چلا گیا اور ایک وقت آیا کہ اس کے ماننے والے اس کے مخالفین پر غالب آگئے

یہ ایک حیرت انگیز انقلاب تھا جو خدا کی زمین پر رونما ہوا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس دعوت کی گرفت اس کے ماننے والوں پر کمزور ہونے لگی اور ساتھ ہی ان کی سیاسی قوت بھی زوال پذیر ہونی شروع ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود آج بھی بے شمار انسان اس دعوت کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ یہ دعوت ان کی زندگیوں میں اس طرح اتر چکی ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے اس سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اپنی جان ہلکی ہے اور یہ دعوت زیادہ قیمتی ہے۔ وہ اسے اپنا عزیز ترین سرمایہ سمجھتے ہیں اور اس پر دل و جان سے قربان ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ اس دعوت سے جو دنیا آباد ہوئی تھی وہ ویران نظر آتی ہے، لیکن اس ویرانے میں جگہ جگہ چراغ جل رہے ہیں اور یہ احساس زندہ ہے کہ چراغ کی لو کمزور ہے اور اسے تیز کرنا ہے۔ اس احساس کے ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ان ہی کھنڈروں سے پھر کوئی نیا محل نہیں اُبھرے گا۔ آگ بجھ چکی ہے لیکن چنگاریاں باقی ہیں جو کسی بھی وقت دہکتے ہوئے انگاروں میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت آج بھی ایک زندہ دعوت ہے۔ زمانے کی رفتار نے اسے ختم نہیں کیا ہے اور وہ کسی بھی وقت پھر اُبھر کر ہر طرف چھا سکتی ہے۔

جو دعوت اپنے اندر اتنی زبردست طاقت رکھتی ہو اور جسے ڈیڑھ ہزار سال سے بے شمار انسان پورے شرحِ صدر کے ساتھ اپنائے ہوئے ہوں، اسے وہی شخص نظر انداز کر سکتا ہے جس کی فکری قوتیں مفلوج ہو چکی ہوں یا جو چھوٹے چھوٹے واقعات میں الجھا ہوا ہو اور بڑے اور اہم واقعات سے بے خبر اور غافل ہو۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ کسی دعوے کی قدامت اسے حق نہیں ثابت کر دیتی اور نہ انسانوں کی بڑی تعداد کا

کسی بات کو مان لینا اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ بہت سی باتیں خاص طور پر مذہب کی دنیا میں حقیقت سمجھی جاتی تھیں، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ غلط اور بے بنیاد ہیں۔

بے شک آپ کا یہ خیال ایک خاص دائرے میں بالکل درست ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی دعوے کو ہوشمند انسانوں کا بڑی تعداد میں قبول کرنا اس کے وزن کو بڑھا دیتا ہے اس میں شک نہیں کہ آپ کو ان کے فکر پر تنقید کا حق ہے اور بخوشی آپ اسے غلط قرار دے سکتے ہیں۔ لیکن یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے آپ کو سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور ایک خاص مدت اس پر غور و فکر میں صرف کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ہی آپ یہ فیصلہ کرنے کے اخلاقاً مجاز ہوں گے کہ ان سوجھ بوجھ رکھنے والے انسانوں کا اقدام صحیح ہے یا غلط؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کرنے والوں میں جاہل اور کم علم انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ ایسے اصحاب علم بھی ہیں جو اپنے علم و فن میں تجدید و امامت کا مقام رکھتے ہیں اور جن کی عظمت سے ان کا کوئی مخالف بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اس میں عوام ہی نہیں ہیں بلکہ بڑی بڑی سلطنتوں کے حاکم اور فرمانروا بھی ہیں۔ اس میں ناتجربہ کار نوجوان ہی نہیں ہیں بلکہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ اصحاب بھی ہیں۔ اس میں جوش اور جذبات رکھنے والے اشخاص ہی نہیں ہیں بلکہ خاموش طبع اور سنجیدہ انسان بھی ہیں۔ اس میں معاشرے کی نچلی سطح کے افراد ہی نہیں ہیں بلکہ ایسے افراد بھی ہیں جو سوسائٹی میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ غرض یہ کہ انسانوں کے مختلف طبقات نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اپنے معیار سے جانچا ہے اور اسے اپنے ذہن سے قریب تر اور اپنے علم و تحقیق کے مطابق پایا ہے۔

آپ کی دعوت کے ماننے والے کسی خاص دور اور کسی خاص قوم سے متعلق نہیں ہیں بلکہ چودہ سو سال سے ہر دور اور ہر قوم کے انسانوں نے اسے قبول کیا ہے اور اب بھی قبول کر رہے ہیں۔ اس طرح اس دعوت کی قدامت بھی اس کے معقول ہونے کی ایک زبردست دلیل بن جاتی ہے۔ پھر آپ ان بے شمار انسانوں کو دیکھیے جنہوں نے اپنا خون پسینہ بہا کر بڑے سے بڑا سرمایہ جمع کیا اور اسے بغیر کسی تامل کے اس دعوت کے لیے وقف کر دیا، ان لاکھوں افراد کا تصور کیجیے جو اس کی تبلیغ و اشاعت اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے اپنی زندگی کے بہترین لمحات اور سب سے زیادہ کارآمد اوقات صرف کیے، اور ان عظیم انسانوں کا خیال کیجیے جو اس کے لیے اپنی نقد جان تک نذر کر چکے۔ یہ سلسلہ اس وقت سے آج تک جاری ہے جب سے یہ شروع ہوا اور امید ہے آئندہ بھی جاری رہے گا۔ یہ تمام قربانیاں شہادت دے رہی ہیں کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت برحق ہے اور جن لوگوں نے یہ قربانیاں دی ہیں وہ بآوازِ بلند اعلان کر رہے ہیں کہ انسان کی جان و مال اور اس کا جینا اور مرنا اسی کے لیے ہونا چاہیے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اہمیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ دعوت صرف ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے دل سے قبول کر چکے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے لیے بھی ہے جو اس کے منکر ہیں اور جنھوں نے اسے ابھی تک قبول نہیں کیا ہے۔ یہ دعوت ہر ایک فرد کے سامنے اس کا ذاتی مسئلہ بن کر آتی ہے اور اس سے براہ راست مطالبہ کرتی ہے کہ اسے قبول کرے۔ کیونکہ اس کی نجات اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر وہ اسے قبول کرتا ہے تو کامیاب ہے ورنہ اسے ناکامی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی آواز نہیں ہے جس سے آپ کان بند کر لیں بلکہ یہ ایسی پکار ہے جو آپ کو ایک ہولناک مستقبل سے آگاہ کرتی ہے۔ یقیناً آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ اس کا کوئی جواب نہ دیں اور اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہیں لیکن اس کے لیے آپ کے پاس بہت ہی معقول وجوہ ہونے چاہئیں۔ اگر بغیر دلیل کے آپ اس دعوت کا انکار کرتے ہیں تو آپ کو اس زبردست خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس سے یہ دعوت آگاہ کر رہی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے تین ایسی واضح حقیقتیں رکھنا چاہتا ہوں جن سے پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول ہیں۔

۱۔ معجزات

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کی تصدیق ان بہت سے غیر معمولی واقعات سے ہوتی ہے جنھیں مذہبی اصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے، یہ دراصل رسالت کی محسوس نشانیاں ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے شمار معجزات ظاہر ہوئے ہیں میں یہاں صرف تین معجزات کا ذکر کروں گا۔

۱۔ مکہ والوں نے آپ سے دلیل نبوت کا مطالبہ کیا تو آپ نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔[۱]

---

[۱] بخاری، کتاب التفسیر (سورۃ القمر) بابٌ قولہ وانشق القمر وان یروا آیۃً یعرضوا۔
مسلم کتاب صفات المنافقین واحکامھم، باب انشقاق القمر۔

۲۔ جنگِ خندق بڑی عسرت کی حالت میں لڑی جا رہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شکم پر پتھر بندھے ہوئے تھے۔ حضرت جابرؓ نے یہ حال دیکھا تو جلدی سے گھر گئے اور آپ کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ اس کے بعد آپ سے گزارش کی کہ آج آپ اور دو ایک اصحاب میرے گھر کھانا تناول فرمائیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم نے پکوایا کیا ہے؟ حضرت جابرؓ نے جواب دیا کہ ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہے اور ایک صاع (تقریباً ۳½ سیر) جو کی روٹی پکوائی ہے۔ یہ سنتے ہی آپ نے پورے لشکر میں اعلان کر دیا کہ آج جابر کے ہاں سب کی دعوت ہے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ گھر تشریف لائے اور دعا کی۔ اس کے بعد باری باری سے پورے لشکر نے جو ایک ہزار افراد پر مشتمل تھا سیر ہو کر کھایا۔ لیکن خدا کی قسم اس کے باوجود کھانا جوں کا توں بچا رہا[1]

۳۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ کے ساتھ تقریباً ۱½ ہزار افراد تھے۔ ایک وقت پانی کی اتنی قلت ہوئی کہ صرف ایک لوٹا پانی پورے مجمع کے پاس رہ گیا تھا۔ جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے لوٹے پر اپنا ہاتھ رکھا اور دعا کی، فوراً انگلیوں کے درمیان سے پانی چشموں کی طرح ابلنے لگا۔ چنانچہ اسی پانی سے پورا مجمع سیراب ہوا۔ راوی کا بیان ہے کہ پانی اتنی تیزی سے اُبل رہا تھا کہ اگر مجمع ایک لاکھ کا ہوتا تو بھی اس کے لیے کافی ہو جاتا۔[2]

یہ غیر معمولی واقعات حقیقت میں دلائلِ نبوت ہیں۔ یہ عام قوانینِ عالم کے تحت کبھی وجود میں نہیں آسکتے۔ یہ اس وقت وجود میں آتے ہیں جب کہ خدائے تعالیٰ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ فلاں شخص اس کا فرستادہ ہے، قوانینِ عالم میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ اس طرح ایک وہ چیز جو کسی عام انسان سے وقوع میں نہیں آسکتی پیغمبر کے ہاتھوں واقع ہو جاتی ہے۔

معجزات ثابت ہیں

ان واقعات کے بارے میں آپ پہلا سوال یہ کریں گے کہ آیا یہ ثابت بھی ہیں یا نہیں؟ اگر تاریخ ان کا ثبوت فراہم کرتی ہے تو یقیناً وہ قابلِ غور بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی حیثیت محض افسانوں کی ہے تو اُن پر غور و فکر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ بہت ہی غیر معمولی واقعات ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کا انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ٹھیک ان علمی و تاریخی بنیادوں پر ثابت ہیں جن بنیادوں پر ہم ماضی کا کوئی بھی غیر معمولی واقعہ ثابت کرتے ہیں۔ تاریخ نے اس نوعیت کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان کی تحقیق اور چھان بین کی چند

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق۔ [2] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الحدیبیہ۔

بنیادیں ہو سکتی ہیں :۔

(۱) پہلی بنیاد یہ کہ ان واقعات کے دیکھنے والے ان کو جس شکل میں بیان کر رہے ہیں وہ اسی شکل میں وجود میں آئے بھی تھے یا نہیں ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ واقعات کسی دوسرے رنگ میں ظاہر ہوئے ہوں اور انہوں نے اس کے دیکھنے اور سمجھنے میں غلطی کی ہو ؟

اب آپ ان واقعات پر غور کیجیے ۔ تاریخ کے مستند ذرائع سے ثابت ہے کہ یہ واقعات عام طور پر بڑے مجموں میں پیش آئے ۔ ان کے دیکھنے والی آنکھیں دو ایک نہیں بلکہ سینکڑوں تھیں ۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے دیکھنے اور سمجھنے میں لوگوں نے دھوکا کھایا ہے ۔ مثال کے طور پر شقِ قمر کے واقعہ کو ان لوگوں نے بھی دیکھا جو واقعہ کے وقت آپ کے قریب موجود تھے اور اُن لوگوں نے بھی اس کی گواہی دی جو باہر سے آئے تھے ۔ (ترمذی) جنگ خندق میں حضرت جابرؓ کے گھر کثرتِ طعام کا مشاہدہ ایک ہزار افراد نے کیا ۔ اسی طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر تھوڑے سے پانی کے فواروں کی شکل میں اُبلنے کا واقعہ پندرہ سو انسانوں کے درمیان پیش آیا ۔ انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کسی استدلال میں تو غلطی کر سکتی ہے لیکن کسی مشاہدے میں غلطی نہیں کر سکتی ۔

(۲) دوسری بنیاد یہ کہ جن لوگوں نے براہِ راست ان واقعات کو دیکھا ہے انھوں نے ان کے بیان میں کوئی کمی بیشی تو نہیں کی اور کہیں غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا ؟

اگر ہم تاریخ پر اعتماد کرتے ہیں تو ماننا پڑے گا ان واقعات کے دیکھنے والوں نے انہیں اپنی صحیح شکل میں بیان کیا ہے ۔ ان کے بارے میں اس بدگمانی کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی غلط بات پر متفق ہو گئے تھے اور دنیا کو فریب دینا چاہتے تھے کیونکہ بظاہر وہ بہت ہی نیک ، خدا ترس ، سچے اور انتہائی قابلِ اعتماد نظر آتے ہیں ۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان پر جھوٹے ہونے کا الزام لگائیں ۔

ان کے بیانات کو ایک اور چیز بہت ہی باوزن بنا دیتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کرنے میں اُن کا کوئی مادی فائدہ نہیں تھا ۔ کیونکہ اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کی تصدیق ہوتی ہے ۔ اسی تصدیق کی وجہ سے وہ اپنے وطن سے نکالے گئے ، ان کے مال و دولت پر قبضہ کیا گیا ، ان کی جانیں ضائع ہوئیں اور طرح طرح کی تکلیفیں انہیں اٹھانی پڑیں ، ان حالات میں عقل کہتی ہے کہ اگر یہ واقعات وجود میں نہ آتے اور ان کے حق ہونے کا انہیں یقینِ کامل نہ ہوتا تو وہ انہیں اپنے جی سے

گھڑ کر کبھی بیان نہ کرتے اور اگر کسی وجہ سے ان سے یہ غلطی سرزد ہو بھی جاتی تو وہ زیادہ مدت تک اس پر جمے نہ رہتے۔

(۳) تیسری بنیاد یہ کہ کیا یہ واقعات تاریخی تسلسل کے ساتھ ہم تک پہونچے ہیں یا یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ گیا ہے اور وہ تاریخ کے درجہ سے گر گئے ہیں؟

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اس قسم کے جتنے واقعات مشہور ہیں ان میں سے کسی خاص واقعہ کے بارے میں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے حق میں تاریخی ثبوت کافی نہیں ہے، لیکن مجموعی طور پر ان سب کا انکار ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے بہت سے واقعات اسلامی تاریخ میں تواتر کے ساتھ ثابت ہیں، کسی واقعہ کی چھان بین کے لیے آپ جو سخت سے سخت شرائط پیش کر سکتے ہیں وہ ان پر پورے اترتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعات اپنی تاریخِ وجود سے مسلمانوں کے تمام طبقات میں مشہور رہیں۔ اسے ہر نسل نے اپنے بعد آنے والی نسل تک پورے اہتمام کے ساتھ پہنچایا ہے۔ عوام نے ان واقعات کو سُنا اور قبول کیا اور اہلِ علم نے انہیں اپنی تحقیق کے مطابق پایا اور بیان کیا۔ آج تک مسلمانوں کے کسی بھی طبقے نے ان کی تردید نہیں کی، بلکہ اگر مخالفین کی طرف سے ان کا انکار کیا گیا تو پوری قوت اور دلائل کے ساتھ انہیں ثابت کیا گیا۔ ان واقعات کا اس کثرت سے پوری ایک امت میں پھیل جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

آپ کہیں گے کہ یہ خاص قوم میں پھیلے ہوئے واقعات ہیں۔ ساری دنیا ان سے واقف نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سب کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتے۔

میرے نزدیک یہ بالکل بے معنی اعتراض ہے۔ تاریخ میں آپ کو بہت سے اہم ترین واقعات ملیں گے جو پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں، لیکن ان کے جاننے والے گنتی کے چند افراد ہیں۔ اگر کسی واقعہ کے اثبات کے لیے یہ شرط لگا دی جائے کہ اسے ہر شخص جانتا ہو تو ہم بڑے سے بڑے واقعہ کو ثابت نہیں کر سکتے۔ کیا سکندر رومی اور اس کی فتوحات سے دنیا کا ہر فرد واقف ہے؟ کیا حضرت مسیحؑ اور ان کی تعلیمات کو سب لوگ جانتے ہیں؟ نہیں، بلکہ میں تو کہوں گا کہ بہت سے اہم واقعات حتّٰی کہ عظیم شخصیتیں صرف مخصوص قوموں ہی میں مشہور رہیں۔ دنیا کے ہر طبقے اور ہر قوم کی سندِ قبولیت انہیں حاصل نہیں ہے، غزالیؒ اور ابن تیمیہؒ اسلامی تاریخ میں بہت ہی اونچے مقام کے مالک ہیں۔ ان کے

کارنامے اتنے نمایاں ہیں کہ امت مسلمہ کبھی انہیں بھلا نہیں سکتی۔ لیکن اس امت سے باہر کم ہی لوگ ان کے نام تک سے واقف ہیں اور ان کے کام کو جاننے والے تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

غلبہ روم کی پیشین گوئی

اب میں آپ کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا معجزہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو نہ صرف مسلمانوں میں مشہور ہے بلکہ اسے غیر مسلم محققین بھی ایک تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔

۶۰۳ء کا واقعہ ہے کہ خسرو پرویز شاہ ایران نے رومی سلطنت پر حملہ کر دیا اور چند سال کے اندر رومی فوجوں کو پے در پے شکستیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈیسا (موجودہ اورفا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ اس وقت روم پر فوکاس کی حکومت تھی۔ روم کے اعیان سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس ملک کو نہیں بچا سکتا، افریقہ کے گورنر سے مدد طلب کی۔ اس نے اپنے بیٹے ہرقل کو ایک طاقتور بیڑے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہونچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ ہرقل قیصر بنا دیا گیا۔ لیکن ہرقل بھی برسر اقتدار آکر اس سیلاب کو نہ روک سکا۔ تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۱۳ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۱۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے مقدس کلیسہ کنیستہ القیامۃ برباد کر دیا گیا۔ اصلی صلیب جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاٹ پادری زکریاہ کو بھی وہ پکڑ کر لے گئے، اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدودِ مصر تک پہونچ گئیں۔

ان حالات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی کہ ایرانیوں کو شکست ہو گی اور دس سال سے کم مدت میں رومی ان پر غالب آجائیں گے۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ. (رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے اور اپنی اس مغلوبیت کے چند ہی سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے) آپ نے ۶۱۵ء کے لگ بھگ یہ پیشین گوئی فرمائی تھی جبکہ دن بدن حالات بالکل اس کے خلاف جا رہے تھے اور دور دور تک رومیوں کے غالب آنے کا کوئی امکان

نہیں تھا۔ ۶۱۹ء تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے گاڑ دیے، ایشیائے کوچک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دباتی باسفورس کے کنارے تک پہونچ گئیں اور ۶۱۷ء میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے خلقدون (موجودہ قاضی کوئی) پر قبضہ کر لیا۔ آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مؤرخ گبن کے بقول قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آ جائے گی بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جائے گی۔"

اس کے بعد حالات ایک دوسرے رُخ پر چلنے لگے جس کا سان وگمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۶۲۲ء میں قیصر روم ہرقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستہ طرابزون کی طرف روانہ ہوا، جہاں اس نے ایران پر پشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی اس نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں آذربیجان میں گھس کر زرتشت کے مقام پیدائش ارمیاہ کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل دباتی چلی گئیں۔ نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہانِ ایران کی قیام گاہ دستگرو (دسکرۃ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر ہرقل کے لشکر عین طیسفون کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۸ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی۔ وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ۱۸ بیٹے قتل کر دیے گئے اور چند روز بعد وہ خود قید کی سختیوں میں ہلاک ہو گیا۔

اس طرح دس سال کی مختصر سی مدت میں قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ روایات میں آتا ہے کہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی، مکہ والوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور حالات بظاہر ایسے ہی تھے کہ اس پر یقین کرنا مشکل تھا، چنانچہ اُبی ابن خلف نے حضرت ابوبکرؓ سے شرط بدی کہ اگر دس سال کے اندر رومی غالب آ گئے تو سو اونٹ میں دوں گا ورنہ تم کو دینے ہوں گے۔ جب اس پیشین گوئی کے پورے ہونے کا وقت آیا تو اُبی بن خلف مر چکا تھا۔ اس کے وارثوں نے اپنے باپ کی ہار مان کر شرط کے سو اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا کہ وہ ان اونٹوں کو صدقہ کر دیں۔

کیونکہ شرط اس وقت ہوئی تھی جب کہ شریعت میں جوے کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا اس لیے حربی کافروں سے شرط کا مال تو لے لینے کی اجازت دے دی گئی مگر ہدایت کی گئی کہ اسے خود استعمال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔[1]

اس پیشین گوئی کا پورا ہونا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زبردست معجزہ ہے۔ اس کو دیکھ کر عرب کے مشرکین بکثرت آپ پر ایمان لے آئے۔ اب جو لوگ اس معجزہ کے قطعی ثبوت کے باوجود آپ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں نہیں معلوم وہ اپنے انکار کو کیونکر صحیح ثابت کر سکتے ہیں اور اس کی ان کے پاس کیا دلیل ہے؟

اعجاز القرآن

یہ معجزات ایک خاص وقت میں ظاہر ہوئے اور اسی وقت ختم ہو گئے ان معجزات کو جن انسانوں کی آنکھوں نے دیکھا انہوں نے بعد والوں تک انہیں پہنچایا اور دنیا سے چلے گئے۔ اب یہ ہمارے لیے ماضی کے تذکرے ہیں جو کتابوں میں محفوظ ہیں اور جنہیں روایت کرنے والی زبانیں اگلوں سے روایت کر رہی ہیں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معجزہ ایسا بھی ہے جو بالکل ہمارے سامنے موجود ہے اور جسے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر شخص ہر جگہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ آپ کا یہ معجزہ وہ عظیم کتاب ہے جو آپ کو خدا کی طرف سے ملی ہے۔ دنیا نے اس کا مطالعہ ہر رُخ سے کیا لیکن کسی بھی پہلو سے آج تک اس کا جواب نہیں دیا جا سکا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو اپنے حقیقی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

مامن الانبیاء من نبی الا قد اعطی من الآیات مامثله امن علیه البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعًا یوم القیٰمۃ[2]

"جتنے بھی نبی گزرے ہیں ان میں سے ہر نبی کو ایسے معجزات عطا کیے گئے جنہیں دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لا سکتے تھے، لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ یہ وحی (قرآن) ہے جو اللہ نے مجھ پر نازل کی ہے مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن میرے پیچھے چلنے والے ہر نبی کی امت سے زیادہ ہوں گے۔"

---

[1] ملخص از تفہیم القرآن جلد سوم، مقدمۂ تفسیر سورہ روم۔ [2] بخاری، کتاب ابواب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی۔ مسلم کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا ﷺ الی جمیع الناس ونسخ الملل بملتہ۔

یہ معجزہ ایک ایسے ماحول میں صادر ہوا جہاں علم و حکمت کے چرچے نہیں تھے، جہاں معمولی لکھنا پڑھنا جاننے والے افراد بھی گنتی کے چند ہی تھے، جہاں جہالت اور تاریک خیالی عام تھی، جہاں لوگ اوہام و خرافات میں گرفتار تھے، جہاں مظاہر پرستی عقیدے میں شامل تھی اور خیالات کی پستی اپنی آخری حد کو پہنچی ہوئی تھی، جہاں مادّی لذّتیں انسانی تگ و دو کی آخری منزل تھیں اور محسوسات سے اوپر اٹھ کر سوچنے والے انسان دور دور تک موجود نہیں تھے، جہاں اچھے اچھے خطیب تھے، لیکن ان کی خطابت کا موضوع اپنی شجاعت لوٹ مار اور قتل و غارت گری تھا، جہاں تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے لوگ پائے جاتے تھے لیکن ان کی تاریخی دلچسپی ماضی کے خاندانی کارناموں، قبائل کی پچھلی جنگوں اور گھوڑوں اور اونٹوں کے نسب ناموں تک محدود تھی، اس سے آگے ان کے علم تاریخ کی کوئی رسائی نہیں تھی۔ جہاں بچہ بچہ شاعر تھا لیکن ان کی شاعری عورت، شراب اور بے حیائی کے ارد گرد گھومتی تھی، بلاشبہ اس میں حکمت و دانائی کی باتیں بھی کہیں کہیں آجاتی تھیں لیکن اصلاً یہ کہ اس کے موضوع سے خارج تھیں، جہاں زندگی اتنی سادہ تھی کہ سیاست و تمدن اور فلسفہ و الٰہیات کے پیچیدہ مسائل سے کوئی واقف نہ تھا اور جہاں علم کی دنیا اتنی تنگ تھی کہ خدا کی ذات و صفات، کائنات کی حقیقت، انسان کے مقصدِ حیات اور اس کے آغاز و انجام سے کسی کو بحث نہیں تھی۔ اس ماحول میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سامنے آتے ہیں اور وہ زبردست انقلابی کتاب اپنے ساتھ لاتے ہیں جس نے دنیا بدل دی۔ انسان اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ مدرسوں اور کالجوں میں صرف کرتا ہے تو اسے علم کی سند ملتی ہے۔ لیکن آپ نے کسی مدرسے اور کالج میں تعلیم نہیں پائی۔ لوگ عالموں اور فلسفیوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں تو حکمت و دانائی کی باتیں سیکھتے ہیں، لیکن آپ نے کسی عالم اور فلسفی کی صحبت نہیں اٹھائی۔ لکھنے والے مدتوں لکھنے کی مشق و ممارست کرتے ہیں تو چند سطر لکھنے کے قابل ہوتے ہیں لیکن آپ نے کبھی لکھنے کی مشق نہیں کی۔ بولنے والے زمانے تک بولنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں تو انہیں مجمعوں میں تقریر کرنا آتا ہے لیکن آپ نے کبھی صلاحیتِ تقریر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود قرآن جیسی کتاب کا پیش کرنا کیا کوئی معجزہ نہیں ہے؟ جس میں علم کی وسعت بھی ہے، فلسفہ کی گہرائی بھی ہے، تصنیف کی ترتیب اور سلیقہ بھی ہے اور خطابت کا زور بھی ہے۔ کیا آپ اس بے مثال کتاب کو کسی انسانی ذہن کی تخلیق کہہ سکتے ہیں، جو اس وسیع کائنات کے بارے میں صحیح ترین نقطۂ نظر عطا کرتی ہے، جو مابعد الطبعیاتی مسائل پر پوری تفصیل سے بحث کرتی ہے جو ماضی کے حالات ہمارے سامنے رکھتی

اور ان سے ٹھیک ٹھیک نتائج اخذ کرتی ہے، جو انسان کے اعمال اور ان کے اچھے اور بُرے ثمرات سے گفتگو کرتی ہے، جو اس کے معاشی تمدنی سیاسی اور تہذیبی مسائل کو اس طرح حل کرتی ہے کہ آج تک اس سے بہتر حل دنیا پیش نہیں کرسکی اور جو اسے بہترین قانون اور بہترین نظام حیات دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ خدا اور انسان کے اس لطیف تعلق کو واضح کرتی ہے جسے انسان خود سے کبھی جان نہیں سکتا اور جس کے جانے بغیر اس کی زندگی کا ہر لمحہ اور اس کی جدوجہد کا ہر پہلو لاحاصل اور بے معنی ہے۔ جو بھی شخص قرآن کی ان خصوصیات پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ خدا کی زمین پر بے شک یہ ایک عظیم معجزہ ہے۔ اس عظیم معجزہ کے ہوتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویٰ رسالت کی تصدیق کے لیے پھر کس معجزے کی ضرورت ہے؟ اور اس دلیل سے بڑھ کر آخر آپ کی تائید میں اور کونسی دلیل لائی جا سکتی ہے؟

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ۧ

(العنکبوت: ۴۸ تا ۵۱)

اس کتاب کے نازل ہونے سے پہلے تم کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے اسے لکھتے تھے۔ اگر یہ بات ہوتی تو یقیناً یہ باطل پرست شبہے میں پڑ جاتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن کھلی ہوئی آیتوں کی شکل میں ان لوگوں کے سینوں میں موجود ہے جن کو علم عطا کیا گیا ہے۔ یہ منکرین کہتے ہیں کہ اس شخص پر اس کے خدا کی طرف سے کچھ نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں۔ کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں تو محض کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے (یہ نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر (قرآن جیسی) کتاب نازل کی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ بیشک اس میں رحمت اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔"

قرآن کی اعجازی شان یہ ہے کہ اس کی ہر بات حقیقت کی ترجمانی کرتی ہے، اس کی تعلیمات اہلِ علم کے دل کی آواز ہیں اور اس کی آیتوں میں حق و صداقت کا دریا موجزن ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ یقین

پیدا ہوتا ہے کہ اسے کسی انسان نے نہ تو مرتب کیا ہے اور نہ قیامت تک کوئی مرتب کر سکتا ہے۔ یہ صرف اس خدا کی کتاب ہے جو حقیقت کا ٹھیک ٹھیک علم رکھتا ہے اور اس عالم کے آغاز و انجام سے پوری طرح باخبر ہے۔ دنیا کا ہر انقلاب بہت سے نظریات کو الٹ کر رکھ دیتا ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ قرآن اس زمین پر صدیوں سے موجود ہے اور اس دوران میں بے شمار ذہنی و فکری انقلاب آچکے لیکن کوئی بھی انقلاب اس کے کسی بیان کو رد نہیں کر سکا، بلکہ ہر انقلاب اس کی علمی عظمت کو اور بڑھا دیتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کائنات کی کوئی ایک بھی چیز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی گواہی دے، تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حالانکہ آپ نے ان کے سامنے ایک ایسی کتاب رکھ دی ہے کہ جس کی تائید میں زمین و آسمان کی ایک ایک چیز بول رہی ہے۔ ہر حسی معجزہ ایک دلیل ہوتا ہے، لیکن قرآن اپنے دعوے کے ثبوت میں آفاق و انفس کی بے شمار دلیلیں فراہم کرتا ہے۔ اگر انسان کے پاس حقیقت کا مطالعہ کرنے والی آنکھیں ہوں تو وہ دیکھے گا کہ پوری کائنات اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ اگر وہ صحیح فکر کا حامل ہے تو معلوم ہوگا کہ قرآن عقل اور منطق کی میزان پر ٹھیک ٹھیک اتر رہا ہے۔ بلکہ خود اس کا ضمیر اگر وہ زندہ ہے تو اس کے حق ہونے کی شہادت دے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص قرآن کی صداقت کا قائل نہ ہو اور اس کے دلائل کو ماننے سے انکار کر دے، لیکن دنیا میں اس کے منکرین ہی آباد نہیں ہیں، ان ہی کے پاس عقل و دانش کا سرمایہ نہیں ہے اور صرف وہی قوت فیصلہ کے مالک نہیں ہیں، بلکہ اس دنیا میں وہ لوگ بھی ہیں جو اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ وہ اسے خدا کی کتاب سمجھتے ہیں اور اس کے دلائل سے مطمئن ہیں۔ ان کا یہ اطمینان جھوٹا اطمینان نہیں ہے بلکہ حقیقی اطمینان ہے، جو اعترافِ حقیقت کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے منکرین میں سے کوئی بھی شخص اپنے مقام پر مطمئن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسی حقیقت کا انکار کر رہا ہے جس کا اقرار کائنات میں ہر طرف سے ہو رہا ہے۔ قرآن کا انکار کر کے اس نے اپنے خدا کو چھوڑ دیا ہے اور جب انسان خدا کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی زندگی میں اتنا زبردست خلا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اس کو کسی بھی ذریعہ سے پُر نہیں کر سکتا۔ وہ ایک مجرم ہے وہ جس پہلو سے بھی اپنے آپ کو دیکھے گا، خطا کار محسوس کرے گا۔ وہ وقتی طور پر اپنے جرم کو چھپا سکتا ہے لیکن اس کی روح اضطراب اور بے چینی سے کبھی نجات نہیں پا سکتی۔ قرآن انسان کو خدا سے قریب کرتا ہے، اس سے سکون اور اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ جو لوگ صحیح معنوں میں قرآن کو مان رہے ہیں ان کی زندگیوں میں اس کی جھلک ہر حال میں دیکھی جا سکتی ہے۔ معجزے کا مقصد انسان کی روح کو مطمئن کرنا ہے تو قرآن دنیا کا عظیم ترین

معجزہ ہے۔ پھر لوگ کیوں اس معجزے کو نہیں دیکھتے؟

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝ (الرعد: ۲۷-۲۸)

جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی؟ ان سے کہہ دو کہ اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے سیدھی راہ دکھاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور ان ہی کے دل اللہ کی یاد سے چین اور سکون پاتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کی یاد ہی سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔

اس کتاب کا اعجاز یہ ہے کہ اس نے بے شمار زندگیوں میں عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا، جو لوگ خدا سے ناواقف تھے وہ اسے جاننے لگے، جو اسے بھولے ہوئے تھے ان کے دلوں میں اس کی یاد بس گئی، جو اس سے بے خوف تھے وہ متقی اور اس سے ڈرنے والے بن گئے، جن کے اخلاق بگڑے ہوئے تھے ان کی اخلاقی حِس جاگ اٹھی، جو چور تھے ان کے اندر جذبۂ امانت اُبھر آیا، جو زانی تھے ان کی پاکبازی اور عفت کی دھوم مچ گئی اور جو قاتل اور لٹیرے تھے وہ دوسروں کی جان و مال کے محافظ بن گئے۔ برائی سے بھلائی کی طرف اور بدی سے نیکی کی طرف یہ زبردست انقلاب، بتاؤ کیا معجزہ نہیں ہے؟ تم محسوسات کی دنیا میں انقلاب کو معجزہ قرار دیتے ہو اور اس اعجاز کو سمجھتے نہیں ہو جو قرآن نے اخلاق اور روحانیت کی دنیا میں پیدا کیا ہے۔ لکڑی کا سانپ کی شکل اختیار کرنا، کوئی شک نہیں کہ معجزہ ہے لیکن کیا سانپ جیسے انسانوں کے اندر فرشتوں کے اوصاف پیدا کر دینا معجزہ نہیں ہے؟ خشک زمین سے پانی کا چشمہ اُبل پڑے تو بلاشبہ یہ معجزہ ہے لیکن اگر گمراہ انسانوں کے دلوں میں ہدایت کا چراغ جل اٹھے تو کیا معجزہ نہیں ہے؟ مردے کو زندہ کرنا بے شک ایک زبردست معجزہ ہے لیکن مردہ دلوں کو حیاتِ تازہ عطا کرنا کیا کوئی معجزہ نہیں ہے؟ قرآن نے یہی زبردست معجزہ ظاہر کیا تھا اور آج بھی اس کے وسیع اثرات ہر طرف دیکھے جا سکتے ہیں۔

۲۔ تعلیمات

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کا دوسرا ثبوت آپ کی تعلیمات ہیں اگر کوئی شخص غیر جانبداری

اور صاف ذہن کے ساتھ صرف ان تعلیمات پر غور کرے تو یہ ماننے پر لازمًا مجبور ہو گا کہ آپ خدا کے سچے رسول ہیں۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا اس کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ وہی معبود ہے، زندگی کے ہر معاملے میں صرف اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی انسان کے لیے جائز نہیں ہے۔ وہ تمام اعلیٰ صفات سے متصف ہے، اس کی طرف کوئی بُری صفت منسوب نہیں کی جا سکتی۔ وہ اچھے اخلاق کو پسند کرتا ہے اور برے اخلاق اسے ناپسند ہیں۔ یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے بلکہ اسے ایک دن فنا ہونا ہے۔ اس دن خدا نیک انسانوں کو اپنی خاص نعمتوں سے نوازے گا اور جو بدکردار ہیں انہیں سخت ترین عذاب دے گا۔

یہ تعلیمات حقیقت کے بالکل عین مطابق ہیں۔ اس سے کائنات کے آغاز و انجام کی بہترین توجیہ ہوتی ہے اور خدا کا صحیح ترین تصور ملتا ہے۔ ان سے انسانی زندگی کے لیے ایسا مکمل نقشہ تیار ہوتا ہے کہ اس میں کہیں سے کوئی خلا یا نقص نظر نہیں آتا۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا سرچشمہ ان کا اپنا ذہن نہیں ہے بلکہ خدا کی ذات ہے۔ کیونکہ کسی بھی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا، کائنات اور انسان کے بارے میں اتنا متوازن نظریہ پیش کرے اور اس کے اندر اتنی ہم آہنگی اور توازن پایا جائے۔ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا۔ (النساء: ۸۲ (کیا یہ قرآن پر غور نہیں کرتے کہ ان پر اس کی حقانیت واضح ہوتی اگر یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بڑا اختلاف اور تضاد پاتے۔)

آسمانی کتابوں کی شہادت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات پیش کی ہیں ٹھیک وہی تعلیمات وہ تمام انبیاء پیش کرتے رہے ہیں جو آپ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ گزشتہ انبیاء کی تعلیمات اب اپنی صحیح شکل میں محفوظ نہیں ہیں بلکہ انسانوں نے اپنی خواہش سے انہیں بہت کچھ بدل دیا ہے۔ حتیٰ کہ بہت سے انبیاء کے متعلق یہ پتہ چلانا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ ان کی اصل تعلیمات کس زبان میں تھیں اور وہ کس دور میں پیش ہوئی تھیں، لیکن اس کے باوجود ہم ان بنیادی باتوں کو جانتے ہیں جن پر آسمانی کتابیں متفق رہی ہیں۔ قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے اس لیے اگر آپ اس واقعہ کو مانتے ہیں کہ ہر دور میں خدائے تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ کیونکہ ایک ہی

بات جسے دس اشخاص بیان کر رہے ہیں ان میں سے نو کی تصدیق کرنا اور دسویں شخص کو جھوٹا قرار دینا سراسر ظلم ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ وہ ان بہت سے پیغمبروں میں سے ایک ہیں جو خدا کی طرف سے دنیا میں آتے رہے ہیں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ

محمدؐ تو صرف خدا کے رسول ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔

آپ نے قرآن اس صراحت کے ساتھ پیش کیا کہ وہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے بلکہ بہت سی آسمانی کتابوں میں سے ایک کتاب ہے۔ جس طرح خدائے تعالیٰ اس سے پہلے اپنی کتابیں نازل کرتا رہا ہے ٹھیک اسی طرح اس نے قرآن بھی نازل کیا ہے۔ اگر آپ پچھلی آسمانی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب کو مانتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن کا انکار کریں، جبکہ دونوں آپ کو خدا کی طرف بلا رہی ہیں۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ۔

(الانبیاء : ۲۴)

(کہہ دو) یہ ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جو میرے ساتھ ہیں اور یہی ان لوگوں کے لیے بھی نصیحت رہی ہے جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ قف

(یونس : ۳۷)

اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اسے کوئی شخص گھڑ کر پیش کر دے۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور یہ اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ اس کتاب خاص کی تفصیل ہے (جس کا ذکر بہت پہلے سے خدا کے رسول کرتے آرہے ہیں) اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۞

(یوسف : ۱۱۱)

یہ خود ساختہ کلام نہیں ہے بلکہ یہ ان تعلیمات کی سراپا تصدیق ہے جو اس سے پہلے پیش کی جاتی رہی ہیں اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے۔ اور یہ ہدایت و رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہیں اسی طرح ان کتابوں

سے بھی آپ کے دعوی رسالت کی تائید ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب اس حیثیت سے ہمارے سامنے نہیں آتی کہ وہ خدا کی آخری کتاب ہے بلکہ وہ صریح طور پر ایک آخری نبی کے آنے کی خبر دیتی ہے۔ یہ آخری نبی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ہمارا یہ یقین محض اس لیے نہیں ہے کہ آپ نے آخری نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، بلکہ اس لیے ہے کہ آخری نبی کے جو اوصاف اور خصوصیات ان کتابوں میں بیان کی گئی ہیں وہ تنہا آپ ہی کے اندر پائی جاتی ہیں۔

توریت اور انجیل آسمانی کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے صدیوں پہلے نازل ہوئی تھیں۔ ان کتابوں میں آپ کی آمد کی کھلی ہوئی بشارتیں موجود تھیں اور آج بھی یہ تحریف کے باوجود موجود ہیں۔ اس لیے ان کتابوں کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ آپ کی رسالت کا انکار نہ کریں اور آگے بڑھ کر اسے قبول کریں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ ز (الاعراف: ۱۵۷)

(خدا کی رحمت اہل کتاب کے ان لوگوں کے لیے ہے) جو اس بے پڑھے لکھے نبی کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ ان کتابوں کے ماننے والے آپ کو بحیثیت رسول کے "اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح کوئی باپ اپنی اولاد کو پہچانتا ہے۔" (البقرہ: ۱۴۶) اس کے باوجود آپ کی رسالت کا انکار حقیقت میں ان کتابوں کا انکار ہے، جن میں یہ بشارتیں درج ہیں اور جن کے آسمانی کتاب ہونے کا وہ اپنی زبان سے اقرار کر چکے ہیں۔ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ (اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اس گواہی کو چھپا دے جو اس کے پاس خدا کی جانب سے ہے)

جن لوگوں کے پاس آسمانی کتابیں ہیں ان کا آپ کی رسالت کے بارے میں یہ یقین اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ خود ساختہ نبی نہیں ہیں بلکہ اس سلسلہ رسالت کی آخری کڑی ہیں جس سے حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ تعلق رکھتے ہیں اور جو حضرت آدمؑ کی پیدائش کے دن سے آپ کی بعثت تک قائم رہا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ۝ اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ (الشعراء: ۱۹۶-۱۹۷) (یقیناً یہ قرآن پچھلے صحیفوں میں ہے۔ کیا ان کے لیے یہ دلیل نہیں ہے کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں)

قرآن کے ان دعوؤں کے ثبوت میں علماء نے پچھلی ان دونوں آسمانی کتابوں سے بہت سی تصریحات نکال کر دکھائی ہیں۔ یہاں ان سب کے دُہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف دو تین تصریحات نقل کرونگا۔

"خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔"

یہ توریت (کتاب استثناء باب ۳۳۔ آیت ۲) کی عبارت ہے۔ اس میں حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی نبوت کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی بھی صراحت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو نبوت کوہِ سینا پر ملی تھی اور "شعیر سے طلوع ہوا" سے مراد حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ہے۔ اس کے بعد کی پوری عبارت کا انطباق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ہوتا ہے۔ فاران مکہ کی پہاڑیوں کا نام ہے۔ جہاں سے آپؐ کی نبوت کا آغاز ہوا تھا اور نبوت کے بائیس سال بعد آپ ہی دس ہزار فرشتہ صفت انسانوں کے ساتھ مکے میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے اور آپ ہی کے ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی جس نے بہت ہی مختصر عرصے میں باطل کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں :۔

"خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں ان سے کہوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔" (تثنیہ باب ۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ۔ حضرت اسحٰق کے بیٹے حضرت یعقوبؑ سے جو نسل چلی اس کا نام بنی اسرائیل پڑ گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا تعلق اسی نسل سے تھا۔ اوپر کی عبارت میں کہا گیا ہے کہ آنے والا نبی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ اس سے قطعی طور پر بنی اسرائیل ہی مراد ہو سکتے ہیں اور بنی اسمٰعیل میں سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا نبی نہیں پیدا ہوا۔

اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے ٹھیک یہی بات قرآن مجید میں بھی کہی گئی ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۥ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ۝ (المزمل: ۱۵)	ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا ہے جو تمہارے بارے میں گواہی دینے والا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم نے فرعون کے پاس اپنا رسول بھیجا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پیشین گوئی فرماتے ہیں :۔

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے ۔مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ۔لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔"

اب آپ دیکھیے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کی جو پیش گوئی نقل کی ہے وہ اس سے کتنی مطابقت رکھتی ہے ۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ (الصّف : ۶)

اور اے پیغمبر اس وقت کا ذکر کرو جبکہ مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا تھا" اے بنی اسرائیل ! میں تمہاری طرف خدا کا رسول ہوں ۔ اپنے سے پہلے کی نازل شدہ کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔" لیکن جب وہ رسول دلیلوں کے ساتھ ان کے پاس آیا تو کہنے لگے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔"

یہ ہیں آپ کے رسول ہونے کے حق میں توریت اور انجیل کی واضح شہادتیں جنہیں دنیا کی دو بڑی قومیں آج بھی آسمانی کتابیں مانتی ہیں ۔جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کا انکار کرے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی تائید میں حضرت موسیٰ و عیسیٰ جیسی تاریخ کی عظیم شخصیتیں بھی کھڑی ہیں ۔

۳۔ سیرت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی آپ کے رسول ہونے کی ایک زبردست دلیل ہے ۔آپ کی پختہ سیرت، آپ کے مضبوط عزائم، آپ کا بے لچک کردار، آپ کے بلند حوصلے، آپ کا ایمان و یقین، آپ کا خدا سے تعلق اور اخلاص اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ کوئی عام انسان نہیں، بلکہ خدا کے رسول ہیں ۔آپ کے اندر ایسی غیر معمولی صلاحیتیں اور بے نظیر خوبیاں موجود تھیں جو خدا کے کسی پیغمبر ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ تاریخ میں جتنی بڑی شخصیتیں گزری ہیں ان کی بڑائی ان کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے ابھرتی ہے

اور پھر وہ ان کی پوری زندگی پر چھا جاتی ہے۔ اگر اس خاص پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی بڑائی ختم ہو جاتی ہے۔ شکیپیر اور سعدی کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں ادب کے علاوہ بہت سی اور خوبیاں بھی ہوں، لیکن یہ ان کی عظمت کی دلیل نہیں ہیں۔ ان کے جس پہلو نے انہیں عام سطح سے اوپر اٹھایا ہے۔ وہ ان کا ادب ہے۔ اگر آپ ان کے ادب کو ان سے چھین لیں تو وہ عام انسانوں کی صف میں نظر آئیں گے۔ اس کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ ہم جس پہلو سے بھی کرتے ہیں، اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپؐ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے چالیس سال کی عمر میں رسالت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد آپ کا کردار منصبِ رسالت کے ساتھ اس طرح مل گیا ہے کہ ہم دونوں کو جدا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس دعوے سے پہلے بھی آپ کی شخصیت اتنی حیرت انگیز اور اس قدر بلند اور فائق تھی کہ کوئی دوسری شخصیت اس پایے کی کہیں نظر نہیں آتی۔ سیرت و کردار اور اخلاق و شرافت کے لحاظ سے آپ کا مقام اتنا اونچا تھا کہ اگر آپ رسول نہ ہوتے تو بھی تاریخ کو لکھنا پڑتا کہ اس سطح کا انسان سوائے پیغمبروں کے اور کوئی پیدا نہیں ہوا۔ آپؐ کا اخلاق مثالی اخلاق اور آپ کا کردار نمونے کا کردار تھا۔ آپ کے اندر شرافت تھی اور اعلیٰ درجے کی شرافت تھی، آپ راست باز اور منصف مزاج انسان تھے، آپ کی ہر بات واقعہ کے مطابق ہوتی اور آپ کا ہر فیصلہ عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتا۔ آپ کی زندگی اتنی صاف ستھری اور بے داغ تھی کہ کسی نے آپ میں کسی اخلاقی عیب کی نشاندہی نہیں کی۔ آپ کی ذات سے دوستوں ہی کو نہیں دشمنوں کو بھی فائدہ پہنچا، آپ اپنوں کے لیے بھی رحمت تھے اور غیروں کے لیے بھی۔ آپ تاجر تھے تو دیانت دار تاجر تھے۔ اپنے وطن کے شہری تھے تو پُرامن شہری تھے۔ پڑوسی تھے تو خیر خواہ پڑوسی تھے۔ دوست تھے تو ہمدرد دوست تھے، بھائی تھے تو مہربان بھائی تھے۔ کسی کے ساتھ آپ نے مکر و فریب کا معاملہ نہیں کیا اور نہ کسی نے آپ سے دھوکا کھایا۔ آپ کی قوم نے بار بار تجربے کے بعد بالاتفاق اعلان کیا کہ یہ "امانت دار" انسان ہے۔ اس سیرت کا انسان جب اپنے رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اسے جھوٹا کہتے ہوئے شرم آتی ہے اور ضمیر ملامت کرنے لگتا ہے۔

میں یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے چند خاص پہلو پیش کروں گا۔ ان سے صاف معلوم ہوگا کہ آپؐ خدا کے سچے رسول ہیں، کیونکہ کسی جھوٹے شخص کی زندگی میں یہ پہلو ہرگز نمایاں نہیں ہو سکتے۔

سنجیدہ شخصیت آپ بہت ہی باوقار اور سنجیدہ انسان تھے۔ آپ کی پوری زندگی اور

لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات گواہ ہیں کہ آپ غیر سنجیدہ نہیں تھے، آپ کی قوم آپ کی باتوں کو مذاق نہیں سمجھتی تھی، آپ کے اندر متانت اور شائستگی تھی اور آپ کے ہر کام میں اس کا ظہور ہوتا تھا۔ کیا آپ اس شخص کو غیر سنجیدہ اور اس کی باتوں کو مذاق کہیں گے جسے اختلافات میں حکم قرار دیا جائے اور جو لوگوں کے معاملات کا دور بینی کے ساتھ فیصلہ کرے؟ دعویٰ نبوت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر نو کا ارادہ کیا۔ جب تعمیر ہونے لگی تو اس بات پر شدید اختلاف پیدا ہو گیا کہ حجر اسود کو جو حضرت ابراہیمؑ کی یادگار ہے، کون اس نئی تعمیر میں اپنی جگہ نصب کرے۔ چار پانچ دن تک اختلاف جاری رہا اور قریب تھا کہ جاہلیت اپنا رنگ دکھاتی اور آپس میں تلواریں چل جاتیں۔ اتنے میں طے پایا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ وہ شخص کرے گا جو کل صبح سب سے پہلے خدا کے گھر میں داخل ہوگا۔ دوسرے دن لوگوں نے جب سب سے پہلے داخل ہونے والے انسان کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ محمد ہے، یہ امانت دار ہے۔ ہم اسے حکم ماننے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد آپ نے جو فیصلہ کیا اسے سب نے بخوشی قبول کر لیا[۱]

سوچیے! کہ جو شخص اپنی قوم میں لیڈر بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اپنے اس دعوے کی وجہ سے کہ وہ خدا کا رسول ہے، قوم کی ملامت کا نشانہ بن جاتا ہے۔ وہ اسے ستاتی ہے، اس پر طنز و تعریض کرتی ہے، اس کی راہ میں کانٹے بچھاتی ہے، اس پر گندگی پھینکتی ہے، اسے پتھروں سے مار کر زخمی کر دیتی ہے۔ اس کا اور اس کے خاندان کا پورے تین سال تک مکمل بائیکاٹ کیے رہتی ہے، اس کے قتل کے منصوبے بناتی ہے، اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کرتی ہے، اس پر اور اس کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے ختم کر دینا چاہتی ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اس دعوے سے باز نہیں آتا بلکہ اس میں ایک لفظ اور ایک شوشے کی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے تو ہم کس بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی قوم بلکہ ساری دنیا کے ساتھ مذاق کر رہا ہے؟ اگر یہ مذاق ہے تو اپنی نوعیت کا واحد مذاق ہے۔ ایسا مذاق آج تک نہ تو کسی کے ساتھ کیا گیا اور نہ عملاً کیا جا سکتا ہے۔

جو شخص سچائی کو لے کر اٹھے اسے اپنے بیان میں متین اور سنجیدہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ حقیقت اور مذاق کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ حقیقت اپنے اظہار کے لیے ہمیشہ سنجیدگی کی طالب ہوتی ہے۔

---

[۱] سیرۃ النبی لابن ہشام مطبوعہ قاہرہ جلد ۱ ص ۲۱۴-۲۰۹

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعوی رسالت میں بے حد سنجیدہ تھے۔ آپ کے دعوے کی یہ سنجیدگی میرے نزدیک آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔

راست بازی

آپ اپنی ہر بات میں سچے تھے، آپ کے بارے میں کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا اس لیے بظاہر آپ کا دعوی رسالت بھی سچا دعوٰی تھا۔ جو شخص آپ کو جھوٹا کہتا ہے وہ ایک ایسی ہستی پر جھوٹ کا الزام لگاتا ہے جس کے سچے ہونے کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی مخالفت کرنے والوں میں نضر بن حارث بہت ہی نمایاں تھا اور ہمیشہ آپ کی اذیت کے درپے رہتا تھا۔ وہ آپ کی قوم سے کہتا ہے۔ "اے قریش کے لوگو! محمدؐ کی دعوت ایک ایسی مصیبت ہے جس کا تمہارے پاس کوئی علاج نہیں ہے۔ وہ جب جوان تھا تو تمہارے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ، سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑا امانت دار تھا لیکن جب اس کے بال سفید ہوگئے اور وہ بوڑھا ہوگیا تو اس کے پیش کردہ کلام کی وجہ سے تم اسے جادوگر کہتے ہو۔ ہم جادوگروں کو اور ان کی جھاڑ پھونک کو خوب جانتے ہیں۔ خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں ہے۔ [۱]

شاہ ہرقل کو آپ کے دعوی رسالت کا علم ہوا تو اس نے چاہا کہ آپ کے بارے میں بعض معلومات حاصل کرے۔ اسی دوران میں اسے اطلاع ملی کہ قریش کے چند تاجر شام آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس نے انہیں اپنے دربار میں بلوایا اور کہا کہ تمہارے شہر میں جس شخص نے خدا کا رسول ہونے کا دعوٰی کیا ہے، تم میں اس کا قریبی رشتہ دار کون ہے؟ حضرت سفیانؓ نے جواب دیا کہ وہ میرے خاندان کا ہے اس کے بعد ہرقل نے ابوسفیانؓ سے آپ کے متعلق چند سوالات کیے ان میں سے ایک یہ تھا:۔

بتاؤ اس دعوے سے پہلے کبھی اس پر دروغ گوئی کا الزام لگا ہے؟

ابوسفیانؓ نے جواب دیا کہ نہیں۔

یہ سن کر ہرقل نے کہا کہ جس شخص نے کسی انسان کے معاملے میں کبھی جھوٹ نہ کہا ہو، یقین نہیں آتا کہ وہ خدا کی طرف اتنا بڑا جھوٹ کیسے منسوب کردے گا؟

شاید آپ کہیں گے کہ حضرت سفیانؓ مسلمان تھے اس لیے ان کی شہادت کا اعتبار رہی کیا؟ لیکن

---

[۱] سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۳۱۹۔

میں آپ کو بتاؤں کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ ابو سفیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور آپؐ کے مخالفین کی قیادت کر رہے تھے۔ خود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ہرقل کے دربار میں جو قریشی بیٹھے ہیں وہ مجھے جھوٹا مشہور کر دیں گے تو میں اس موقع پر غلط بیانی سے کام لیتا۔[1]

یقین کامل

سچائی یقین کا سرچشمہ ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا ایک زبردست ثبوت آپ کا وہ بے پناہ یقین ہے جو آپ کو اپنے دعوے پر حاصل تھا۔ سچا انسان واقعات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے اس لیے وہ پورے یقین کے ساتھ بول سکتا ہے لیکن جھوٹا شخص تذبذب اور بے یقینی کا شکار رہتا ہے کیونکہ وہ واقعات کو چھپاتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل تیئس سال تک اپنے دعویٰ رسالت پر قائم رہے، لیکن کبھی بھی آپ کی زبان سے یا آپ کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوا کہ آپ کو اپنے رسول ہونے میں کوئی شک یا تردد ہے۔ جھوٹا شخص عزم و ارادے کی قوت سے خالی ہوتا ہے۔ وہ مشکلات میں اپنے مقام پر جم نہیں سکتا۔ آزمائشیں اس کے چہرے سے جھوٹ کی نقاب اتار دیتی ہیں اور وہ دنیا کے سامنے بالکل ننگا ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ نازک ترین مواقع پر بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس یقین میں بال برابر فرق نہیں آتا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔

آپ نے رسالت کا اعلان کیا تو آپ کی قوم جو آپ کو امین کہتی تھی آپ کی دشمن بن گئی۔ آپ کے چچا ابو طالب گو مسلمان نہیں تھے لیکن آپ کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ قریش کے ذمہ داروں نے سمجھا کہ آپ کا جوشِ دعوت اور زور تحریک ابو طالب کے دم سے ہے اگر وہ آپ کو تنہا چھوڑ دیں تو یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے ابو طالب سے کہا کہ آپ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کام سے باز رکھیے یا آئیے کہ میدان جنگ میں ہمارا اور آپ کا فیصلہ ہو جائے۔ قوم کی اس دھمکی سے حضرت ابو طالب وقتی طور پر ہی سہی متاثر ضرور ہوئے۔ انہوں نے آپ سے کہا بیٹے میرے حال پر اور خود اپنی ذات پر رحم کھاؤ۔ مجھ پر اتنا بار نہ ڈال دو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔" یہ سنتے ہی آپؐ سمجھ گئے کہ اب ابو طالب آپؐ کی حمایت سے دست کش ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی۔ حالات کی نزاکت کا تصور کیجیے اور پھر ان الفاظ پر غور کیجیے جو اس وقت آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب سے

---

[1] بخاری، کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کہے تھے۔ "چچا جان! خدا کی قسم اگر میرے مخالفین میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں اور چاہیں کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں تو بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ یا تو خدا اسے غالب کرے گا یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں گا۔"[1]

دنیا کے اصحابِ عزیمت نے اپنے عزم وارادہ کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے لیکن شاید اظہار عزیمت کے لیے ان سے زیادہ زوردار الفاظ تاریخ نے کبھی نہیں سنے۔ یقین کا یہ مقام اس عالم میں اسی شخص کو ملتا ہے جس کی زبان سے سچائی بول رہی ہو۔ جھوٹ ایک جرم ہے اس لیے جھوٹا شخص ہمیشہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے اندر اقدام کا حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر وقت اپنی مدافعت کی فکر رہتی ہے۔ لیکن سچائی کی فطرت ہے کہ کھلے اور غالب آجائے وہ پردوں میں نہیں رہ سکتی بلکہ ہر آن اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہوتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر ایک سچے انسان کی طرح یقین کا ایسا طوفان برپا تھا جو مزاحمتوں کو توڑ کر ساری دنیا پر چھا جانا چاہتا ہے۔ آپ اپنی قوم کے بارے میں، جس سے آپ کی جنگ جاری تھی، فرماتے ہیں:

ارید منهم کلمة تدین	میں قریش سے ایک ایسے کلمہ پر ایمان لانے کا مطالبہ
لهم بها العرب وتؤدی الیهم	کر رہا ہوں کہ اگر وہ اس پر ایمان لے آئے تو سارا
العجم الجزیة۔[2]	عرب اس کا تابع ہو جائے اور عجم اسے جزیہ دینے لگے۔

خدا کی طرف بلانے کے جرم میں آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں۔ بے بسی اور مظلومیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی شخص اس کے ختم ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن آپ پورے یقین کے ساتھ صحابہ سے فرماتے ہیں کہ صبر کرو ان حالات میں لازماً انقلاب آنے والا ہے۔

واللہِ لیتمن هذا الامر حتیٰ	خدا کی قسم یہ دین غالب آکر رہے گا ظلم مٹ جائے گا
یسیر الراکب من صنعاء الی حضر	اور سارے عرب میں اس حد تک امن وامان ہو گا کہ
موت لا یخاف الا اللہ اوالذئب	ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک تنہا سفر کرے گا
علیٰ غنمه ولٰکنکم تستعجلون۔[3]	اور اسے سوائے خدا کے خوف کے یا اپنی بکریوں کے

سلسلے میں بھیڑیے کے خطرے کے اور کوئی خوف نہ ہو گا۔ لیکن تم لوگ ہو کہ جلدی کر رہے ہو۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ا ص ۲۷۸-۲۷۶۔ [2] ترمذی ابواب التفسیر (سورہ ص)۔ [3] بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

عدی بن حاتم رضؓ آپ کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک شخص آیا اور فقر وفاقہ کی شکایت کرنے لگا۔ اتنے میں دوسرا شخص پہنچا اور شکوہ کیا کہ راستہ غیر محفوظ ہے اور ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی ہے۔ حالات کے اس بگاڑ اور ابتری کو سن کر نہ آپ گھبراتے ہیں اور نہ مایوس ہوتے ہیں بلکہ خاص پیغمبرانہ وثوق کے ساتھ عدی بن حاتم سے کہتے ہیں کہ یہ حالات باقی نہیں رہ سکتے۔ لازماً انہیں بدلنا ہے اور وہ بدل کر رہیں گے۔ آپؐ نے فرمایا "عدی! تم (عراق کے شہر) حیرہ سے واقف ہو گے؟ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ ایک بڑھیا حیرہ سے چلے گی اور کعبہ کا طواف کر کے لوٹ جائے گی۔ سوائے خدا کے خوف کے اور کسی کا خوف اسے نہ ہوگا۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ اگر تمہاری زندگی رہی تو دیکھو گے کہ آدمی اپنا ہاتھ بھر کر سونا چاندی لے کر نکلے گا تا کہ کسی محتاج کو دے لیکن اسے کوئی محتاج نہ ملے گا۔[1]

تاریخ گواہ ہے کہ یہ کسی جھوٹے انسان کی یقین دہانیاں نہیں تھیں بلکہ خدا کے پیغمبر کی پیشین گوئیاں تھیں جو بعد میں لفظ بلفظ پوری ہوئیں۔ اس پہلو سے ہم انہیں معجزات بھی کہہ سکتے ہیں جو آپ کی رسالت پر دلالت کرتے ہیں۔

جنگِ اُحد میں مسلمانوں کو فتح کے بعد شکست کھانی پڑی۔ ستر مسلمان شہید اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہو گئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت آپ کی شہادت کی افواہ بھی پھیل گئی جس کی وجہ سے بہت سے مسلمان ہمت ہار کر بیٹھ گئے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے اس یقین نے شکست نہ مانی کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور خدا کی مدد آپ کے ساتھ ہے۔ جب مشرکین نے جنگ کا نقشہ دیکھا تو ان کے قائد ابو سفیان نے بتوں کے نعرے لگانے شروع کر دیے اس پر آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم انہیں بتا دو کہ ہم بے یار و مددگار نہیں ہیں "اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَ لَا مَوْلٰی لَکُمْ" ہمارا سرپرست خدا ہے اور تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے۔[2]

اسی طرح جنگِ حنین میں قبیلہ ہوازن کا حملہ اتنا سخت ہوا کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ لیکن آپ اس اعلان کے ساتھ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے کہ "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ" میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ یہ سچا دعویٰ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔[3]

خدا سے مثالی تعلق

خدا سے آپ کا بہت ہی گہرا تعلق تھا۔ یہ آپ کے رسول ہونے کی ایک دلیل ہے۔

---

[1] حوالہ سابق۔ [2] بخاری، کتاب المغازی۔ [3] بخاری، کتاب المغازی۔

کیونکہ جو شخص خدا کا رسول ہوگا لازماً خدا سے اس کا رشتہ مضبوط ہوگا۔ انسان کے حقیقی اوصاف کبھی چھپائے نہیں چھپتے، اور غیر حقیقی اوصاف کبھی اتنے نمایاں نہیں ہوتے کہ دوسرے فوراً انہیں دیکھنے اور محسوس کرنے لگے خدا سے آپ کا تعلق اس قدر نمایاں تھا کہ جو بھی شخص آپ سے قریب ہوتا وہ اسے پوری شدت سے محسوس کرنے لگتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جذبات انسان کے اندر سے اُبلتے ہیں وہ اس کی پوری سیرت پر چھا جاتے ہیں۔ اور جن جذبات کے لیے انسان کے اندرون میں کوئی تحریک نہیں ہوتی وہ بہ تکلف ابھرتے ہیں اور بآسانی دب بھی جاتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خدا کی یاد کوئی مصنوعی چیز نہیں تھی بلکہ وہ آپ کے باطن میں اتری ہوئی تھی۔ آپ کی روح اس احساس سے سرشار تھی کہ خدا آپ کا حاکم اور معبود ہے۔ آپ کا سر نیاز اسی کے سامنے جھکتا، آپ اسی کو موت وحیات اور تکلیف وراحت کا مالک سمجھتے اسی سے دعائیں مانگتے اور الحاح وزاری کرتے، آسائش میں اسی کے شکر گزار ہوتے اور مصیبت میں اسی سے مدد طلب کرتے، کیا خدا سے اس مثالی تعلق کو کوئی معقول انسان فریب کہہ سکتا ہے؟ اگر دنیا کو فریب دینے کے لیے آپ نے خدا سے تعلق کا دعویٰ کیا تھا تو ناممکن تھا کہ اس طرح قدم قدم پر اس کا مظاہرہ ہوتا، یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ کسی جھوٹے تعلق کی اتنی زبردست حکومت اس پر قائم ہو جائے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس سے آزاد نہ رہنے پائے۔ آپ نے اپنے رنج وراحت، خوف واطمینان، مرض وصحت غرض ہر حال میں خدا کی ذات سے جس مضبوط تعلق کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی صداقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

حضرت ابوطالب کی وفات کے بعد مکے میں آپ کی مخالفت اپنی آخری حد کو پہنچ گئی تو آپ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے سرداروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کی لیکن انہوں نے مکہ والوں سے بھی زیادہ بُرا سلوک کیا۔ ان کے اشارے پر طائف کے غنڈوں نے آپ کو اتنا ستایا کہ آپ ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت آپ نے اپنے خدا سے ان الفاظ میں فریاد کی:۔

"اے اللہ میں اپنے ضعف وناتوانی، اپنی کم تدبیری اور لوگوں کے نزدیک اپنی سبکی کی تجھ سے شکایت کرتا ہوں۔ اے سب سے بڑے مہربان! کمزوروں کا سہارا تو ہی تو ہے۔ اے میرے رب! مجھے کس کے حوالے کرتا ہے؟ کسی غیر کے حوالے، جو میرے ساتھ بد خلقی سے پیش آئے؟ کیا کسی دشمن کو میرے معاملات سونپ رہا ہے؟ اگر تو مجھ سے خوش ہے اور مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی بھی چیز کی پروا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں ہر حال میں تیری عافیت کا طالب ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے چہرے

کے نور کے ذریعہ، جس سے ظلمتیں چمک اٹھتی ہیں اور جس سے دنیا و آخرت کے معاملات سنور جاتے ہیں، اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ مجھ پر تیرا غضب نازل ہو اور تو مجھ سے ناخوش ہو جائے۔ اے اللہ! مجھے تجھ ہی کو خوش کرنا ہے تا آنکہ تو خوش ہو جائے۔ گناہ سے بچنے کی طاقت اور اطاعت و بندگی کی قوت کا خزانہ تیرے ہاتھ میں ہے، اور یہ اسی کو ملتا ہے جسے تو نوازے"۔[1]

انسان اپنی مصیبتوں میں کسی حقیقی سہارے کو تلاش کرتا ہے۔ جس شخص کا دل صحیح معنی میں خدا سے لگا ہوا نہ ہو اس کے اندر خدا کے بارے میں اتنے گہرے جذبات نہیں ہو سکتے اور وہ مصیبت کے وقت خدا کو اس طرح پکار نہیں سکتا۔

ایک مرتبہ جنگل میں آپ اپنی تلوار درخت میں لٹکا کر اس کے نیچے تنہا سو رہے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کے بعد آپ کو جگایا اور سوال کیا بتاؤ اب تمہیں کون بچائے گا؟ آپ نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا "اللہ" اس لفظ کے سنتے ہی اس نے تلوار نیام میں رکھ دی اور خاموش بیٹھ گیا۔[2]

یہ اس بات کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ آپ خدا کو اور صرف خدا کو موت و حیات کا مالک سمجھتے تھے، دشمن کی ننگی تلوار آپ کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہی تھی، اس کے باوجود آپ نے خدا پر اپنے اعتماد کا ایسا ثبوت پیش کیا کہ کسی بھی دلیل سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے اس اعتماد کو غیر حقیقی کہنا انسان کی نفسیات کو جھٹلانا ہے۔ دشمن کی تلوار میں وہ زور اور قوت نہیں ہے جو آپ کے اس لفظ "اللہ" میں موجود ہے۔ تلوار چوک سکتی ہے لیکن اُس یقین کی کاٹ سے دشمن بچ نہیں سکتا جو اس ایک لفظ سے ابل رہا ہے۔ اس کے زبان سے نکلتے ہی وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے اور میں لوہے کے ٹکڑے سے سچائی کا مقابلہ کر رہا ہوں۔

حضرت حذیفہ رض کی روایت ہے:۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا   نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی لاحق

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۰-۲۹۔ [2] بخاری، کتاب الجہاد، باب من علق سیفہ بالشجر فی السفر عند القائلہ مسلم، کتاب الفضائل باب توکلہ علی اللہ تعالیٰ وعصمۃ اللہ تعالیٰ من الناس۔

ہوتی یا کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو نماز پڑھتے۔ حزبہ امر صلّٰی[1]

جو شخص پریشانی میں خدا کی طرف لپکے اور اس کے دربار میں ہاتھ پھیلا دے، ہم کس دلیل سے اس کے تعلق باللہ کو جھوٹ اور تصنع قرار دیں؟ یہ کتنی بڑی بدگمانی ہے کہ ہم خدا سے اس انسان کے تعلق کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کریں جو اسے اپنی آخری پناہ سمجھتا ہے اور اپنی تمام توقعات اسی سے وابستہ کیے ہوئے ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے عمل سے تعلق باللہ کا ایسا ثبوت فراہم کیا ہے کہ اس کا انکار ہٹ دھرمی سے تو ہو سکتا ہے لیکن کسی دلیل سے ممکن نہیں ہے۔

آدمی غیروں سے اپنی شخصیت کو پوشیدہ رکھ سکتا ہے لیکن اس کے حقیقی جذبات، بیوی بچوں اور بے تکلف صحبتوں میں چھپے نہیں رہ سکتے۔ آپؐ کی بیوی حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے آپ کو بستر پر نہیں دیکھا تو خیال ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری بیوی کے گھر ہوں گے، لیکن میں نے دیکھا کہ آپ رکوع یا سجدے کی حالت میں ہیں اور خدا کی حمد و ثنا کر رہے ہیں:

سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ۔ — میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور اس کے لیے تیری تعریف کرتا ہوں۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

یہ الفاظ سنتے ہی حضرت عائشہؓ نے کہا "میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں کس خیال میں تھی اور آپ کس عالم میں ہیں؟"[2]

حضرت عائشہؓ ایک دوسری شب کا حال بیان کرتی ہیں کہ میں نے آپ کو بستر سے غائب پا کر اندھیرے میں اِدھر اُدھر تلاش کیا تو میرا ہاتھ قدم مبارک سے چھو گیا۔ آپ سجدے میں تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا أُحْصِيْ — خدایا! میں تیری رضا کے ذریعہ تیرے غضب سے اور تیرے عفو و کرم کے ذریعہ تیرے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور خود تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں

---

[1] مسند احمد جلد ۵ ص۳۸۸، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب وقت قیام النبیؐ من اللیل۔ [2] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود۔

ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ [1] — میں تیری حمد و ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ تو بالکل ایسا ہے جیسا کہ خود تو نے اپنی تعریف میں کہا ہے۔

رات کی تنہائی ہے اور ایک شخص خدا کے حضور سجدے میں سر رکھے پڑا ہے، اس کی عظمت و تقدیس کا اعتراف کر رہا ہے، اس سے درد بھرے انداز میں التجائیں کر رہا ہے اور اس سے اپنی مغفرت کا طالب ہے۔ بتائیے کہ اسے ہم کس زبان سے خدا پر جھوٹ باندھنے والا کہیں؟ اگر وہ بھی جھوٹا ہے تو کسی کی صداقت کو جانچنے کا آخر کیا معیار قرار دیا جا سکتا ہے؟

عبداللہ بن شخیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینے سے آہ وزاری اور خوف و خشیت کی آواز اس طرح نکل رہی تھی جیسے چولھے پر ہانڈی کھول رہی ہو، یا چکی چل رہی ہو [2]

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے:

ان کان النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتنی لمبی نماز پڑھتے تھے کہ آپ کے
وسلم لیقوم حتی ترم قدماہ	پیر ورم کر جاتے۔ جب آپ سے کہا جاتا کہ آپ
اوساقاہ فیقال لہ فیقول افلا	اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں تو جواب دیتے
اکون عبداً شکوراً [3]	کہ کیا میں خدا کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔

خدا کے بارے میں اس شخص کے احساسات کے صحیح ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ جو خدا کے روبرو اس حال میں کھڑا ہو کہ اس کے خوف سے کانپ رہا ہو اور جس پر خدا کے انعامات کا احساس اس قدر غالب ہو کہ عبادت کرتے کرتے پیروں میں ورم آجائے لیکن اس کے باوجود وہ قصورِ شکر کا اعتراف کرے کہ ابھی حقِ نعمت ادا نہیں ہوا ہے۔

عملی نمونہ چھوٹے شخص کی پہچان یہ ہے کہ اس میں نفاق کا مرض ہوتا ہے۔ اس کے پاس عمل کی پونجی نہیں ہوتی بلکہ صرف کھوکھلے دعوے ہوتے ہیں۔ وہ اس بات کی کوشش

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود۔ [2] نسائی، کتاب الافتتاح ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ باب البکاء فی الصلوٰۃ۔ [3] بخاری، کتاب التہجد، باب قیام النبیؐ حتی ترم قدماہ۔

کرتا ہے کہ الفاظ کے جادو سے دنیا فریب کھا جائے، مگر ایک نفسیات شناس اس کی باتوں میں اس کے دل کی کھوٹ کا بآسانی پتہ چلا سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل میں کامل یکسانیت ہے۔ آپ ٹھیک اس طرف چل رہے تھے جس طرف دنیا کو بلا رہے تھے۔ آپ نے انسانوں سے جو کچھ کہا وہ آپ کے کردار میں موجود تھا۔ آپ نے خدا کا دین دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ خود اس کا عملی نمونہ بن گئے۔ کسی نے آج تک یہ کہنے کی جرأت نہیں کی کہ آپ کے قول و عمل میں تضاد ہے اور آپ کے عمل سے آپ کی باتوں کی تردید ہوتی ہے۔ خدا کے بارے میں اگر آپ کا علم سب سے زیادہ تھا تو آپ سب سے زیادہ خدا ترس بھی تھے۔ آپ فرماتے ہیں:-

وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاَعْلَمُھُمْ بِاللّٰہِ	قسم خدا کی میں سب سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اور
وَاَشَدُّھُمْ لَہٗ خَشْیَۃً۔[1]	سب سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں۔

سعد بن ہشام نے حضرت عائشہؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ کیا تم قرآن نہیں پڑھتے ؟ آپ کا اخلاق تو بعینہٖ قرآن تھا[2] مطلب یہ کہ قرآن کو دیکھ کر تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے اخلاق کیا تھے۔ قرآن اور آپؐ کی زندگی دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ جو چیز تمہیں قرآن میں ملے گی، وہی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں جلوہ گر تھی۔

انسانیت کی خیر خواہی

آپ انسانیت کے بہت بڑے خیر خواہ تھے۔ آپ نے کسی کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا۔ کسی سے بدعہدی نہیں کی، کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی کا خون نہیں کیا، کسی کا مال نہیں کھایا۔ غرض یہ کہ آپ سے کسی بھی شخص کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ بلکہ ہمیشہ آپ ہر ایک کی کامیابی کی فکر میں رہے۔ آپ نے مکے سے ہجرت کی تو آپ کے کسی بھی مخالف کو اس کا علم نہیں ہو سکا لیکن جاتے ہوئے آپ نے اس دشمن قوم کی امانتوں کو جو صحیح معنوں میں آپ کے خون کی پیاسی تھی، حضرت علیؓ کے حوالے کر دیا تا کہ جن لوگوں کی یہ امانتیں ہیں وہ انہیں پہنچا دیں۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جس قوم نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا، جو قدم قدم پر آپ سے

---

[1] مشکوٰۃ، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہ بخاری ومسلم۔

[2] رواہ مسلم وابوداؤد (کتاب الصلوٰۃ، باب فی صلوٰۃ اللیل)

لڑتی رہی اور جس نے آپ کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا وہ اپنی زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے اس بات کا اعتراف کر رہی ہے کہ یہ شخص دیانت دار ہے۔ یہ کسی کو فریب نہیں دے سکتا۔

لَيْسَ بِمَكَّةَ اَحَدٌ عِنْدَهُ شَيْءٌ يَخْشٰى عَلَيْهِ اِلَّا وَضَعَهُ عِنْدَهُ لِمَا يَعْلَمُ مِنْ صِدْقِهٖ وَ اَمَانَتِهٖ[۱]

مکے میں جس کسی کے پاس بھی کوئی ایسی چیز ہوتی جس کے بارے میں اسے کسی قسم کا اندیشہ ہوتا تو اسے وہ آپ کے پاس رکھ دیتا، کیونکہ ہر ایک آپ کی سچائی اور امانت سے واقف تھا۔

ہجرت کے دس سال بعد مکہ فتح ہوا تو آپ کے دشمن دست بستہ آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ آپ اگر چاہتے تو ان سے چن چن کر انتقام لیتے۔ لیکن آپ نے ان سے پوچھا "یامعشر قریش ماترون انی فاعل فیکم"، قریش کے لوگو! بتاؤ اب میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں۔ اس لیے آپ سے اچھے سلوک ہی کی توقع ہے۔ آپ نے فرمایا "اذهبوا فانتم الطُّلقاء" جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو۔[۲]

آپ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ سے فرمایا: لقد لقيت من قومك ما لقيت وكان اشد ما لقيت منهم يوم العقبة (مجھے تمہاری قوم سے جو سخت سے سخت تکلیفیں پہنچیں وہ تو پہونچی ہی تھیں لیکن ان میں سب سے زیادہ سخت تکلیف دہ تھی جو (عقبہ (طائف) کے دن پہنچی) انسانیت کے ساتھ خیرخواہی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے اس دن بھی طائف والوں کے حق میں دعا فرمائی کہ خدایا تو انہیں ہلاک نہ کر دے، گو کہ وہ تیرے دین کو قبول نہیں کر رہے ہیں لیکن شاید کہ ان کی اولاد تجھے ایک مانے اور تیری بندگی کرے۔[۳]

ایک شخص نے دعا کی "اے اللہ! تو مجھ پر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحم فرما اور ہمارے ساتھ کسی تیسرے کو اپنی رحمت میں شریک نہ کر"، اس کی یہ دعا آپ کو ناگوار گزری، آپ نے فرمایا کہ خدا کی رحمت وسیع ہے تم نے اسے محدود کر دیا ہے۔[۴]

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۹۸۔ ۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۴ ص ۳۲۔ ۳۔ بخاری، کتاب بدءالخلق باب اذ قال احدکم آمین الخ۔ ۴۔ بخاری کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبہائم۔

آپ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں" اے اللہ! میں نے تجھ سے ایک وعدہ لیا ہے (مجھے یقین ہے کہ) تو کبھی اس کے خلاف نہیں کرے گا۔ وہ یہ کہ میں انسان ہوں۔ اس لیے بتقاضائے بشریت میں نے جس مسلمان کو بھی تکلیف دی، یا بُرا بھلا کہا، یا لعنت کی یا مارا ہے تو میری اس حرکت کو اس کے حق میں رحمت بنا دے، اس سے اس کے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے روز اسے اپنی قربت کا ذریعہ بنا لے جس کی وجہ سے تو اس بندۂ مسلم کو اپنے سے قریب کر لے[1]

غور کیجیے! جس شخص نے کبھی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں کسی کو دھوکا نہ دیا ہو، اس کے بارے میں ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ وہ خدا کے بارے میں دنیا کو فریب دے گا؟ جس نے موقع پانے کے باوجود اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا ہو اس کے بارے میں ہم کیسے باور کر سکتے ہیں کہ وہ ایسا بے حقیقت فتنہ کھڑا کر دے گا کہ جس میں دشمنوں ہی کے جان و مال کا نہیں بلکہ دوستوں کے جان و مال کا بھی عظیم نقصان ہو؟ جس نے اپنے مخالفین کی امانتوں میں خیانت نہ کی ہو اس کے بارے میں ہم کیسے مان لیں کہ وہ انسانیت کے ساتھ اتنی بڑی بے وفائی کرے گا کہ لوگ اس پر خدا کے معاملے میں اعتماد کریں اور وہ انہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دے؟ جس نے دعائیں کی ہوں کہ انسانوں کے ساتھ اس کی سخت کلامی بھی خدا سے ان کے تقرب کا ذریعہ بن جائے اور جسے یہ بات بھی ناگوار گزرے کہ خدا کی رحمت تنہا اس کے حصے میں آئے اس کے بارے میں ہم کیسے تصور کریں کہ وہ ضلالت کا علم بردار ہوگا اور انسانوں کو خدا سے دور کر دے گا؟ یہی بات شاہ ہرقل نے ابوسفیانؓ سے کہی تھی۔ اس نے آپ سے پوچھا:-

بتاؤ کیا اس مدعی رسالت نے کبھی کسی کو دھوکا دیا ہے؟

ابوسفیانؓ نے جواب دیا" ابھی تک دھوکا نہیں دیا ہے۔ آئندہ کا حال ہم نہیں جانتے۔"

یہ سن کر ہرقل نے کہا۔ تمہارا جواب ظاہر کرتا ہے کہ وہ واقعتاً خدا کا پیغمبر ہے کیونکہ پیغمبروں کی نشانی یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتے[2]

نام و نمود سے بیزاری

شہرت کی بھوک بہت سخت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انسان بڑی بڑی قربانیاں دیتا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو ہم اس

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح کتاب الدعوات، بحوالہ بخاری و مسلم۔ [2] بخاری، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ۔

دھبے سے پاک دیکھتے ہیں۔ کم ظرف انسان جب دوسروں کی بھلائی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام دیتا ہے تو اسے یہ خواہش ہونے لگتی ہے کہ ہر طرف اس کی عظمت کے قصیدے پڑھے جائیں، اس کی یادگاریں قائم ہوں لوگ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں اور اس کی تعظیم بجالائیں، اس کی تصویریں شائع ہوں اور دنیا انہیں احترام کی نظر سے دیکھے۔ اس کے مقابلے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپ نے دنیا کو باطل سے حق کی طرف موڑ دیا اور شیطان کے تخت کو الٹ کر خدا کی حکومت قائم کر دی لیکن اس کے باوجود آپ کبھی شہرت اور نام آوری کے طالب نہیں ہوئے۔ آپ کے غیر معمولی کارناموں کو دیکھ کر انسان سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ شخص سطح انسانیت سے بلند ہے اور مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ہے۔ لیکن آپ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ صحابہ کی زبان سے کبھی کبھی اس طرح کے جملے نکل جاتے تھے کہ ہوگا وہی جو خدا اور خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں گے۔ آپ نے فرمایا یہ صحیح نہیں ہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہتا وہ ہوتا ہے۔[1]

آپ نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ :-

مَیں تم ہی جیسا انسان ہوں۔ تم سے جیسے بھول ہوتی ہے ایسی ہی مجھ سے بھی بھول ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر کبھی بھول جاؤں تو یاد دہانی کر دو۔	اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ اَنْسٰی کَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِیْتُ فَذَکِّرُوْنِیْ[2]

آپ نے اس جذبہ کی سخت مخالفت کی کہ انسان دوسروں سے داد کا طالب ہو اور انہیں اپنا محکوم سمجھے۔ آپ کا ارشاد ہے "جو شخص چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوں تو وہ جہنم کو اپنا ٹھکانا بنائے"[3] اس کے ساتھ آپ نے اپنے عمل سے دنیا کو مساوات کا درس دیا۔ چنانچہ جب کبھی آپ دیکھتے کہ لوگ آپ کی تعظیم میں حد سے آگے بڑھ رہے ہیں تو سختی سے منع کر دیتے۔ ایک مرتبہ آپؐ تشریف لائے تو صحابہ کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا "لوگوں کی تعظیم میں کھڑا ہونا عجم کا طریقہ ہے تم اس کی پیروی نہ کرو"[4]

بنو عامر کا وفد آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ آپ ہمارے سردار ہیں۔ آپ نے فرمایا، سردار تو اللہ ہے۔ میں سردار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا آپ ہم میں سب سے افضل ہیں اور آپ کا مقام سب سے

---

[1] مسند احمد جلد ۵ ص۷۲۔ [2] بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ۔ التوجہ نحو القبلۃ حیث کان۔ [3] ابو داؤد، کتاب الادب، باب الرجل یقوم للرجل یعظمہ بذالک۔ [4] حوالہ سابق

اونچا ہے۔ آپؐ نے فرمایا "جو بات صحیح ہے وہی کہو اور غلط باتیں چھوڑ دو۔ اس کا خیال رکھو کہ کسی کی تعریف میں شیطان حد سے آگے نہ پہنچا دے[۱]

آپؐ فرماتے ہیں:-

لا تطرونی کما اطرء عیسیٰ بن مریم وقولوا عبد اللہ ورسولہ[۲]	میری تعریف میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح عیسیٰ بن مریم کی تعریف میں ان کے ماننے والوں نے

مبالغہ کیا اور انہیں خدا بنا ڈالا۔ میرے بارے میں بس یہ کہو کہ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔

قیس بن سعدؓ نے آپ سے کہا کہ میں نے عراق میں دیکھا ہے کہ لوگ اپنے بڑوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں تو کیوں نہ ہم آپ کو سجدہ کریں، جب کہ آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم میری قبر پر سے گزرو گے تو اسے بھی سجدہ کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا نہیں۔ آپ نے کہا تو تمہیں چاہیے کہ میری زندگی میں بھی مجھے سجدہ نہ کرو[۳] مطلب یہ کہ سجدہ تو اس ذات کا ہونا چاہیے جو حی وقیوم ہے۔ فانی انسان اس قابل نہیں ہے کہ اسے سجدہ کیا جائے۔

آپؐ نے اپنی امت کو نصیحت کی "لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا" (میری قبر پر میلہ نہ لگاؤ[۴])

یہ چند واقعات ہیں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ جس کسی نے بھی آپ کے حالات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ کہنے کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا کہ آپ نے شہرت اور نام آوری کے لیے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ سوچیے! دنیا اس شخص کو کیسے جاہ طلب اور عزت وشہرت کا خواہاں کہے گی جو انسان کی اس توہین کو برداشت نہ کرے کہ اس کا سر خدا کے سوا کسی اور کے آگے جھکے؟ جس کی بے نفسی کا یہ عالم ہو کہ لوگ اسے سجدہ کرنے کی اجازت چاہیں اور وہ اجازت نہ دے، جو اپنے ساتھیوں کو اس سے بھی منع کرے کہ اس کی آمد پر کھڑے ہوں اور جس کی نصیحت ہو کہ میری تعریف وتوصیف میں مبالغہ نہ کیا جائے کہ یہ گمراہ قوموں کی علامت ہے اور جو خدا سے دعا کرے "اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِیْ وَثَنًا" (اے اللہ میری قبر کو بت نہ بننے

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی کراہیۃ التمادح۔ [۲] بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین الخ باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت۔ [۳] رواہ ابوداؤد ورواہ احمد عن معاذ بن جبل (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح باب عشرۃ النساء وما لکل واحد من الحقوق) [۴] ابوداؤد، کتاب المناسک، باب زیارۃ القبور۔ مسند احمد جلد ۲ صـ ۲۴۲

دے کر لوگ اس کو پوجنے لگیں[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بے غرضی اور بے نفسی اسی سینے میں پرورش پا سکتی ہے جو سچائی سے معمور ہو۔ جھوٹا شخص کبھی نام و نمود سے بے نیاز اور مخلص نہیں ہو سکتا۔

دنیا سے بے رغبتی

آپ دنیا دار نہیں تھے۔ آپ کی زندگی بے حد سادہ اور عیش و عشرت سے خالی تھی۔ آپ پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ دعویٰ رسالت کے ذریعہ آپ مال و دولت حاصل کرنا چاہتے تھے یا حکومت و ریاست اور عہدہ و منصب کے خواہاں تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ آپ نے رسالت کے نام پر قوم سے سرمایہ فراہم نہیں کیا بلکہ اپنی تمام دولت اس راہ میں لٹا دی منصبِ رسالت سے پہلے آپ مکے کے ایک کامیاب تاجر تھے اور آپ کے نکاح میں حضرت خدیجہ رضؓ جیسی عرب کی دولت مند بیوی تھیں، لیکن رسالت کی ذمہ داریوں نے آپ کی تجارت اور حضرت خدیجہ کی دولت دونوں کو ختم کر کے رکھ دیا اور آپ کو اس سلسلے میں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں کہ ان کے بیان کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ آپ فرماتے ہیں: "مجھے خدا کی راہ میں اس قدر ڈرایا اور ستایا کہ کسی کو اتنا ڈرایا اور ستایا نہیں گیا۔ مجھ پر تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلال رضؓ کے لیے کھانے کی کوئی ایسی چیز، جسے کوئی جاندار اپنی غذا بنا سکے، بس اتنی مقدار میں ہوتی کہ بلال اسے اپنی بغل میں چھپا لیتے۔[2]"

آپ نے یہ قربانیاں اس لیے پیش کیں تاکہ خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچ جائے۔ ورنہ آپ چاہتے تو دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اپنے لیے جمع کر سکتے تھے۔ آپ کو اپنی دعوت سے باز رکھنے کے لیے قریش کی طرف سے عتبہ یہ پیش کش لے کر آپ کی خدمت میں پہنچا کہ "بھتیجے! اگر اس دعوت کے ذریعہ تم مال و دولت چاہتے ہو تو ہم اتنا مال جمع کر دیں کہ تم سب سے بڑے مالدار بن جاؤ۔ اگر اس سے سرداری مطلوب ہے تو آؤ ہم تمہیں اپنا سردار مان لیں اور تمہارے فیصلے کے بغیر کوئی کام انجام نہ دیں۔ اگر سلطنت کی خواہش ہے تو ہم تیار ہیں کہ تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں۔ لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور تم اپنے اندر جنون کی کیفیت پاتے ہو اور تمہیں ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جنہیں تم دور نہیں کر سکتے ہو تو بخوشی ہم تمہارا علاج بھی کرا سکتے ہیں۔"

عتبہ کی یہ تقریر آپ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی چند آیتیں اسے

---

[1] مسند احمد جلد ۲ ص ۲۴۲۔ [2] ترمذی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق، باب فضل الفقراء)

سنائیں اور فرمایا "یہ ہے میرا جواب، اب تم جانو اور تمہارا کام"[۱] اس طرح آپ نے اپنی دعوت اس کے سامنے پیش کر دی تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ آپ کا مقصد کیا ہے اور آپ دنیا سے کیا چاہتے ہیں؟

مدینہ میں آپ ایک ریاست کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود صحیح روایات بتاتی ہیں کہ آپ نے ایک فقیر بے نوا کی زندگی گزاری۔

حضرت عمرؓ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ آپ بغیر قمیص کے چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور آپ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف تین چمڑے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک کونے میں کچھ چھال اور دوسرے کونے میں قریب قریب ایک صاع جو ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار رو پڑا۔ آپؐ نے پوچھا روتے کیوں ہو؟ میں نے عرض کیا۔ قیصر و کسریٰ کو تو دنیا کی دولت حاصل ہے اور آپ خدا کے رسول اس حال میں ہیں؟ یہ سنتے ہی آپ بیٹھ گئے اور فرمایا۔ "عمر! آخر تم کس خیال میں ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ ان کو دنیا ملے اور آخرت ہمارے حصے میں آئے؟ خدا نے انہیں اپنی نعمتیں دنیا ہی میں دے دی ہیں اور آخرت کی نعمتوں سے انہیں محروم کر رکھا ہے"[۲]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دو دو مہینے گزر جاتے تھے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے مکانات میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ عروہ نے پوچھا تو آپ لوگ کیسے زندہ رہتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کھجور اور پانی ہماری غذا تھی، اس کے علاوہ بعض انصار دودھ بھی بھیج دیا کرتے تھے[۳]

ان ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے آنے کے بعد کبھی آپ کے گھر والوں نے مسلسل تین دن تک گیہوں کا استعمال نہیں کیا اور اسی حالت میں آپ دنیا سے چلے گئے[۴]

آپ کے خادم خاص حضرت انسؓ فرماتے ہیں، مجھے نہیں معلوم کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی پتلی روٹی دیکھی ہو اور نہ آپ نے اپنی آنکھوں سے بھنا ہوا بکری کا گوشت دیکھا[۵]

---

[۱] سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۳۱۴۔ [۲] بخاری۔ کتاب النکاح، باب موعظة الرجل ابنتہ لحال زوجہا، مسلم، کتاب الطلاق باب بیان ان حیرہ امراتہ لایکون طلاقاً الا بالنیۃ۔ [۳] بخاری، کتاب الھبۃ وفضلہا والتحریص علیہا۔ [۴] بخاری، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبیؐ واصحابہ۔ [۵] حوالہ مذکور۔

ایک مرتبہ چٹائی پر لیٹنے کی وجہ سے جسم مبارک پر نشانات پڑ گئے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے دیکھا تو عرض کیا کہ اگر آپ حکم دیں تو ہم کوئی نرم بستر تیار کر دیں، اور آپ کی آسائش کا خیال کریں۔ آپ نے فرمایا۔ مجھے دنیا سے اور دُنیا کو مجھ سے کیا تعلق؟ یہ دنیا میری منزل نہیں ہے۔ میں یہاں ایک مسافر ہوں مسافر اپنی راہ سفر میں درخت کے نیچے کچھ دیر سایہ حاصل کرتا ہے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جاتا ہے وہ اسے اپنی منزل نہیں بناتا[1]

آپ کی بیوی حضرت حفصہؓ فرماتی ہیں کہ گھر میں ایک کمبل تھا جسے ہم دو تہہ کر کے بچھا دیتے تھے، اسی پر آپ آرام فرماتے۔ ایک مرتبہ خیال ہوا کہ اگر اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا جائے تو آپ کے لیے زیادہ آرام دہ ہوگا۔ چنانچہ میں نے اسے چار تہہ کر کے بچھا دیا تھا۔ آپ نے فرمایا، یہ ٹھیک نہیں ہے جیسے پہلے بچھایا کرتی تھیں اسی طرح بچھا دیا کرو، کیونکہ بستر نرم ہونے کی وجہ سے رات میری نماز تہجد ادا ہونے سے رہ گئی[2]

عتبہ بن حارث کہتے ہیں کہ ایک دن عصر کی نماز کے فوراً بعد آپ غیر معمولی سرعت کے ساتھ مکان میں داخل ہوئے اور پھر باہر تشریف لائے۔ اس سے ہمیں بہت تعجب ہوا تو آپ نے فرمایا کہ گھر میں صدقے کا کچھ سونا رکھا ہوا تھا مجھے یہ بات ناپسند ہوئی کہ وہ رات بھر میرے پاس پڑا رہے، اس لیے میں نے ابھی اسے تقسیم کر دیا[3]

حضرت عائشہؓ مرض الموت کا حال بیان کرتی ہیں کہ آپ نے چھ سات دینار حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لیے مجھے دیے تھے۔ لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ آپ نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے معذرت کی کہ ابھی یہ خدمت انجام نہیں دے سکی ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ان دیناروں کو لاؤ۔ اس کے بعد آپ نے انہیں اپنے ہاتھ میں رکھ کر کہا کہ محمد کا خدا کے بارے میں یہ کتنا گھٹیا تصور ہوگا، اگر وہ خدا سے اس حال میں ملے کہ یہ دنیا اس کے پاس ہو۔ جاؤ انہیں خرچ کر دو[4]

آپ نے اس طرح زندگی گزاری کہ جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنی بیویوں اور اولاد کے لیے

---

[1] احمد، ترمذی، ابن ماجہ (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الرقاق) [2] شمائل الترمذی، باب ما جاء فی فراش رسول اللہؐ۔ [3] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من احب تعجیل الصدقۃ من یومہا۔ [4] مسند احمد جلد ۶، صفحہ ۱۰۴ و ۱۸۲۔

کچھ نہیں چھوڑا، نہ دینار، نہ درہم، نہ بکری، نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی"۔[1]

آپ نے فرمایا "لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ" (میرا تعلق پیغمبروں کے گروہ سے ہے۔ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ خیرات کر دیا جاتا ہے۔)[2]

جس شخص کے سامنے حکومت و ریاست، دولت و ثروت اور حسن و جمال اس شرط پر پیش کیا جائے کہ وہ خدا کا پیغام پہنچانے سے باز آجائے اور وہ اس پیش کش کو بے نیازی سے ٹھکرا دے، اس پر بہت بڑا بہتان لگتا ہے جو کوئی اسے دنیا کا بھوکا کہتا ہے اور اس کے دعوی رسالت کو دنیا کمانے کی تدبیر سمجھتا ہے۔

جس شخص کے پاس اقتدار ہو، حکومت ہو اور جو چاہے تو اپنے لیے عیش و عشرت کی ایک دنیا آباد کر سکتا ہو، اس کے باوجود اس کے گھر دو دو مہینے چولھا نہ جلے، جس کا احساس ہو کہ نرم بستر خدا سے غافل کرنے والی چیز ہے اور جو دنیا کو آرام کی جگہ نہ سمجھے، بڑی ناانصافی ہوگی اگر اس کے بارے میں کہا جائے کہ وہ دنیا کی خاطر نبوت کا دعوٰی کر رہا ہے؟ کیا کوئی دنیا کا چاہنے والا ایسا بھی گزرا ہے جو عیش کے سارے سامان کے باوجود فقر و فاقے کی زندگی گزار دے اور دنیا سے اتنا فائدہ اٹھانا بھی پسند نہ کرے جتنا فائدہ ایک بے حیثیت آدمی اٹھائے جاتا ہے؟

ایسا انسان جس کی موت اس حال میں آئے کہ اس کی زرہ رہن رکھ کر غلّہ حاصل کیا گیا ہو[3] جو نہ صرف اپنے لیے دعا کرے کہ "خدایا تو مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے زمرے میں اٹھا"[4] بلکہ اپنی اولاد کے لیے بھی جس کی دعا ہو کہ "اے اللہ! تو میری اولاد کو قوت لایموت دے[5] اور جو اپنے ذاتی مال میں بھی اپنے گھر والوں کا حصّہ نہ قرار دے، دل کہتا ہے کہ وہ دنیا دار نہیں ہے۔ وہ خاندان اور قبیلے کی خاطر خدا پر تہمت نہیں باندھ سکتا۔

یہ بے غرضی اور اخلاص اور یہ بے مثال قربانیاں ہمارے سامنے سوال بن کر آتی ہیں کہ ایک

---

[1] مسلم، کتاب الوصیۃ، باب ترک الوصیۃ لمن لیس لہ شیٔ یوصی فیہ۔ [2] بخاری، کتاب فرض الخمس۔ مسلم کتاب الجہاد باب حکم الفیٔ۔ [3] بخاری، کتاب الجہاد، باب ماقیل فی درع النبیؐ۔ [4] ترمذی، ابن ماجہ، بیہقی (مشکوٰۃ، کتاب الرقاق۔) [5] بخاری، مسلم (مشکوٰۃ، کتاب الرقاق)

وہ انسان جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے، جو اگر چاہے تو اپنی دنیا بہتر سے بہتر طریقے سے بنا سکتا ہے وہ کیوں عسرت و تنگی برداشت کر رہا ہے؟ عیش و عشرت اس کا استقبال کرتی ہے تو کیوں وہ ٹھکرا دیتا ہے؟ آخر وہ کتنا بلند مقصد ہے جس کے لیے یہ بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں؟ اگر آدمی تعصب کا مارا ہوا نہ ہو اور حق کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے ہوں تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ جو شخص واقعتاً خدا کے لیے نہ کھڑا ہو اس کے اندر یہ بے غرضی اور بے نفسی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ جس وقت اس کے اندر یہ احساس اُبھرے گا اس کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گرویدہ بنا دے گا۔

انقلاب آفریں سیرت

آپ کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں زبردست قوتِ تاثیر تھی۔ چنانچہ بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ جن افراد کو آپ کا فیضِ صحبت نصیب ہوا وہ آپ کے عکسِ کامل بن گئے۔ آپ میں خدا کی یاد، آخرت کا خوف، فنائے نفس اور ایثار و قربانی کے جذبات تھے تو یہ جذبات ان کے اندر بھی ابھر آئے۔ آپ کے اخلاق و سیرت میں پاکیزگی تھی تو ان کے اخلاق و سیرت میں بھی پاکیزگی آگئی۔ حق کے لیے ان کے پاس بے پایاں اخلاص تھا اور باطل کے مقابلے میں ان کے اندر بڑی شدت تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم سے نکل کر یقین کے اس مقام تک پہنچ گئے، جس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے آپ کو رسول مانا اور اس طرح مانا کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ انہیں جس طرح اپنے وجود پر یقین تھا ٹھیک اسی طرح یہ بھی یقین تھا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ ان کے اس یقین سے دنیا نے قدم قدم پر ٹکر لی لیکن اسے متزلزل نہ کر سکی۔ وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ ہر طرح ستائے گئے۔ قید و بند کی تکلیفوں سے گزرے، مال و دولت سے محروم کیے گئے لیکن ان کے یقین نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

حضرت بلالؓ نے جب اعلان کیا کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں تو مکے کے لڑکے ان کے پیروں میں رسی باندھ کر شہر کی گلیوں اور کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے[1] ان کا مالک امیہ بن خلف تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیتا کہ اگر محمد کا انکار نہ کرو گے تو اسی حال میں مر جاؤ گے۔ لیکن اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا جو کلمہ انہیں پڑھایا تھا اس کے سوا کوئی دوسرا کلمہ پڑھنے سے

---

[1] مسند احمد، جلد ۱ صفحہ ۴۰۴۔

انھوں نے انکار کر دیا۔[1]

حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹا دیا جاتا، جس سے ان کے جسم کی چربی پگھلنے لگتی۔ اس عذاب سے دہکتے ہوئے انگارے ٹھنڈے پڑ جاتے لیکن ان کے یقین کی وہ آگ نہ بجھتی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کیا تھا۔[2]

نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ نے حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے لیکن ان کے دل کی دنیا جس ایمان و یقین سے آباد تھی اسے نہ نکال سکا۔ وہ ان سے پوچھتا کہ کیا محمدؐ خدا کے رسول ہیں؟ تو پورے یقین کے ساتھ جواب دیتے کہ ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ اور جب وہ یہ سوال کرتا کہ کیا تم مجھے خدا کا رسول مانتے ہو تو صاف کہہ دیتے کہ تمہاری ان خرافات کے سننے سے میرے کان بہرے ہیں۔[3]

حضرت صہیبؓ کو اس جرم میں کہ وہ آپ کو خدا کا رسول مانتے تھے مکہ چھوڑنا پڑا تو انھوں نے اس شان سے ہجرت کی کہ اپنا سارا مال و متاع مشرکین کے حوالے کر دیا اور خالی ہاتھ مدینے پہنچ گئے۔[4]

جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کو تسلیم کیا تھا ان کے نزدیک کسی بات کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ آپ کی زبان سے نکلی ہے۔ ان کے یقین کا یہ عالم تھا کہ غیب کی جن حقیقتوں کو آپ بیان کرتے وہ ان پر اس طرح ایمان لے آتے جیسے کہ انہوں نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ نے معراج کا ذکر فرمایا کہ شب کے چند لمحات میں خدائے تعالیٰ آپ کو مکے سے بیت المقدس لے گیا۔ وہاں آپ نے نماز پڑھی اور پھر آپ مکے واپس لوٹ آئے۔ آپ کے مخالفین کے نزدیک اس واقعہ کی روایت ہی آپ کی تکذیب کے لیے کافی تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو کہا "واللہ لئن کان قالہ لقد صدق"، (خدا کی قسم اگر آپ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو سچ بیان کیا ہے۔[5])

حضرت یاسرؓ خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کی بیوی سمیّہ کو ابوجہل کے نیزے نے شہید کر دیا

---

[1] سیرت ابن ہشام، جلد اصفحہ ۳۳۹۔ [2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔ [3] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔ [4] الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ [5] سیرت ابن ہشام جلد ۲ صہ ۵، یہاں واقعہ معراج کی ان تمام تفصیلات سے بحث نہیں جو صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔

اوران کے بیٹے عمارؓ کو لوہے کی زرہ پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیا گیا[۱] وہ یہ سب کچھ جھیل گئے کیونکہ ان کے سامنے آپ کا یہ ارشاد تھا۔

صبرًا یاآل یاسر فان موعدکم الجنۃ[۲] — صبر کرو اے آل یاسر! تم سے ملاقات جنت میں ہوگی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر میں فرمایا کہ دوڑو جنت کی طرف جو آسمان و زمین کی طرح وسیع ہے۔ یہ سنتے ہی عمیر بن حمام بے تاب ہوگئے اور جلدی جلدی اپنے جھولے سے چند کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر کچھ سوچ کر کہا کہ ان کھجوروں کے ختم ہونے تک زندہ رہوں تو یہ بڑی لمبی زندگی ہوگی۔ چنانچہ فورًا انہیں اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور میدان جہاد میں جان دے دی[۳]

جنگِ اُحد میں انس بن نضرؓ حضرت سعدؓ سے فرماتے ہیں۔ خدا کی قسم مجھے اُحد کے پہاڑ کے پیچھے سے جنت کی خوشبو آرہی ہے۔ یہ کہا اور پھر اسی وقت دشمن سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم پر نیزے اور تلوار کے اسّی سے زیادہ زخم تھے[۴]

ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا تو حضرت عمرؓ گھر گئے اور اپنا آدھا مال لے آئے۔ حضرت ابوبکرؓ گئے اور اپنا کل سرمایہ لاکر سامنے رکھ دیا اور کہا کہ بیوی بچے اب خدا اور اس کے رسول کے حوالے ہیں[۵]

غزوۂ تبوک کے موقع پر لشکر کے لیے ساز و سامان کا انتظام نہیں ہو رہا تھا حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص اس لشکر کو مسلح کرے گا خدائے تعالیٰ اسے اس کا اجر دے گا۔ ان الفاظ کے سنتے ہی حضرت عثمانؓ کھڑے ہوئے اور لشکر کی ایک ایک ضرورت کا اس طرح انتظام کیا کہ اونٹوں کے لیے رسّیاں اور نکیلیں تک فراہم کر دیں[۶]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا حکم سنایا کہ انسان نیکی کا مقام اس وقت پا سکتا ہے جب کہ وہ

---

[۱] الاصابہ فی تمیز الصحابہ تذکرہ مذکورہ اصحاب۔ [۲] مستدرک حاکم مطبوعہ حیدرآباد جلد ۳ ص ۳۸۳۔ [۳] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الجہاد، بحوالہ مسلم۔ [۴] بخاری، کتاب الجہاد، باب قول اللہ من المومنین رجال الخ۔ [۵] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ۔ [۶] ترمذی و نسائی ابواب المناقب۔

اپنی بعض محبوب چیزوں سے دست بردار ہو جائے۔ تو حضرت ابو طلحہ نے کہا اے اللہ کے رسول میرا فلاں باغ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے، اسے میں اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں اور اسی سے مجھے اس کے اجر و ثواب کی توقع ہے۔[1]

دو آدمی آپ کی خدمت میں ایک مقدمہ لے کر پہنچے۔ لیکن دونوں میں سے کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ "میں انسان ہوں، تم اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو۔ ممکن ہے تم میں سے کوئی شخص اپنے دعوے کو دوسرے سے زیادہ وضاحت اور چالاکی کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ لیکن یاد رکھو اگر اس طرح میں کسی کو اس کے بھائی کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دوں تو وہ اسے ہرگز نہ لے۔ کیونکہ جہنم کی آگ کا ایک ٹکڑا اس کے حوالے کر رہا ہوں۔"

اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ دونوں بے اختیار رونے لگے اور اپنے اپنے دعوے سے دوسرے کے حق میں دست بردار ہو گئے۔[2]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے والوں کا یہ یقین، یہ ایمان اور یہ قربانیاں میرے نزدیک آپ کے برحق ہونے کی زبردست دلیل ہیں۔ کیونکہ آج تک اس کی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی جھوٹے نے دوسروں کو صداقت کا پابند بنا دیا ہو، کسی خدا سے بے خوف انسان نے اپنے ساتھیوں کے اندر اس کا خوف اور خشیت پیدا کر دی ہو اور کسی پست سیرت آدمی کی صحبت سے لوگوں کی سیرت بلند ہو گئی ہو۔ جھوٹ انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس لیے جھوٹے شخص میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ کسی کو سہارا دے سکے۔ اس کا مقام مصلح اخلاق کا نہیں ہوتا بلکہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ ظاہر ہے جو خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہو وہ کسی کی دست گیری کیا کر سکتا ہے؟ میدانِ عمل میں جس کے قدم لڑکھڑا رہے ہوں ناممکن ہے کہ وہ کسی کمزور اور ناتواں جسم میں استقلال اور ثابت قدمی کی روح پھونک دے۔

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الزکوٰۃ علی الاقارب۔ [2] ابو داؤد، کتاب القضاء، باب ما جاء فی قضاء القاضی اذا اخطأ۔

فصل پنجم

ختمِ نبوّت

محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں اور آخری رسول ہیں۔ آپ کی رسالت تمام انسانوں کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔ اب نہ تو کوئی رسول آئے گا اور نہ کسی سابق رسول کی اتباع جائز ہوگی۔ جو شخص آپ کو رسول مانتا ہے لیکن آخری رسول نہیں مانتا وہ حقیقت میں آپ کی رسالت کا آدھا اقرار اور آدھا انکار کرتا ہے اور یہ چیز انکار ہی کے ہم معنی ہے۔ آپ کی رسالت کے دو جزو ہیں، ایک آپ کا رسول ہونا اور دوسرا آپ کے ذریعہ رسالت کا ختم ہونا۔ کیونکہ آپ نے صرف اپنی نبوت ہی کا دعویٰ نہیں کیا تھا بلکہ ختمِ نبوت کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ آپ کی رسالت پر ایمان اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب کہ ہم دونوں اجزاء کا اقرار کریں۔ ان میں سے کسی بھی جزء کو اپنے عقیدے سے الگ کرنے کے بعد انسان مومن نہیں رہ سکتا۔ قرآن نے ایک خاص موقع پر صاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ رسالت کا جو سلسلہ حضرت آدم سے شروع ہوا تھا وہ آپ تک پہنچ کر ختم ہوگیا ہے۔ اب آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ (الاحزاب: ۴۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں چند روایات نقل کرتے ہیں:۔

اِنَّ مَثَلِيْ وَمَثَلَ الْاَنْبِيَآءِ مِنْ قَبْلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى بَيْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ	میرے اور مجھ سے پہلے دوسرے پیغمبروں کے فرق کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص نے ایک مکان تعمیر کیا اور اسے خوب آراستہ

زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَيَتَعَجَّبُوْنَ لَهٗ وَيَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ[1] وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْاَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ۔[2]

پیراستہ کیا۔ البتہ کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس مکان کو دیکھ کر حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ آخر یہ اینٹ کیوں نہیں لگا دی گئی۔ چنانچہ میں وہی اینٹ ہوں۔ اور میں خاتم النبیین ہوں۔ مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ میں آیا اور پیغمبروں کی آمد روک دی۔

کانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء کلما هلك نبی خلفه نبیٌ وانه لا نبی بعدی[3]

بنی اسرائیل کی قیادت انبیاء علیہم السلام کرتے تھے جب ایک نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی آتا۔ لیکن اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

انا العاقب الذی لیس بعده نبیٌ۔[4]

میرا نام "عاقب" ہے۔ یعنی وہ جس کے بعد کوئی دوسرا نبی نہیں ہے۔

ختم نبوت کا اعلان حقیقت میں اس بات کا اعلان ہے کہ آپ کی رسالت عالمگیر رسالت ہے۔ آپ صرف اس دور کے پیغمبر نہیں ہیں جس دور میں آپ پیدا ہوئے بلکہ ہر دور میں آپ کی اتباع فرض ہے۔ آپ کی بعثت کسی خاص خطۂ زمین اور کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ کو ہر خطۂ زمین اور ہر قوم کے لیے بھیجا گیا تھا۔ آپ تمام عالم کے ہادی و راہنما ہیں اور آپ ہی سے دنیا راہ راست پا سکتی ہے۔ آپ کے ذریعہ خدا کی ہدایت آخری بار نازل ہو چکی ہے، اب نہ کسی ہدایت کی ضرورت ہے اور نہ وہ کسی کے حق میں مفید ہو سکتی ہے۔ ختم نبوت کا تصور اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا کہ آپ کو ساری دنیا کا پیغمبر مانا جائے۔ اور آپ کی ہدایت کو عالمی و ابدی ہدایت تسلیم کیا جائے۔

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین۔ [2] مسلم، کتاب الفضائل، باب ذکر کونہ خاتم النبیین۔ [3] بخاری، کتاب الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ [4] مسلم، کتاب الفضائل، باب فی اسمائہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

قرآن وحدیث میں بار بار اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ آپ کی رسالت تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اور اب جس کسی کو بھی ہدایت مل سکتی ہے آپ ہی سے مل سکتی ہے۔

قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَکَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ ٥ (الاعراف : ۱۵۸)

اے محمد ان سے کہو کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس خدا کا پیغمبر جس کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی سلطنت ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی زندگی عطا کرتا اور مارتا ہے۔ پس تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول 'نبی امی' پر جو اللہ اور اس کے کلمات کو مانتا ہے، اور اس کی پیروی اختیار کرو، امید ہے کہ تم ہدایت پاؤ گے۔"

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ٥ (السبا: ۲۸)

ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے (اللہ کے انعامات کی) خوشخبری دینے والا اور (اس کے عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

کان النبیُّ یُبعثُ الیٰ قومه خاصّةً ویُبعثتُ الی الناسِ عامّةً"[1]

ہر نبی مخصوص طور پر اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، لیکن میری رسالت عام ہے اور مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔

یہی روایت ان الفاظ کے ساتھ بھی مروی ہے:

کان کل نبی یبعث الیٰ قومه خاصةً وبعثتُ الیٰ کل احمر واسود۔[2]

ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا لیکن مجھے تمام سرخ وسیاہ انسانوں (عرب وعجم) کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب التیمم۔ [2] مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰة۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں

ارسلت الی الخلق کافۃً وختم بی النبیون[1]	مجھے تمام خلقِ خدا کی طرف بھیجا گیا ہے اور میرے ذریعہ نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کے آخری رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ نجات کے لیے آپؐ کی اتباع کو ضروری قرار دیا جائے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک نجات صرف آپ ہی کی اتباع میں نہیں ہے بلکہ کسی بھی رسول کے پیچھے چل کر انسان نجات پا سکتا ہے۔ ان کا اندازِ استدلال یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کام انجام دیا ہے جو کام آپ سے پہلے دوسرے رسول انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی پیروی انسان کو خدا تک پہنچاتی ہے، لیکن یہ دعویٰ صحیح نہ ہوگا کہ آپؐ کے علاوہ کسی دوسرے رسول کی اتباع انسان کو خدا سے دور کر دے گی۔ خدا کے رسولوں کے ذریعہ مختلف قوموں اور ملکوں میں ہدایت کے چراغ روشن ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی کوئی اتباع کرے وہ ہدایت سے محروم نہیں رہ سکتا۔ ہر پیغمبر کی راہ خدا کی راہ ہے۔ اس راہ کا راہی ناممکن ہے کہ اپنی منزل سے بھٹک جائے۔

اس استدلال کی خامی یہ ہے کہ اس میں آپ کی رسالت کا مطالعہ ایک غلط رخ سے کیا گیا ہے۔ آپ نے انسانوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دی، اور اس میں شک نہیں کہ یہ دعوت کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ یہ نوعِ انسانی کو اس وقت سے مل رہی ہے جب سے وہ اس زمین پر آباد ہے۔ لیکن یہ ایک اصولی بات ہے جب آپ اس کی تفصیل میں جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ اب آپ ہی کی اتباع تمام انسانوں پر واجب ہے۔ اس کے دو خاص وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ دنیا کی وہ عمومی حالت ہے جو آپ کی بعثت کے وقت تھی۔ آپ ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جس میں نہ کوئی آسمانی کتاب اپنی صحیح شکل میں موجود تھی اور نہ کسی پیغمبر کا اسوہ محفوظ تھا۔ دنیا گرفتارِ جہالت تھی اور ہدایت کے چشمے خشک ہو گئے تھے۔ آپؐ نے انسانوں کو خدا کا پیغام اس وقت سنایا جب کہ وہ مٹ چکا تھا۔ جو شخص خدا تک پہنچنا چاہے اس کے لیے صحیح راہ مفقود تھی، آپ نے اسے صحیح راہ دکھائی۔ انسان خدا کو بھولا ہوا تھا، آپ نے اس کے اندر خدا کی یاد پیدا کی۔

---

[1] مسلم، کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ۔

خدا سے بندوں کا تعلق ٹوٹ چکا تھا، آپ نے اس تعلق کو پھر سے مضبوط کیا۔ اب انسان کو خدا کی معرفت صرف آپ ہی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ جو شخص خدا کو پانا چاہے اس کے لیے صرف ایک ہی راہ کھلی ہے اور وہ آپ کی بتائی ہوئی راہ ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :-

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ أَن تَقُولُوا مَا جَاءَنَا مِن بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ فَقَدْ جَاءَكُم بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (المائدہ : ۱۹)	اے اہل کتاب! یقیناً اب تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے، جو تمہیں کھول کھول کر دین کی باتیں بتا رہا ہے۔ اس کی آمد ایک ایسے وقت میں ہوئی ہے جبکہ مدت سے خدا کے رسول نہیں آرہے تھے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ کوئی خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا ہمارے پاس نہیں آیا۔ پس اب تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور عذاب سے ڈرانے والا آگیا۔ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

آپ کی اتباع کو ضروری قرار دیے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خدا کا پیغام آپ کے ذریعہ انسانوں کو آخری بار ملا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب وہ تمام شریعتیں منسوخ ہوگئیں جو آپ سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ کیونکہ خدا کی طرف سے کسی شریعت کا نفاذ صرف اسی وقت تک کے لیے ہوتا ہے جب تک کہ اس کے بعد کوئی نئی شریعت نہ آجائے۔ اور جب وہ آجاتی ہے تو کسی بھی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ وہ اس نئی شریعت کو چھوڑ کر سابقہ شریعتوں کی اتباع کرے اب جبکہ خدا کا آخری رسول آگیا اور اس کے ساتھ خدا کی شریعت بھی آخری بار نازل ہوگئی تو پھر کسی دوسری شریعت پر عمل کرکے انسان کیسے نجات پا سکتا ہے؟ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

والذی نفس محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ لا یسمع لی احدٌ من ھذہ الامّۃ یھودیٌ ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی اُرسلتُ بہ الا کان من اصحٰب النار[1]	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، خواہ کوئی یہودی ہو یا نصرانی جو بھی میری آمد کے بارے میں سنے اور پھر میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مرجائے تو وہ قطعاً جہنمی ہوگا۔

---

[1] مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد الی جمیع الناس ونسخ الملل بملتہ۔

ایک اور موقع پر آپ فرماتے ہیں:۔

وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْ بَدَا لَکُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْہُ وَ تَرَکْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ کَانَ حَیًّا وَاَدْرَکَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ [1]

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آج موسیٰؑ بھی تمہارے سامنے نمودار ہوجائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگو تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور میرے دورِ نبوت کو پاتے تو میری ہی اتباع کرتے۔"

اسی بات کو آپ نے ان الفاظ میں بھی ظاہر فرمایا ہے:۔

لَوْ کَانَ مُوْسٰی حَیًّا مَا وَسِعَہٗ اِلَّا اِتِّبَاعِیْ [2]

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ میری اتباع کریں۔

ان تصریحات کا حاصل یہ ہے کہ نجات صرف آپ کی پیروی میں ہے۔ جو شخص بجائے آپ کی پیروی کے کسی دوسرے رسول کی پیروی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے وہ آپ کی رسالت کا منکر ہے اس کے لیے خدا کی رحمت کے دروازے بند ہیں۔

---

[1] رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الایمان بالکتاب والسنۃ)
[2] رواہ الدارمی (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان)

باب سوم

قرآن کا تصورِ خدا

چند اصولی مباحث

انسان خدا سے اپنا تعلق جوڑنا چاہتا ہے، لیکن وہ نہیں جانتا کہ خدا کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ قرآن خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہے جو انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ خدا کو ہم نے نہیں دیکھا لیکن قرآن کھول کر ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن اپنے حروف و الفاظ میں خدا کی مکمل تصویر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ خدا کا تصور جس قدر صحت اور وضاحت کے ساتھ آپ کو قرآن میں ملے گا دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔ خدا کی ذات وصفات سے بحث کرنے والی بیشتر کتابیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ کتابیں ان کوششوں کو ظاہر کرتی ہیں جو مختلف زمانوں میں خدا کو سمجھنے کے لیے ہوتی رہی ہیں خدا کو اپنا موضوع بنانے والی کتابوں میں صرف چند کتابیں ایسی ہیں جن میں خود خدا نے بتایا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے، خدا جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ہے، ان کتابوں کے ذریعہ بے نقاب ہوا ہے۔ ان کتابوں کو اصطلاح میں آسمانی کتابیں کہا جاتا ہے قرآن ان میں سب سے آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ قرآن کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گذر چکیں، لیکن انسانی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ اس کے لیے یہ واقعہ "عہد جدید" کا واقعہ ہے۔ قرآن سے پہلے ہر دور میں آسمانی کتابیں آتی رہیں اور انسانی غفلت کی نذر ہوتی رہیں، حتیٰ کہ ان میں سے بیشتر کے نام بھی انسان کے حافظہ سے مٹ گئے۔ خدا کی طرف سے بار بار اس کو ایک بے پایاں دولت ملتی رہی اور وہ بار بار اس کو کھوتا رہا۔ قرآن انسانیت کی یہی متاعِ گم گشتہ ہے جو اس کو آخری مرتبہ نصیب ہوئی اور آج سوائے قرآن کے

اور کوئی آسمانی کتاب اپنی صحیح شکل میں محفوظ نہیں ہے۔ اس وقت جو کتابیں آسمانی کتابوں کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں ہیں انسانی تحریفات نے ان میں سے کسی کتاب کو "خدا کی کتاب" رہنے نہیں دیا۔ خدا نے جو چشمۂ صافی جاری کیا اس کو انسان نے اپنی خواہشات سے گدلا کر دیا۔ اب صرف ایک قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے، جس کے "کتاب الٰہی" ہونے پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں وہ پورے وثوق کے ساتھ ہمیں بتاتا ہے کہ رسولوں نے خدا کا کیا تصور دیا تھا اور اس میں انسانوں نے کیا تحریف کی ہے؟ قرآن ان تمام تعلیمات کا مکمل ترجمان ہے جو رسولوں کے ذریعہ نوع انسانی کو اس سے پہلے ملتی رہی ہیں۔ آپ اس سے معلوم کر سکتے ہیں کہ خدا کے رسول کس لیے دنیا میں آئے تھے اور ان کا کیا پیغام تھا؟ یہاں ہم خدا کی اس کتاب کی مدد سے خدا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

کتاب معرفت

قرآن کتاب معرفت ہے جس سے انسان کو خدا کا صحیح شعور ملتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ ایک بے پایاں اور لامحدود ہستی آپ کے ذہن کی محدود دنیا میں سماتی چلی جا رہی ہے۔ کائنات کی وسعتیں جس حقیقت کی متحمل نہیں ہیں، قرآن آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ آپ اسے اٹھا سکیں۔ قرآن میں آپ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں، جس کا احاطہ اپنے سر کی آنکھوں سے کبھی نہیں کر سکتے۔ جس کلام کے سننے کی آپ میں تاب نہیں، قرآن کے الفاظ میں اس کی آواز آپ کے کان میں گونجنے لگتی ہے۔ ایک اتھاہ سمندر جس کی پہنائیاں نامعلوم ہیں قرآن کے بیانات میں آپ اس کی سیر کرتے ہیں۔ جو راہ خطرات سے گھری ہوئی ہے، قرآن اس راہ سے آپ کو اس طرح گزارتا ہے کہ کوئی اندیشہ اور کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی یہ خصوصیت اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ اس نے ایک غیر محسوس حقیقت کو ہمارے ذہن سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک محسوس واقعہ معلوم ہونے لگی ہے۔

قرآن کا مقصد

ہر کتاب کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کے لیے وہ لکھی جاتی ہے۔ قرآن نے بھی اپنا مقصد بیان کیا ہے اور وہ ہے "دعوت الی اللہ" یعنی انسانوں کو خدا کی طرف بلانا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (یوسف: ۱۰۸)	تم کہہ دو یہ ہے میری راہ، میں تم کو پوری بصیرت کے ساتھ خدا کی طرف بلا رہا ہوں، میں بھی اور میرے پیچھے چلنے والے بھی۔

قرآن میں ایک صاحب ایمان شخص کی تقریر نقل ہوئی ہے، جو اس نے دربار فرعون میں کی تھی۔ اس تقریر کے چند جملے یہ ہیں:-

وَيٰقَوْمِ مَالِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝ (المومن : ۴۱-۴۲)	اے میری قوم یہ کیا بات ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف بلا رہے ہو۔ تم مجھے اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کروں جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی طرف بلا رہا ہوں۔

خدا کا رسول "نذیر مبین" ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا ہے کہ خدا کی نافرمانی ان کو اس کے عذاب سے قریب کر رہی ہے۔ وہ ان کے درمیان اعلان کرتا ہے:-

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الذٰریٰت : ۵۰)	دوڑو خدا کی طرف میں اس کی طرف سے تمہارے لیے "نذیر مبین" ہوں

قرآن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاں بہت سے اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہاں ایک وصف یہ بیان ہوا ہے کہ آپ "داعی الی اللہ" ہیں۔ یعنی آپ خدا کے دین کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں۔ اسی کام کو "سبیل رب" کی طرف دعوت دینے سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ خدا کے دین اور اس کے راستہ کی طرف بلانا حقیقت میں خدا ہی کی طرف بلانا ہے۔ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہی "دعوت الی اللہ" قرآن کا مقصدِ نزول ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:-

سر القرآن ولبابه الاصفیٰ و مقصده الاقصیٰ دعوة العباد الی الجبار الاعلیٰ[1]	قرآن کی پوشیدہ حقیقت، اس کا جوہر خالص اور اس کا انتہائی مقصد، بندوں کو اس خدا کی طرف بلانا ہے جو زبردست طاقت والا اور بلند و برتر ہے۔

---

[1] جواہر القرآن ص۱۰ مطبوعہ کردستان مصر ۱۳۲۹ھ

کائنات کی سب سے بڑی حقیقت خدا کا وجود ہے۔ قرآن میں آپ کو اس حقیقت کی حسین ترین تعبیر ملے گی۔ اسی لیے اس کو "احسن الحدیث" (الزمر: ۲۳) کہا گیا ہے۔ یعنی حسین تر اور خوب تر بات، ایسی بات جو حسن و خوبی کے سب سے اونچے مقام پر ہے۔ قرآن ایک پیکر جمال ہے جس کے لفظ لفظ میں حقیقت اور سچائی گھول دی گئی ہے۔ اگر آپ کائنات کی صداقت کو الفاظ میں سمیٹ دیں تو یقیناً وہ قرآن ہوگا۔

خدا اس کائنات کا نور ہے۔ یہاں جو نور اور چمک ہے، جو حسن و جمال ہے جو کمال اور خوبی ہے، جو رونق اور دلکشی ہے، سب کچھ اسی کا پرتو ہے اور اسی کی وجہ سے ہے۔ خدا نہ ہو تو یہاں وہ شانِ حسن کبھی نہ ہوگی جو اس وقت پائی جاتی ہے قرآن اسی حسنِ حقیقی کا ترجمان ہے اور اسی کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور رہنے والوں کو آواز دیتا ہے کہ دوڑ کر اس کے دامن میں پناہ لیں، وہ گم کردہ راہ انسانیت کو صراط مستقیم دکھاتا ہے۔ وہ اس نورِ حقیقی تک پہنچاتا ہے جس سے یہ کائنات روشن ہے۔ وہ نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے خود بھی سراپا نور ہے۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء: ۱۷۵) (لوگو! ہم نے تمہاری طرف "نور مبین" یعنی کھلی روشنی اتاری ہے)

دنیا کو مختلف پیغام دیے جاتے رہے ہیں اور دیے جاتے رہیں گے۔ لیکن قرآن کے نزدیک یہ سب پیغام، پیغام ضلالت ہیں، سوائے اس ایک پیغام کے جو خدا کی طرف سے اس کے بندوں کو پہنچایا جاتا ہے۔ جو شخص انسانوں کو خدا کی طرف بلاتا ہے وہ ایک ایسے کام میں مصروف ہے کہ جس سے بہتر کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کا داعی حقیقت میں خیر و خوبی اور حسن کا داعی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (حم سجدہ: ۳۳)	اس سے زیادہ اچھی بات کرنے والا اور کون ہوگا جس نے انسانوں کو خدا کی طرف دعوت دی اور اس کے مطابق خود بھی اچھے اعمال اختیار کیے اور کہا کہ میں مسلم ہوں۔

خدا کی طرف دوڑنے اور خدا کی طرف بلانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو خدا کی عظمت اور برتری کا مکمل شعور ہو۔ وہ اپنی اور خدا کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہو۔ وہ جانتا ہو کہ خدا کی ذات کیا ہے اور وہ کن خصوصیات کی حامل ہے؟ اس کے بغیر نہ تو وہ خود خدا تک پہنچ سکتا ہے اور نہ دوسروں کو خدا کی

طرف بلاسکتا ہے۔جس منزل کی راہ ورسم سے انسان واقف نہیں۔اس تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔
قرآن، انسان کو خدا کی صحیح معرفت عطا کرتا ہے۔خدا کیا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، اس کی حکمت کیا ہے، اس کے قوانین کیا ہیں، وہ اپنے بندوں سے کیا چاہتا ہے؟ یہی موضوعات ہیں جن سے پورے قرآن میں بحث کی گئی ہے۔کہیں آپ اس کو اپنے اس موضوع خاص سے ہٹا ہوا نہیں پائیں گے۔ قرآن میں آپ کو بندگی کے اصول ملیں گے۔اخلاق کی تعلیم ملے گی، تہذیب و معاشرت اور سیاست کے احکام ملیں گے۔اسی طرح آپ قرآن میں جنت اور دوزخ کا ذکر پائیں گے، قوموں کے عروج وزوال کے احوال دیکھیں گے۔لیکن ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو خدا کا صحیح شعور ملے اور وہ اس کی مرضی و نامرضی سے واقف ہوجائے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:۔

ان معرفة الله تعالیٰ ومعرفة ذاته وصفاته هی المقصد الاقصیٰ من علوم القرآن وان سائر الاقسام مرادة له وهو مراد لنفسه لا لغيره فهو المتبوع وماعداه التابع[1]	خدائے تعالیٰ کی معرفت اور اس کی ذات و صفات کی پہچان، قرآنی علوم کا بنیادی مقصد ہے۔علوم قرآن کی جتنی قسمیں ہیں وہ سب کی سب اس مقصد کے لیے مطلوب ہیں اور یہ مقصد فی نفسہ مطلوب ہے یہ متبوع ہے اور بقیہ ساری چیزیں اس کی تابع ہیں۔

قرآن کا موضوع

کسی تحریر کو مکمل کرنے کے لیے مختلف علوم وفنون سے بحث کرنی پڑتی ہے۔لیکن یہ ساری بحثیں تحریر کے اصل موضوع سے غیر متعلق نہیں ہوتی بلکہ اسی کے گرد گھومتی ہیں۔اسی طرح قرآن کا موضوع خدا ہے۔آپ اس کو صرف خدا سے بحث کرتا ہوا پائیں گے۔وہ نئے نئے زاویوں سے اپنے موضوع کو سمجھاتا ہے اور جو سوالات ابھرتے ہیں ان کے جواب دیتا ہے۔جہاں یہ مسائل ختم ہوئے وہ پھر اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے۔چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کا بہت بڑا حصہ خدا کی ذات وصفات کے بیان پر مشتمل ہے۔

---

[1] جواہر القرآن ص۵۶

اس موقع پر امام ابن قیمؒ کی ایک بحث کو ہم یہاں ان ہی کے الفاظ میں مختصر کر کے پیش کرتے ہیں:۔

..... ومعلومٌ ان حاجتهم الیٰ معرفة ربهم وفاطرهم فوق مراتب هذه الحاجات کلها فانه لاسعادة لهم ولا فلاح ولا صلاح ولا نعیم الا بان یعرفوه ویعتقدوه ویکون هو وحده غایة مطلوبهم والتقرب الیه قرة عیونهم فمتیٰ فقدوا ذالک کانوا اسوأ حالا من الانعام و کانت الانعام اطیب عیشا فی العاجل واسلم عاقبة فی الآجل ..... واذا علم ان ضرورة العبد الیٰ معرفة ربه فوق کل ضرورة کانت الغایة ببیانها ایسر الطرق واهداها وابینها..... فان الله تعالیٰ لم یذکر لعباده من صفة ملٰئکته وشانهم وافعالهم عشر معشار ما ذکر لهم من نعوت جلاله وصفات کماله..... فان القراٰن بل الکتب المنزلة مملوءة بذکر الفوقیة وعلو الله علیٰ عرشه وانه تکلم ویتکلم وانه موصوف بالصفات وان له افعالاً تقوم به هو بها فاعل

..... یہ بات معلوم ہے کہ انسان ہوا اور پانی کے اتنے محتاج نہیں ہیں جتنے وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے رب اور خالق کو پہچانیں۔ کیونکہ ان کے لیے سعادت، فلاح وصلاح اور (ہر طرح) کی نعمت کی راہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کریں اور اس پر یقین رکھیں، تنہا خدا کی ذات ان کی سعی وطلب کا مقصود ہو اور خدا سے قربت اُن کے آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے۔ اس دولت کو کھونے کے بعد ان کی حالت چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ بلکہ چوپایوں کی زندگی ان سے زیادہ اچھی ہے اس دنیا میں اور آخرت میں ان کا انجام بھی ہر خطرے سے محفوظ ہے..... جب یہ بات واضح ہے کہ بندہ کے لیے خدا کی معرفت ایک ایسی ضرورت ہے جو اس کی ہر ضرورت پر مقدم ہے تو اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ خدا کی ذات وصفات کو زیادہ آسان، واضح اور روشن طریقہ سے بیان کر دیا جائے (تاکہ بندہ آسانی سے اپنی یہ ضرورت پوری کر سکے)..... اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنے فرشتوں کی صفت، ان کے احوال اور ان کے افعال واعمال کا (تفصیل سے ذکر کیا ہے) لیکن اس نے اپنے اوصافِ جلال اور صفاتِ جمال کا جتنا تذکرہ کیا ہے، فرشتوں کا ذکر اس کا ایک فی صد بھی نہیں ہے..... قرآن بلکہ

وانہ یری بالابصار الی غیرذٰلک من نصوص آیات الصفات واخبارھا التی اذا قیس الیھا نصوص حشر ھذہ الاجساد وخراب ھٰذا العالم واعدامہ وانشاء عالم آخر وجدت نصوص الصفات اضعاف اضعافھا حتی قیل ان الآیات والاخبار الدالۃ علی علوالرب علی خلقہ واستوائہ علی عرشہ تقارب الالوف وقد اجمعت علیھا الرسل من اولھم الی آخرھم[1]

تمام آسمانی کتابیں ان باتوں کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں کہ خدا سب سے بلند و بالاتر ہے اور وہ اپنے عرش پر متمکن ہے، اس نے پہلے بھی گفتگو کی اور اب بھی کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کچھ صفات ہیں جن سے وہ متصف ہیں اس کے خاص افعال ہیں جو اسی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور وہی ان کو انجام دیتا ہے اور یہ کہ وہ آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے قرآن وحدیث کے دوسرے نصوص کو اگر ان نصوص کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھا جائے جن میں حشر اجساد، اس عالم کی ویرانی اور تباہی اور ایک دوسرے عالم کے وجود میں آنے کا ذکر ہے (یعنی آخرت جیسے بنیادی مسئلہ کا ذکر) تو خدا کی صفات سے متعلق نصوص کو تم کئی گونا زیادہ پاؤ گے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ آیات جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا اپنی مخلوق سے بلند ہے اور وہ عرش پر متمکن ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں تک ہے۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جن پر خدا کے رسول شروع سے آخر تک متفق رہے ہیں۔"

قرآن کی پہلی تعلیم

قرآن جس ہستی پر نازل ہوا (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو سب سے پہلے خدا کی ذات وصفات کی تعلیم دی گئی، کیونکہ اسی بنیاد پر آئندہ پورے دین کی تعمیر ہونے والی تھی۔ حکم ہوا:۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ لا الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝

(العلق: ۱-۵)

پڑھ تو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ تو اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ اس نے انسان کو تعلیم دی اس بات کی جس کو وہ نہیں جانتا تھا۔

---

[1] مختصر الصواعق المرسلۃ علی الجھمیۃ والمعتزلۃ، مطبوعہ مطبعہ سلفیہ، مکہ مکرمہ ۱۳۴۸ھ جلد ۱ صفحہ ۶۲، ۶۱۔

یعنی "خدا وہ ہے جو کائنات کا خالق اور پروردگار ہے، جو ہر چیز کو نہ صرف وجود عطا کرتا ہے بلکہ اس کے لیے سامانِ حیات بھی فراہم کرتا ہے۔ وہ بہت ہی بزرگ و بالاتر اور اعلیٰ صفات و خصوصیات کا مالک ہے، اس نے انسان جیسی ہستی کو حقیر مادہ سے پیدا کیا اور علوم و معارف کے خزانے اس کے ہاتھ میں دے دیے، یہی نہیں بلکہ اسے اپنی مرضی سے روشناس کرایا، جس سے کہ وہ از خود کبھی واقف نہیں ہو سکتا تھا" یہ وحی کا آغاز بھی ہے اور ساتھ ہی خدا کے تعارف کا آغاز بھی۔

قرآن کے اہم ترین اجزاء

قرآن کی جن آیات اور جن سورتوں میں خدا کی ذات و صفات سے بحث ہوئی ہے ان کی خاص اہمیت ہے کیونکہ ان میں قرآن کے اصل موضوع پر براہِ راست گفتگو ہے۔

قرآن کھولتے ہی پہلی سورت جس کا آپ مطالعہ کریں گے وہ خدا کا تعارف اس طرح کراتی ہے کہ وہی معبود ہے، وہی سب کا ملجا و ماویٰ ہے، تمام حمد و ثنا اسی کے لیے ہے، وہ رب ہے اور سارے عالم کی پرورش کر رہا ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے، اور کائنات اسی کی رحمت کے سہارے زندہ ہے۔ وہ آخرت کے دن کا مالک ہے انسانوں کا آخری حساب و کتاب اسی کے ہاتھ میں ہے، اس کے بعد انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف لپکے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ڈال دے، اسی کی طرف بڑھے اور اسی سے مدد چاہے کیونکہ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ جو شخص اس راہ سے بھٹک جائے اس کو خدا کے غضب سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ دنیا اور آخرت میں اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔ اس طرح قرآن کے اس دیباچہ میں خدا کا تعارف بھی ہے اور اس کی طرف دعوت بھی ہے گویا قرآن کے پہلے ہی صفحہ میں قرآن کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے اس سورۃ کو "ام القرآن" (قرآن کا جوہر) کہا گیا ہے۔[۱]

حدیث میں آیا ہے کہ سورۂ فاتحہ دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ اس کے ایک حصّہ کے بارے میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرا ہے اور دوسرے حصّہ کے بارے میں اس کا ارشاد ہے کہ وہ میرے بندے کا ہے میرا بندہ جو کچھ مانگے گا میں اس کو دوں گا۔

---

[۱] حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی ایک روایت میں سورہ فاتحہ کے تین نام آئے ہیں "ام القرآن" (قرآن کا جوہر)، "ام الکتاب" (اصل کتاب)، "السبع المثانی" (سات دہرائی جانے والی آیتیں) ترمذی، کتاب التفسیر، تفسیر سورۂ حجر، ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب فاتحۃ الکتاب۔ دارقطنی۔

ما انزل اللہ فی التوراۃ ولا فی الانجیل مثل اُمّ القرآن وھی السبع المثانی وھی مقسومۃ بینی وبین عبدی ولعبدی مَاسَأَلَ[1]	اللہ تعالیٰ نے ام القرآن جیسی سورۃ نہ تورات میں نازل کی اور نہ انجیل میں، یہ سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے اور میرے بندے کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ مانگے۔"

مطلب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے ایک حصہ میں خدا کا تعارف ہے۔ اس کی عظمت اور بزرگی کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں خدا کی طرف دعوت ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں دعا کی شکل میں انسان کی زبان پر جاری کردی گئی تاکہ خدا کا صحیح شعور اس کے اندر زندہ رہے اور وہ بار بار اس کی طرف بڑھنے کی دعا کرتا رہے[2]

سورۂ اخلاص قرآن کی بہت ہی چھوٹی سورۃ ہے جو صرف پانچ جملوں پر مشتمل ہے لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قرآن کی سب سے بڑی سورۃ کہا ہے[3] اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں "رحمٰن کی صفت" بیان کی گئی ہے[4]

اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۵ (آیۃ الکرسی) کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی سب سے بڑی

---

[1] ترمذی، ابواب التفسیر (سورۃ الحجر) النسائی، کتاب الافتتاح تاویل قولہ عز وجل وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي۔ [2] قرآن میں ہے ولقد آتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم (ہم نے تم کو بار بار دہرائی جانے والی سات (آیتیں) اور قرآن عظیم عطا کیا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعبؓ سے فرمایا کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے (بخاری کتاب التفسیر و دیگر کتب حدیث) [3] دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل اول سورۃ البقرہ و آیۃ الکرسی۔ [4] مسلم (کتاب فضائل القرآن) کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک صاحب امام تھے جو ہر رکعت میں قرأت ختم کرنے کے بعد سورۂ اخلاص ضرور پڑھتے۔ ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب دیا "لانھا صفۃ الرحمن فانا احب ان اقرأ بھا۔ اس میں رحمٰن کی صفت بیان ہوئی ہے اس لیے اس کا پڑھنا مجھے پسند ہے۔ ان کا یہ جواب معلوم کرکے آپ نے فرمایا کہ خدا بھی اس شخص سے محبت کرتا ہے۔

آیت کہا ہے[1]۔ یہ آیت خود آپ کو بتائے گی کہ وہ قرآن کی سب سے بڑی آیت کیوں ہے ؟

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝

اللہ! نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، وہ زندہ ہے اور قائم ودائم۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ وہ سوتا ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے کسی کی سفارش کرے ؛ الاّ یہ کہ وہ اس کی اجازت دے۔ انسانوں کے سامنے جو کچھ ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو ان کی نگاہوں سے غائب ہے اسے بھی جانتا ہے انسان اس کے علم کے کسی بھی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے، مگر صرف اسی قدر جس قدر کہ وہ خود چاہے۔ اس کی کرسی (اقتدار) آسمانوں اور زمین پر وسیع ہے، اسکی نگرانی اس پر گراں نہیں ہے۔ وہ بلند وبرتر اور صاحب عظمت ہے۔"

خدا کی ذات وصفات کی جو تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے اس کو اس آیت۔ نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اسی لیے اس کو قرآن کی سب سے بڑی آیت کہا گیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا:۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ۫ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ۬ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا

دین میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہ ہدایت، ضلالت سے پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط رسی تھام لی۔ ایسی رسّی جو ٹوٹ نہیں سکتی، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے اللہ ان لوگوں کا ولی وکارساز ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں پہنچاتا ہے لیکن

---

[1] مسلم، کتاب فضائل القرآن

اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۵۷-۲۵۶)

جن لوگوں نے کفر کیا، طاغوت ان کے ولی و کارساز ہیں، جو ان کو نور سے نکال کر تاریکیوں میں پہنچاتے ہیں۔ یہ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

اوپر خدا کا جو تصور پیش کیا گیا تھا ان آیات میں اس کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا کا یہ تصور ایک نور ہے، جو شخص اس نور سے محروم ہے خدا سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ شیطان اس کا ساتھی ہے اور اسے بھٹکا رہا ہے وہ اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا جب تک کہ جہنم میں نہ پہنچا دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ کون سی روشنی ہے جو انسان کو قرآن سے ملتی ہے۔ انسان کے پاس وہ کیا چیز نہیں ہے جو قرآن اسے دیتا ہے۔ خدا کو پانے میں انسانی فکر نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں قرآن خدا کا ایسا تصور دیتا ہے جو انسانی لغزشوں سے پاک ہے۔ اس روشنی میں جو شخص خدا کو ڈھونڈھے گا، لازمًا وہ خدا تک پہنچے گا اور خدا اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لے گا۔ اسی لیے قرآن کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کو فکر و خیال کی ظلمتوں سے نکال کر حق کی روشنی عطا کرتا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَیُدْخِلُهُمْ فِیْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّیَهْدِیْهِمْ اِلَیْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا ۝ (النساء: ۱۷۴-۱۷۵)

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے لیے ایک نور (قرآن) نازل کیا ہے جو بالکل صاف اور واضح ہے۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیں تو اللہ ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو اپنے در تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ دکھائے گا۔

قرآن نور ہے، جس میں ہم خدا کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ قرآن سے انسان کو خدا ملتا ہے۔ جس شخص کو خدا مل جائے، اس کے کامیاب و بامراد ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ جس کے پاس قرآن ہے اس کے ہاتھ میں دلیل اور برہان ہے وہ دن کے اجالے میں اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ جو اس نور سے

محروم ہے، وہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی راہ تاریک ہے اور منزل نامعلوم۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ (الانعام۔۱۲۳) (ایک وہ شخص جس پر موت طاری تھی، ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کو (حق کی) روشنی عطا کی جس کو لے کر وہ انسانوں کے درمیان چلتا ہے، کیا اس شخص کے مانند ہے جو ظلمتوں میں پڑا ہوا ہے جن سے وہ نکل نہیں سکتا؟)

رسول کی ضرورت

قرآن کا دعویٰ ہے کہ خدا کا صحیح ترین تصور انسانوں کو اس کے رسولوں کے ذریعہ ملتا ہے۔ اس نور کا سرچشمہ خدا کے رسول ہیں۔ کہیں اور سے یہ روشنی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ خدا کی وہی "تعریف" مستند ہے جو اس کے رسولوں نے کی ہے اس تعریف کے خلاف جو بھی تعریف انسانوں نے اپنے طور سے کی ہے وہ خدا پر منطبق نہیں ہوتی۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

پاک ہے تمہارا رب، عزت اور غلبہ والا ان باتوں سے جو یہ اس کے بارے میں بیان کرتے ہیں اور سلامتی ہے خدا کے رسولوں پر اور سب تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔

(صفت: ۱۸۰ تا ۱۸۲)

خدا کو "رب العزت" کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا عظیم اقتدار کا مالک ہے۔ انسان اس کی عظمت اور قدرت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہزار احتیاط کے ساتھ خدا کا تصور قائم کرنے کی کیوں نہ کوشش کرے پھر بھی اس کی عظمت کا صحیح ادراک اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا "امن و سلامتی خدا کے رسولوں کے لیے"۔ اس لیے کہ ان کا تصور خدا ہر قسم کی لغزش سے پاک ہے اسی میں نجات ہے۔ اسی سے انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ اس ایک تصور کے علاوہ ہر تصور غلط اور باطل ہے۔ جو شخص اس سے نجات کی توقع رکھتا ہے وہ مشرق کی طرف چل کر مغرب میں پہنچنے کی امید باندھ رہا ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

پاک ہے اللہ ان کی (غلط اور لغو) باتوں سے۔ ہاں اس کی وہ تعریف صحیح ہے جو اس کے مخلص بندے کرتے ہیں۔

(صفت: ۱۶۰-۱۵۹)

یعنی خدا کے بارے میں وہی تصور اس کے شایان عظمت ہے جو اس کے رسولوں نے اس سے سن کر بیان کیا ہے اور جسے خدا کے نیک بندے پورے تقویٰ اور ایمانداری کے ساتھ اپنے سینوں سے لگائے

ہوئے ہیں۔

قرآن نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی ذات وصفات کا نقشہ اپنے ذہن وفکر سے مرتب کرے۔ خدا وہ ہے جس کا تعارف رسولوں نے کرایا ہے۔ انسانوں کا خود تراشیدہ خدا کائنات کا حقیقی خدا کبھی نہیں ہو سکتا خواہ شب و روز اس کو خدا کے نام ہی سے وہ کیوں نہ یاد کرتے رہیں۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥

(زخرف : ۸۲)

پاک ہے آسمانوں اور زمین کا رب، عرش کا مالک ان باتوں سے جو یہ اس کے بارے میں کرتے ہیں۔

خدا کے رسولوں نے جن قوموں کو خطاب کیا وہ خدا کی منکر نہیں تھیں وہ خدا کو اپنا اور اس کائنات کا خالق مانتی تھیں لیکن اس کے باوجود حقیقی ایمان سے محروم تھیں۔ کیونکہ ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ وہ خدا کا ایک خودساختہ تصور قائم کیے ہوئے تھیں اور اسی کو حقیقت کے عین مطابق سمجھتی تھیں حالانکہ وہ حقیقت سے بہت دور تھا۔ خدا کے بارے میں ان کی معلومات وحی ورسالت سے ماخوذ نہیں تھیں بلکہ وہ وحی ورسالت کو اپنی معلومات کے تابع دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے تصورِ خدا کو اس نقشہ کے مطابق ٹھیک کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں جو خدا کے رسولوں نے پیش کیا بلکہ ان کا مطالبہ تھا کہ خود خدا ان کے نقشے میں فٹ ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے جن قوموں نے رسولوں کے تصورِ خدا کو ماننے سے انکار کیا اور اپنے پندارِ علم اور زعمِ بصیرت میں مست رہے، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب کہ خدا کے غلط تصور کے گھناؤنے نتائج انکے سامنے آگئے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ٥ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ٥ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ

جب ان کے پاس ان کے رسول روشن تعلیمات لے کر آئے تو یہ اپنے ہی علم بصیرت پر نازاں رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس عذاب کا یہ مذاق اڑا رہے تھے اس عذاب نے ان کو گھیر لیا۔ جب انہوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ اب ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور ان ساری چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے، لیکن اس وقت ایمان لانا ان کے لیے مفید نہیں تھا، جب کہ ہمارے

الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المومن: ۸۳: ۸۵) عذاب کو دیکھ چکے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس سے پہلے بھی اس کے بندوں پر جاری رہ چکی ہے۔ اس وقت انکار کرنے والے نقصان میں تھے۔"

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کی معرفت کے لیے کسی معلم اور رہنما کی ضرورت ہے، ان کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے علامہ نصیر الدین طوسی لکھتے ہیں:۔

هم لاینکرون استلزام مقدمات اثبات الصانع لنتائجها لکن نقول هذا وحده لایجزی ولا یحصل به النجاة الا اذا اتصل به تعلیم لقول النبی صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰه الا اللہ وکثیر من الناس کانوا یقولون بالتوحید لکنهم لما لم یاخذوا ذٰلك منه ما کان یقبل قولهم۔۔۔۔ فلو کانت العقول کافیة لقالت العرب نحن نثبت الصانع بعقولنا ونعرف توحیده ولا نحتاج فی ذٰلك الیك[1]

خالق کے اثبات کے لیے جو مقدمات ہیں ان کے لازمی نتائج سے وہ انکار نہیں کرتے لیکن ہم کہتے ہیں کہ تنہا خالق کی معرفت کافی نہیں ہے اور اس سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ (پیغمبر کی) تعلیم نہ شامل ہو جائے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ مجھے لوگوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کریں حالانکہ بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے لیکن چونکہ انہوں نے یہ توحید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ نہیں کی تھی اس لیے آپ ان کے اقرار توحید کو قبول نہیں کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ اگر خدا کی معرفت کے لیے عقل کافی ہو تو اہل عرب پیغمبر سے کہہ سکتے تھے کہ ہم اپنی عقل سے خدا کو ثابت کر سکتے ہیں اور توحید کو جانتے ہیں۔ اس لیے ہم اس معاملہ میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔"

دلائلِ رسالت

خدا کے بارے میں وہی تصور صحیح کیوں ہے جو رسولوں نے پیش کیا ہے؟ کیوں خدا کا ہر تصور لازماً غلط ہے جو رسولوں کے دیے ہوئے تصور سے

---

[1] تلخیص المحصل۔ المطبوع مع محصل افکار المتقدمین الخ مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ صفحہ ۲۶۔ ۲۵۔

ٹکراتا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ خدا کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کو کون سی چیزیں محبوب ہیں اور وہ کن چیزوں سے نفرت کرتا ہے؟ اس کے اقتدار کی کیا کیفیت ہے، اور کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس کا ٹھیک ٹھیک علم خدا ہی کو ہے۔ انسان اپنے ذہن سے ان مسائل کو سمجھ نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے حدود فکر سے باہر ہیں۔ یہ ایسی پوشیدہ حقیقتیں ہیں کہ خدا ہی انہیں کھول سکتا ہے اگر وہ ان کو کھولنا نہ چاہے تو انسان ہمیشہ ان سے ناواقف ہی رہے گا۔ اس لیے قرآن پہلے قدم پر کہتا ہے کہ خدا کا جو بھی تم تصور قائم کرو ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی صداقت کی سند تمہارے پاس موجود ہو، ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنے طور پر کچھ صفات ڈھونڈ رکھے ہیں جن کو خدا کی ذات پر چسپاں کر رہے ہو۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝
(الصفت: ۱۵۶-۱۵۷)

کیا تمہارے پاس کوئی واضح سند ہے؟ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی کتاب (جو خدا کی طرف سے تمہیں ملی ہے) اسے پیش کرو۔

اگر تمہارے پاس خدا کی کتاب نہیں ہے تو یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ محض ظن و تخمین سے خدا کی کوئی تصویر کھینچ لو اور اس کی پرستش شروع کردو۔ جس عمارت کی بنیاد علم و یقین پر نہ رکھی گئی ہو وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ نادان ہے وہ جو سیلاب سے پناہ لینے کے لیے ریت کے ٹیلے پر کھڑا ہو جائے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝
(الاعراف: ۳۳)

تم کہہ دو کہ میرے رب نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ تو یہ ہیں۔ کھلی اور چھپی ہر طرح کی بے حیائی، گناہ اور معصیت، ناحق ظلم اور زیادتی، اور یہ کہ تم خدا کے ساتھ شریک کرو جس کی اللہ نے کوئی سند نہیں اتاری ہے، اور یہ کہ تم اللہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۴۹)

تم ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی بھی علم ہے؟ اگر ہے تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو تم تو محض ظن اور خیال کے پیچھے چلے جا رہے ہو

اور اٹکل پچو سے کام لیتے ہو۔

رسول کا علم قطعی اور یقینی ہے

خدا کے بارے میں تم کوئی بات علم و آگہی کے ساتھ نہیں کہتے بلکہ ہر معاملہ میں ظن اور قیاس کا سہارا لیتے ہو۔ اس کے برعکس خدا کے رسول کو خدا کی طرف سے ہدایت ملتی ہے۔ وہ اندھیرے میں تیر نہیں چلاتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے خدا کی دی ہوئی ہدایت اور بصیرت کے تحت کہتا ہے اس کی تعلیمات اس کے اپنے ذہنی تصورات اور عقلی قیاسات نہیں ہوتے، بلکہ خدا کا کلام براہِ راست اس کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ (الحج: ۷۵) (اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے اپنے رسول منتخب کرتا ہے)۔ بہت سی حقیقتیں جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں، وہ اس پر کھول دی جاتی ہیں، وہ ان حقیقتوں کا اس طرح مشاہدہ کرتا ہے جس طرح دن کی روشنی میں تم ٹھوس اور مادی چیزوں کو دیکھتے ہو۔

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ ۝ ذِیْ قُوَّۃٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ۝ وَمَا صَاحِبُکُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَلَقَدْ رَاٰہُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ ۝ وَمَا ھُوَ عَلَی الْغَیْبِ بِضَنِیْنٍ ۝ وَمَا ھُوَ بِقَوْلِ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ۝ فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝

(التکویر: ۱۹ تا ۲۷)

بے شک یہ ایک بزرگ اور محترم فرشتہ کا قول ہے (جو خدا کی طرف سے پیغمبرؐ تک پہنچا رہا ہے) وہ قوت والا ہے۔ عرش والے کے نزدیک اس کا ایک اونچا مقام ہے۔ اس کی بات سنی جاتی ہے اور وہ وہاں امین مانا جاتا ہے۔ تمہارا ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے اس کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ اور نہ وہ غیب کے معاملہ میں بخیل ہے (کہ کچھ کو چھپا دے اور کچھ کو ظاہر کر دے) اور نہ یہ شیطان کا قول ہے، جس کو خدا کے دربار سے نکالا جا چکا ہے۔ پس تم کہاں چلے جا رہے ہو، یہ تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔"

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ

قسم ہے ثریا کی جب وہ جھکتی ہے۔ تمہارا ساتھی نہ تو بہکا اور نہ بے راہ ہوا۔ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو وحی ہے جو اس کی

يُّوْحٰى ۙ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

(النجم : ۱ - ۱۸)

طرف بھیجی جا رہی ہے۔ جس کی تعلیم اس کو مضبوط قوتوں والے (فرشتہ) نے دی ہے جو زور آور ہے۔ پس وہ سیدھا ہوا۔ اس وقت وہ بلند افق پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا (اور اس قدر قریب ہوا) کہ دو کمان کے برابر فرق رہ گیا، یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا۔ پس اس نے خدا کے بندے (پیغمبر) کی طرف وحی کی جو کچھ کرنا تھی۔ پیغمبرؐ نے جو کچھ دیکھا اس کے دل نے اس کا انکار نہیں کیا۔ تو جس چیز کو وہ دیکھ رہا ہے اس کے بارے میں تم اس سے جھگڑا کرتے ہو۔ اس نے اس فرشتے کو ایک دوسری بار بھی اترتے دیکھا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں کہ جنت الماویٰ ہے، جب کہ سدرۃ المنتہیٰ پر چھا رہا تھا وہ جو چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ تو بہکی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

خدا کا رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے وحی آتی ہے اور وہ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ جو لوگ رسول کے اس دعوے کی مخالفت کرتے ہیں ان آیات میں ان کا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حقیقت جو تم سے نہاں ہے اگر کسی دوسرے پر کھل گئی ہے تو تم کس بنیاد پر اس کی تردید کرتے ہو؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جس واقعہ کا تمہیں علم نہیں ہے اس وسیع کائنات میں اس کا وجود بھی نہیں ہے۔ حالانکہ بے شمار واقعات اور حقیقتیں تمہاری نگاہوں سے مخفی ہیں لیکن تم ان کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اپنے وجود میں تمہارے علم کی پابند نہیں ہیں۔ تم اگر ان کو مانتے ہو تو حقیقت کا اعتراف کرتے ہو لیکن تمہارے انکار سے ان کے وجود کی نفی نہیں ہو سکتی۔

خدا کا رسول بار بار جس چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے، تمہارے نہ ماننے کی وجہ سے کیسے یقین کر لے کہ اس کا مشاہدہ غلط ہے؟ جن حقیقتوں کو اس کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں، جن کے بارے میں اس کا دل

گواہی دے رہا ہے کہ وہ حق ہیں اور جن کے سمجھنے اور ادراک کرنے میں اس کو یقین ہے کہ اس نے دھوکا نہیں کھایا ہے وہ ان کو کبھی جھٹلا نہیں سکتا، خواہ تم ان کا ہزار بار انکار کرو اور قیامت تک کرتے رہو، تمہاری تکذیب کے ڈر سے اس کے لیے ممکن نہیں کہ رات کو دن اور دن کو رات قرار دے دے۔ وہ یقین کی اس منزل تک پہنچ چکا ہے کہ تمہارے اعتراف سے نہ تو اس میں کوئی اضافہ ہونے والا ہے اور نہ تمہارے انکار سے اس میں کوئی کمی آسکتی ہے۔

تم کہہ سکتے ہو کہ رسول اپنے دعوے میں جھوٹا ہے اور اس کو خدا کی طرف سے کوئی روشنی نہیں ملی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اندھیرے میں رہ کر کوئی شخص خدا کی ذات وصفات کا تعین کر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی فکر از خود خدا کو پالے؟ کیا اس کی مثال کوئی اور بھی ہے کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے بغیر کسی کو خدا کی مکمل معرفت حاصل ہوگئی ہو؟ جس شخص پر جھوٹا الزام لگایا جا رہا ہے کیا اس نے دعوی رسالت سے پہلے خدا کے بارے میں کسی خاص تصور کا اظہار کیا تھا؟ اگر اس کا اظہار نہیں کیا تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ خدا کی وحی کے بغیر وہ خود بھی خدا کو پانے سے عاجز ہے؟

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(یونس: ۱۵-۱۶)

جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان میں سے وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کا یقین نہیں ہے، کہتے ہیں کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ اس کو اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے، اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔ ان سے کہو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر نہ سناتا اور نہ اس کے بارے میں کوئی علم دیتا۔ اس سے پہلے میں تمہارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں تو پھر تم عقل سے کیوں کام نہیں لیتے؟

یعنی یہ مطالبہ کہ قرآن کو بدل دیا جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے، اس بنیاد پر ہو رہا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس کی زبان سے یہ سنا جا رہا ہے حالانکہ انسان اگر کھلی عقل سے کام لے تو صاف معلوم کر سکتا ہے کہ قرآن نہ اس کی تصنیف ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب تک خدا کی طرف سے اس کا نزول نہ ہو کوئی بھی شخص اس کو اپنی طرف سے دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اگر خدا اس قرآن کو زمین پر نہ اتارے تو ناممکن ہے کہ انسانی ذہن اس کی بلندی کو پالے۔ علم و عرفان کے جو چشمے اس وقت جاری ہیں وہ خدا کے جاری کردہ ہیں، وہ اگر نہ چاہے تو یہ خشک ہو جائیں۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا فَاِنْ یَّشَاِ اللّٰہُ یَخْتِمْ عَلٰی قَلْبِکَ وَ یَمْحُ اللّٰہُ الْبَاطِلَ وَیُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِہٖ اِنَّہٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ه	کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر خدا پر افتراء پردازی کر رہا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو (اے پیغمبر) تمہارے دل پر مہر لگا دے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلمات کے ذریعہ باطل کو مٹاتا اور حق کو جماتا ہے۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

(الشوریٰ - ۲۴)

کائنات رسول کی تائید کرتی ہے

رسول کو خدا کی طرف سے وحی آتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ پوری کائنات اس کی تصدیق کر رہی ہے۔

ہم خالقِ کائنات کی تلاش میں چلے تھے، ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کن صفات اور خصوصیات کا حامل ہے؟ اتنے میں خدا کا رسول ہمارے سامنے آتا ہے اور خالقِ کائنات کے اوصاف و کمالات بیان کرتا ہے۔ یہ سن کر کائنات ہر طرف سے پکار اٹھتی ہے کہ ہاں میرا خالق وہی ہے جس کا تعارف خدا کا رسول کرا رہا ہے۔ اگر ہم رسول کے تصورِ خدا کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو خدا کا جو بھی تصور ہم قائم کرتے ہیں کائنات کا ذرّہ ذرہ اس کی تکذیب کے لیے آمادہ ہے۔

قرآن پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ کائنات کا صحیح مطالعہ اور رسول کی تعلیمات دونوں ایک ہی حقیقت تک انسان کو پہنچاتے ہیں۔ خدا کا رسول خدا کا ایسا تصور نہیں دیتا جو مشاہدۂ کائنات کے خلاف ہو بلکہ کائنات کے ہر گوشے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کائنات پر جو بھی شخص غور کرے گا وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ رسول کی بات، کائنات کی تخلیق اور اس کے مقصد سے پوری طرح

ہم آہنگ ہے۔ وہ الفاظ میں جس حقیقت کا اظہار کر رہا ہے، اسی حقیقت کا اظہار یہ کائنات اپنی ساخت اور وجود سے کر رہی ہے۔ اگر انسان نے کائنات کا صرف سطحی مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی ہے تو کبھی رسول کے دعوے کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اس کو رسول کی باتیں عقل سے قریب تر معلوم ہوں گی اور وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا کہ رسول خدا کا مقرر کیا ہوا شارح کائنات ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ○

(الاعراف: ۱۸۴-۱۸۵)

کیا انہوں نے سوچا نہیں کہ ان کے ساتھی (پیغمبر) کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو خدا کی طرف سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہے۔ (آخر وہ کیوں پیغمبر کو جھٹلا رہے ہیں) کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کے اقتدار اور جس چیز کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے اس پر غور نہیں کیا؟ بہت ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب آچکی ہو پس کس بات پر وہ اس کے بعد (رسول کو جھٹلانے کے بعد) ایمان لائیں گے۔

خدا کا جو تصور اس کا رسول پیش کرتا ہے، اس کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ حقیقت کے عین مطابق ہے، اس کے پیچھے علم وبصیرت ہے اور وہ کائنات سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس لیے جو بھی تصور اس سے ٹکرائے گا لازمًا اس کی کوئی علمی وعقلی بنیاد نہ ہوگی۔ وہ کائنات سے قطعًا غیر ہم آہنگ اور خلاف حقیقت ہوگا۔ اس کو ماننا باطل کو ماننا اور حق کو جھٹلانا ہے۔

بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (المومنون: ۹۰)

ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے دعوی میں جھوٹے ہیں۔

قُلْ اِنِّيْ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ

(الانعام: ۵۷)

تم کہہ دو کہ میں اپنے موقف پر خدا کی طرف سے دلیل اور حجت رکھتا ہوں۔ اور تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ

یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کے پاس ایسی کتاب

فَصَّلۡنٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ هُدًى وَّرَحۡمَةً — لائے ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کی بنیاد پر کی ہو۔
لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ — یہ ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی جو بھی صفت ثابت کی جائے کائنات کے مطالعہ سے اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔ اگر مشاہدہ اس کو جھٹلا رہا ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اس خدا کی صفت نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے اور جو اس کائنات کا خالق ہے۔ جو لوگ رسول کے تصورِ خدا کی مخالفت کرتے ہیں قرآن ان کو چیلنج کرتا ہے تم جو تصورِ خدا پیش کرتے ہو اس کے لیے اس کائنات میں کہیں سے کوئی ثبوت فراہم کردو۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ مَّا تَدۡعُوۡنَ — اے پیغمبر! ان سے پوچھو کیا تم نے ان معبودوں
مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَرُوۡنِىۡ مَاذَا خَلَقُوۡا — کے بارے میں غور بھی کیا ہے جن کو تم خدا کے سوا
مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ — پکارتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین کی کونسی
فِى السَّمٰوٰتِ ؕ اِيۡتُوۡنِىۡ بِكِتٰبٍ — چیز پیدا کی ہے ؟ یا ان کا آسمان میں کوئی حصہ ہے؟
مِّنۡ قَبۡلِ هٰذَاۤ اَوۡ اَثٰرَةٍ مِّنۡ — تمہارے پاس اس سے پہلے کوئی کتاب ہو یا علم کی
عِلۡمٍ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ — کوئی نشانی ہو تو اسے پیش کرو، اگر تم اپنے
(الاحقاف : ۴) — دعوے میں سچے ہو۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدۡعُوۡنَنِىۡۤ اِلَيۡهِ — یہ قطعی ہے کہ جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو
لَيۡسَ لَهٗ دَعۡوَةٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَا — (خود) اس کی کوئی دعوت (تعلیم) نہ دنیا میں
فِى الۡاٰخِرَةِ (المومن : ۴۳) — ہے اور نہ آخرت میں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کا مطالعہ خدا کے رسول کی سراپا تصدیق بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے کائنات میں ہر طرف سے اس کی تائید ہوتی ہے اور کہیں سے اس کے خلاف کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس کے برعکس جو لوگ رسول کی مخالفت کر رہے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے وہ حق و صداقت کا مقابلہ دلیل اور حجت سے نہیں بلکہ صرف زورِ بیان اور مناظرہ سے کرنا چاہتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ — لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کے بارے
بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا — میں جھگڑتے ہیں جب کہ نہ تو ان کے پاس کوئی علم ہو

کِتَابٍ مُّنِیۡرٍ ○   نہ کوئی ہدایت اور نہ کوئی روشنی دینے والی
(لقمان ۳۱ : ۲۰)   (آسمانی) کتاب۔

ایسے لوگ خدا تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ خدا تک پہنچنے کی تمام راہیں انہوں نے اپنے لیے بند کر رکھی ہیں۔ لیکن اگر آپ رسولوں کے تصورِ خدا کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں تو آپ کو قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہم اپنی بحث میں اس قطعی نتیجہ تک پہنچ چکے ہیں کہ خدا کی معرفت کا سوائے قرآن مجید کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسی سے خدا کا صحیح تصور ہمیں مل سکتا ہے۔ آئیے اب اس تصور کا پوری تفصیل سے جائزہ لیں، اور خدا کو خود اس کی اپنی کتاب میں تلاش کریں۔

فصل اوّل

خدا کی ذات

قرآن کے تصورِ خدا کو سمجھنے کے لیے پہلے ان سوالات کو متعین کرنا ہوگا۔ جو خدا کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ تاکہ ہمارا مطالعہ بہت ہی واضح ہو اور الگ الگ ہم ان پر غور کر سکیں۔ یہ سوالات بظاہر چار ہیں:۔

۱۔ کیا خدا ہے؟ یعنی ہماری کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کو حل کیے بغیر خدا کے بارے میں غور و فکر کو ہم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

۲۔ خدا کی صفات کیا ہیں؟ انسان صفات ہی کی مدد سے اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے۔ اس لیے جب تک خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تعین نہ ہو خدا کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

۳۔ خدا کا عمل کیا ہے؟ کائنات کے لیے خدا ایک مؤثر عامل کی حیثیت رکھتا ہے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کائنات میں اس کے عمل کی نوعیت کیا ہے؟ اور وہ یہاں کس قسم کا معاملہ کر رہا ہے؟ اگر یہ جاننے میں ہم ناکام رہے تو کائنات اور خدا کے تعلق کو نہیں سمجھ سکتے۔

۴۔ خدا کیا چاہتا ہے؟[1]

---

[1] ہمارے متکلمین نے خدا کے بارے میں پہلے تین سوالات سے بحث کی ہے۔ متکلمین کے دو بڑے گروہ ہیں۔ اشاعرہ اور معتزلہ۔ اشاعرہ محدثین کے مسلک کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے ان کے نقطۂ نظر کو امت کا قبول عام حاصل ہے۔ امام غزالیؒ کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ امام صاحب نے اپنی بہت سی کتابوں میں اشاعرہ کا مسلک بیان کیا ہے لیکن ان کی تین کتابوں میں اس موضوع پر مستقل بحثیں ہیں (۱) احیاء علوم الدین جلد اول

[illegible] ۱۴۶ [illegible]

آئیے اب ہم ان سوالات پر اسی ترتیب سے غور کریں :-

خدا کا وجود

خدا ہے یا نہیں ؟ یہ خدا کے بارے میں غور و فکر کے سلسلے کا سب سے پہلا اور بنیادی سوال ہے۔ یہ محض کوئی فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ اس کا ہماری زندگی سے بہت ہی گہرا تعلق ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی کے جواب پر ہماری پوری زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر خدا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم اتفاق سے اس دنیا میں نہیں پہنچ گئے، بلکہ ایک پیدا کرنے والا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہم آپ اپنے مالک نہیں رہے، بلکہ اس کی ملک بن گئے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہم آزاد نہیں رہے۔ بلکہ اس کے حکم کے تابع ہو گئے جو ہمارا خالق ہے۔ لیکن اگر خدا نہیں ہے تو ہم اپنی زندگی کے آپ مالک ہیں اور من مانی کر سکتے ہیں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہماری کسی روش پر تنقید کرے اور اسے غلط قرار دے۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب تلاش کیا جائے۔ تاکہ ہم پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے لیے کوئی راہ متعین کر سکیں۔ جو شخص اس سوال سے اعراض کرتا ہے وہ اپنے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیتا ہے، کیونکہ اگر فی الواقع خدا ہے اور اس کے باوجود اس نے وہ روش اختیار کی جو مخلوق کو زیب نہیں دیتی تو اس میں شک نہیں کہ وہ بہت بڑا مجرم ہے۔ عقل کہتی ہے کہ ایسے مجرم کو لازماً اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ خدا کے رسول اسی سوال پر انسانیت کو چونکاتے ہیں۔ خدا کے وجود کا امکان اس بات کا الارم ہے کہ انسان کو خدا کے بارے میں جلد از جلد کسی فیصلہ پر پہنچنا چاہیے۔ جو شخص اس الارم کو سننے کے باوجود اپنی غفلت سے نہیں چونکتا وہ بہت بڑا نادان ہے اور اسے اپنے انجام کی فکر نہیں ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

(۲) الرسالۃ القدسیہ (۳) الاقتصاد فی الاعتقاد۔ اپنی دوسری کتاب کی متعلقہ بحث انہوں نے احیاء علوم الدین میں بھی نقل کی ہے۔ "احیاء علوم" عام لوگوں کے لیے ہے۔ اوسط درجہ کا طبقہ "الرسالۃ القدسیہ" کا مخاطب ہے۔ اور "الاقتصاد فی الاعتقاد" کا انداز زیادہ تر علمی ہے۔ امام غزالیؒ سے پہلے ان مسائل پر جو بحثیں ہوتی رہی ہیں امام صاحب نے ان کو اپنی کتابوں میں سمیٹ لیا ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ علمی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اشاعرہ کی نمائندگی کرنے والی بعد کی تحریروں میں اس پر بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ عموماً ان ہی خیالات کو دہرایا گیا ہے۔ چوتھا سوال تصوف کا موضوع رہا ہے اور علماء تصوف نے اس پر بڑی تفصیلی بحثیں کی ہیں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ۝ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ۝ اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝

(ص۔ ۶۵ تا ۶۸)

اے پیغمبر! ان سے کہدو میں تو محض ڈرانے والا ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے وہ اکیلا ہے اور بڑے غصہ والا ہے۔ وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے وہ غالب اور مغفرت کرنے والا ہے، کہدو کہ وہ بہت بڑی خبر دے رہا ہے اور تم ہو کہ اس سے اعراض کر رہے ہو۔

کائنات ایک حقیقت ہے

خدا کے وجود و عدم وجود کا سوال اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب کہ ہم اس کائنات کو ایک فرضی اور موہوم شے قرار دے لیں۔ لیکن اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو یہ سوال ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر وقت ہم سے اپنا جواب چاہے گا۔ کائنات کو واقعہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ہم اس سوال کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس سوال سے بھاگنے کی کوشش کی انہوں نے کائنات کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ دورِ قدیم اور عہد جدید دونوں میں آپ کو ایسے فلسفی ملیں گے جن کے نزدیک کائنات محض وہم و خیال کا کرشمہ ہے اور اس کا کوئی ٹھوس اور واقعاتی وجود نہیں ہے۔ ایک سائنس داں کے بقول :۔

"اس نقطۂ نظر کے مطابق گویا صورت حال یہ ہے کہ خیالی گاڑیاں جو بظاہر فرضی مسافروں سے لدی ہوئی ہیں، غیر حقیقی دریاؤں کے تصورات کے ساختہ و پرداختہ پلوں کے ذریعہ عبور کر رہی ہیں"

یہ نقطۂ نظر ہمارے نزدیک کائنات کی بہت ہی غلط تعبیر پیش کرتا ہے۔ جو لوگ کائنات کو محض خیال کہتے ہیں ان کو کم از کم خیال کے وجود سے انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کوئی تو چیز ہے جسے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارا "خیال" خیال اور حقیقت میں فرق کرتا ہے ان کے نزدیک تصور کی دنیا اور واقعات کی دنیا اپنا الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ انسان خواب میں جو معاملہ کرتا ہے وہی معاملہ بیداری میں بسا اوقات مناسب نہیں سمجھتا۔ ذہنی دنیا اشیاء کے متعین حدود سے آزاد ہوتی ہے لیکن ذہن سے باہر کی دنیا میں ہر چیز حدود سے گھری ہوئی ہے۔ آخر یہ فرق کہاں سے آیا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک خیال ہے۔ ذہن

اور خارج میں فرق و امتیاز اور اشیا کی حد بندی بھی ہمارے خیال ہی کی پیداوار ہے۔ لیکن جب یہاں اول و آخر خیال ہی خیال ہے تو حقیقت اور ٹھوس وجود کا خیال کہاں سے آگیا؟

ہم حقیقت کا صرف خیال ہی نہیں کرتے بلکہ ٹھوس حقیقتیں ہی ہم کو مطمئن کرتی ہیں۔ خیال کے پردے پر ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کو ہم ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں۔ لیکن خارج میں ہوتے والے واقعات کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ نہیں ہوتا بلکہ ہم ان کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک خیال ہمارے ذہن میں اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ہم خارج کو اس کے خلاف دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ خارج اگر ہمارے خیال کے برعکس ہے تو ہم اس کو اپنے خیال ہی کے مطابق سمجھ لیں۔ ذہنی طور پر کسی واقعہ نے ہم کو کتنا ہی متاثر کیوں نہ کیا ہو، اگر خارج میں اس کا وجود نہیں ہے تو اس تاثر کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہی خیال ہمیں مطمئن کرتا ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ خارج کی دنیا اس سے ہم آہنگ ہے۔ ہمارے ذہن میں ابھی یہ خیال آجائے کہ ہمارے مکان میں آگ لگ گئی ہے اور ذہن سے باہر یہ واقعہ رونما نہ ہوا ہو تو ہمیں کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ اسی طرح ہم اپنے کسی دوست سے ملاقات کرنا چاہیں اور ذہن میں اس کے پاس پہنچ جائیں اور جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ سن لیں تو ہمارے نزدیک کبھی ملاقات کا مقصد حاصل نہیں ہوتا اسلیے ضروری ہے کہ خارج کی دنیا میں یہ عمل انجام دیا جائے۔ اگر کائنات کو ہم محض فریب سمجھتے ہیں تو عمل کی پوری دنیا اس کے فریب ہونے کو جھٹلا رہی ہے۔ زندگی کا ہر قدم اس یقین کی بنیاد پر اٹھتا ہے کہ کائنات کے کچھ اصول ہیں اور وہ اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ کائنات، فریب اور خیال ہے اور اعتبار کے قابل نہیں ہے تو یہ کتنی بڑی جہالت ہے کہ انسان کائنات کو واقعاتی کائنات مان کر کام کر رہا ہے۔ جو لوگ اسے فریب قرار دیتے ہیں وہ انسان کے عقل وشعور پر بہت بڑا الزام لگاتے ہیں۔

انسان کا یہ احساس کہ کائنات محض خیال نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خارجی حقیقت ہے۔ بجائے خود اس کائنات کے حقیقت ہونے کی زبردست دلیل ہے جب ہم خیال کو مانتے ہیں تو جو چیز خیال کے نزدیک ثابت ہے اس کو بھی ماننا چاہیے۔ اگر یہ سب کچھ خیال ہی ہے تو ایک ایسا خیال ہے جس کو خیال ماننے پر ہمارا ذہن تیار نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اس کو واقعہ قرار دیتے ہیں تو ذہن پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ کائنات اپنا ایک واقعاتی وجود رکھتی ہے۔ حقیقت وہی ہے جس سے

انسان کا ذہن پوری طرح مطمئن ہو جائے اور اس کے خلاف کوئی دوسری صورت اطمینان کی باقی نہ رہے۔

قرآن کے نزدیک کائنات ایک ٹھوس واقعہ ہے لیکن یہ واقعہ ازخود وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کے پیچھے ایک زبردست ارادہ کام کر رہا ہے۔ یہ ایک عظیم تخلیقی منصوبہ ہے جو اپنے منصوبہ ساز کے ارادے اور فیصلہ کے تحت وجود میں آیا ہے۔ اس پہلو سے کائنات کی ابتدا اور اصل اس کے خالق کا ارادہ ہے۔ وہ اپنے وجود سے پہلے ایک "خیال" تھی۔ اور اپنے وجود کے بعد اس "خیال" کا ایک واقعاتی ظہور ہے۔ اس لیے قرآن کے نزدیک خارجی حقائق کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح ہمارے اعمال کی اصل ہمارا خیال اور ارادہ ہے، اور جب وہ عمل کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کا ظہور ہم خارج میں دیکھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کائنات کے بارے میں خدا کا ارادہ عمل میں آیا تو وہ ایک واقعہ بن کر نمودار ہوئی۔

قرآن مجید میں یہ بات کئی ایک مقامات پر کہی گئی ہے۔ یہاں ایک آیت درج کی جاتی ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِذَا قَضٰى	وہ آسمانوں اور زمین کا خالق و موجد ہے اور
اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝	جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اس سے کہتا
(البقرہ : ۱۱۷)	ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے۔

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں ایک خدا کا ارادہ اور پھر اس ارادہ کے مطابق خارج میں واقعہ کا وجود، انسان کی تخلیق کے سلسلہ میں اس حقیقت کو اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان "بے وجود" تھا۔ خدا نے اس کو ایک "وجود" عطا کیا۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ (مریم : ۶۷) (انسان قیامت کا انکار کرتا ہے کیا اس کو یاد نہیں کہ وہ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا ہم نے اس کو پیدا کیا) اسی حقیقت کو "صورت گری" اور "تسویہ" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے یعنی انسان کا وجود محض واہمہ نہیں ہے بلکہ اسے ایک پیکر خاص میں نمایاں کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (الاعراف : ۱۱) (ہم نے تم کو پیدا کیا اور تمہیں صورت عطا کی) اَلَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ (انفطار : ۸) (اللہ ہی ہے جس نے تجھے پیدا کیا اور تیرا تسویہ کیا اور تجھے ٹھیک کیا اس کے بعد جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا) ان آیات میں قرآن نے انسان کے وجود کا اور اس کے ساتھ اس کی ایک خارجی شکل وصوت کا دعویٰ کیا ہے۔

انسان اشیاء کی صرف ظاہری شکل وصورت کو دیکھتا ہے اسی سے ان کا تعین بھی کرتا ہے

اور ان کے ساتھ معاملہ بھی کرتا ہے۔ وہ ان کی حقیقتوں کو نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ لوہے اور لکڑی کی حقیقت کیا ہے؟ البتہ وہ ان کی ظاہری شکلوں سے (گو کہ وہ بدلتی رہتی ہیں) واقف ہے۔ ان ہی ظاہری شکلوں کے لحاظ سے وہ اپنے لیے ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ ان کے مفید پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتا اور مضر پہلوؤں سے بچتا ہے۔ لکڑی کو اس کی ظاہری شکل کے لحاظ سے اس نے اس قابل پایا کہ اس سے میز اور کرسی بنائی جا سکے تو اس مقصد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔ لوہے کو بڑی بڑی مشینوں کے لیے مناسب پایا تو اس سے مشین بنانے لگا جو جانور سواری کے قابل تھے ان سے سواری کا کام لینے لگا اور جو اس مقصد کے لیے بیکار تھے، اگر ان سے کوئی غذائی فائدہ حاصل کر سکتا تھا تو ان کو اپنی غذا میں شامل کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ ہر شے کو ایک خاص ہیئت اور خاص شکل و صورت کہاں سے مل گئی۔ کس نے گھوڑے کو یہ شکل دی کہ تم اس پر سوار ہو سکو؟ کہاں سے درختوں میں یہ خاصیت آگئی کہ وہ پھل دے سکیں؟ یا زمین کو یہ ہیئت کس نے عطا کی کہ وہ تمہارے لیے غلّہ اگا سکے؟ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ یہاں خدا ہے اور اس نے ہر چیز کو ایک خاص شکل اور خاص ہیئت عطا کی ہے اشیاء کی یہ ظاہری صورتیں جن کی وجہ سے تمہارا ان سے خاص نوعیت کا تعلق متعین ہوتا ہے، ماننا پڑے گا کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اس طرح قرآن کے نزدیک کائنات کی ہر چیز اپنے پورے ظاہری وجود کے اعتبار سے خدا کے وجود کی دلیل بن جاتی ہے۔ جو چیز جس شکل میں ہمارے سامنے ہے اسی شکل میں خدا کے وجود کی نشانی اس میں چھپی ہوئی ہے۔ اشیاء کا وجود اگر ثابت ہے تو خدا کا وجود بھی ثابت ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ ۝ وَلَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝ وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِهٖ ۖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْکِرُوْنَ ۝ (المومن: ۷۹ تا ۸۱)	اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے پیدا کیے تاکہ ان میں سے بعض سے سواری کا کام لے سکو اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کا گوشت تم کھاتے ہو۔ اور تمہارے لیے ان چوپایوں میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ چوپایوں کے پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تم ان پر سوار ہو کر اس مقصد کو پہونچو جو تمہارے دلوں میں ہے، اور چوپایوں

اور کشتیوں پر تم لادے جاتے ہو۔ اور خدائے تعالیٰ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔ پس اللہ کی کن کن نشانیوں کا تم انکار کرو گے؟

سورۂ نحل کے شروع میں یہی بات کس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کہی گئی ہے:-

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ط
تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ
مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ
مُّبِیْنٌ ۝ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَکُمْ
فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ ۝
وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ
وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ
اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا
بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّکُمْ
لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ
وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْهَا وَزِیْنَةً ط وَ
یَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَی اللّٰهِ
قَصْدُ السَّبِیْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ط
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝ ع
هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً لَّکُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ
شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝ یُنْۢبِتُ
لَکُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ
وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ کُلِّ
الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً
لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَکُمُ
الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔
اس کی ذات بلند ہے شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔
اس نے انسان کو ایک نطفہ سے پیدا کیا لیکن وہ
اس کے بعد کھلم کھلا جھگڑنے والا نکلا۔ اور اس نے
چوپائے پیدا کیے جن میں تمہارے لیے گرمی حاصل
کرنے کا سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں
اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو، اور تمہارے
لیے ان میں رونق اور جمال بھی ہے جبکہ تم شام کے وقت
ان کو چرا کر گھر واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت جبکہ
تم ان کو چرانے لے جاتے ہو، وہ تمہارے سامان
اٹھا کر ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم انتہائی
محنت و مشقت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ بیشک تمہارا
رب بڑا ہی مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور
گھوڑے اور خچر اور گدھے اس نے پیدا کیے
تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو اور وہ تمہارے لیے زینت
بھی ہیں اور وہ بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا
رہتا ہے جن کو تم جانتے نہیں۔ اور اللہ ہی کے
ذمہ ہے سیدھا راستہ دکھانا اور بعض راستے
ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو سیدھی
راہ پر لے چلتا۔ خدا ہی ہے جس نے آسمانوں سے
تمہارے لیے پانی برسایا جس کو تم خود بھی پیتے ہو اور
اسی پانی سے درخت پیدا ہوتے ہیں جن میں تم

وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۙ وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۙ وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ۝ اَفَمَنْ یَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا یَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

(النحل : ۳ تا ۱۸)

اپنے مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اس پانی کے ذریعہ تمہارے لیے کھیتی اُگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے۔ بیشک اس میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور تارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ بے شک اس میں ضرور نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔ اور اس نے زمین میں مختلف رنگوں کی جو چیزیں تمہارے لیے پھیلا رکھی ہیں، یقیناً ان میں ایک بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اسی کی ذات ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت کھا سکو، اور اس سے اپنے لیے زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں سمندر کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ زمین تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اس نے نہریں جاری کی ہیں اور راستے بنائے ہیں تاکہ تم راہ پاؤ۔ اس نے اور بھی بہت سی نشانیاں قائم کی ہیں اور ستاروں سے بھی لوگ راہ پاتے ہیں۔ پس کیا وہ ذات جو ہر چیز پیدا کرتی ہے اس کی مانند ہے جو کچھ نہیں پیدا کرتا؟ تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے۔"

کائنات کا واقعہ کی شکل میں موجود ہونا قرآن کے نزدیک خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ کیونکہ کائنات کو

بطور واقعہ تسلیم کرنے کے بعد اس کی دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کائنات از خود وجود میں آگئی۔ دوسری یہ کہ اس کا ایک خالق ہے، جس نے اسے وجود عطا کیا ہے۔ پہلی توجیہہ جس شکل میں بھی آئے اسے توجیہہ کہنا دشوار ہے کچھ لوگوں نے اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے اس کو توجیہہ کا نام دے رکھا ہے۔ اسے ہم خدا کے تصور کے خلاف حیرت انگیز جسارت کہہ سکتے ہیں۔ یہ جسارت انہیں اس لیے کرنی پڑی کہ وہ خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ وہ زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس قسم کی جسارت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اگر خدا نہیں ہے تو کیا ہر ہستی آپ اپنی خالق ہے؟ کیا عدم سے وجود اور وجود کے بعد بقا و ترقی کے تمام مراحل اس نے از خود طے کیے؟ یہ توجیہہ عقل سے اس قدر دور ہے کہ عقل کے کھلے ہوئے تقاضوں کو رد کیے بغیر انسان اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ (الطور: ۳۵-۳۶)	کیا وہ بغیر کسی چیز کے پیدا کر دیے گئے یا وہ خود آپ اپنے خالق ہیں؟ انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔
اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔	کیا ان کو اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس حقیقت کو بہرحال ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ خدا نے اس کو پیدا کیا ہے۔ ہر چیز کا وجود، اس کی موت و حیات، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں سب کچھ ایک خاص تناسب کے ساتھ اس کو خدا کی طرف سے ملی ہیں۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ (النمل: ۸۸)	اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط اور محکم بنایا ہے۔
اَلَّذِيْ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ (الفرقان: ۲)	خدا ہی ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ٹھہرایا۔

تین بنیادی اصول

کائنات جن اصولوں پر قائم ہے وہ صاف بتاتے ہیں کہ اس کو ایک صاحبِ شعور اور با ارادہ ہستی نے پیدا کیا ہے اور اسی کے

ہاتھ میں اس کا نظم بھی ہے۔ یہ اصول بظاہر تین ہیں۔ پہلا اصول ہے حرکت و انقلاب۔ کائنات اپنی جگہ جمی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور ہر آن تغیر و انقلاب سے گزر رہی ہے۔ ہماری یہ زمین، چاند، سورج، کہکشاں ہر سیارہ غیر منقطع گردش میں لگا ہوا ہے۔ موسموں کا انقلاب، رات اور دن کی آمد و رفت زندگی اور موت ان میں سے ہر چیز ایک انقلاب ہے جو ہر تھوڑے وقفہ کے بعد برپا ہوتا رہتا ہے۔ کائنات جامد و ساکن ہوتی تو یہ انقلابات جو ہم دیکھ رہے ہیں سراسر ناپید ہوتے اور ان کی جگہ جمود و سکون نظر آتا۔

دوسرا اصول ہے انتخاب۔ اس عظیم کائنات میں جو چیز ابھر کر اوپر آتی ہے اور جو واقعہ رونما ہوتا ہے عقلی لحاظ سے اس واقعہ کے رونما ہونے یا نہ ہونے کا برابر امکان ہے۔ جب کوئی واقعہ وجود میں آتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دی گئی ہے۔ اسی طرح کسی چیز کا فنا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے حق میں عدم اور فنا کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

تیسرا اصول ہے۔ زندگی اور شعور۔ یہ کائنات بے جان اور مردہ کائنات نہیں ہے بلکہ اس میں ہم ہر طرف زندگی اور شعور کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ یہ شعور کسی چیز میں نمایاں اور کسی چیز میں غیر نمایاں ہے لیکن کوئی چیز شعور سے یکسر خالی نہیں ہے۔

ان میں سے ہر اصول خدا کے وجود کا تقاضا کرتا ہے۔ خدا کے بغیر یہ اصول اپنا کام کر ہی نہیں کر سکتے۔ اگر خدا نہیں ہے تو سوال یہ ہے کہ کائنات میں حرکت کیسے پیدا ہو گئی؟ جب یہاں ہر واقعہ کے وجود و عدم کا مساوی امکان ہے تو ان میں سے کسی ایک پہلو کا انتخاب کون کرتا ہے؟ شعور اور زندگی دینے والی کوئی ذات اس کائنات میں نہیں ہے تو یہاں زندگی کی لہر کیسے دوڑ رہی ہے؟

خدا کا انکار کرنے کے بعد ان میں سے کسی سوال کا انسان کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ کائنات کا ایک باشعور اور صاحب ارادہ خالق ہے تو یہ سوالات از خود حل ہو جاتے ہیں۔ قرآن اسی حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ کائنات خدا کی مرضی اور فیصلے کی پابند ہے ہر انقلاب اور تغیر کے پیچھے اسی کا ہاتھ ہے، زمین اور آسمان میں چھوٹا بڑا جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے وہ اسی کے حکم سے رونما ہوتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ	کہو اے اللہ سارے اقتدار کے مالک، تو جسے
مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ	چاہتا ہے اقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا

تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ٥ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ٥

(اٰل عمران ۲۷-۲۶)

ہے اقتدار چھین لیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، ساری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔

کائنات میں صرف خدا کا حکم چلتا ہے، اگر اس کا حکم نہ ہو تو یہ حرکت کرتی ہوئی کائنات اپنی جگہ ٹھہر جائے اور جن انقلابات و تغیرات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ یکسر مٹ جائیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ٥ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥

(القصص: ۷۰ تا ۷۳)

وہی اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اسی کی تعریف ہے دنیا اور آخرت دونوں میں، اور اسی کی حکومت ہے، اور اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔ ان سے کہو کہ بتاؤ اگر اللہ رات کو تم پر ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک کے لیے طاری کر دے تو وہ کون خدا ہے سوائے اللہ کے جو تمہارے پاس روشنی لائے، کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے کہو کہ بتاؤ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے قیامت تک دن کیے رہے تو سوائے اللہ کے وہ کونسا خدا ہے جو تمہارے لیے رات لائے جس میں تم سکون حاصل کر سکو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن مقرر کیے تاکہ تم (رات میں) سکون حاصل کرو۔ اور (دن میں) اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔

اسی طرح ترجیح اور انتخاب کا عمل بھی خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ یہاں کس چیز کو کب تک باقی رکھنا ہے اور کب اسے ختم کرنا ہے۔ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فیصلہ کا حق نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۖ وَالَّذِينَ	اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے، جن
يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ	لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا
بِشَيْءٍ ۗ إِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝	فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ بے شک اللہ سننے والا
(المومن : ۲۰)	اور دیکھنے والا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ	اور تیرا رب ہی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا
مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللّٰهِ	ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے ان کے لیے
وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝	انتخاب کا کوئی اختیار نہیں ہے پاک ہے اللہ کی
(القصص : ۶۸)	ذات، اور بلند ہے ان کے شرک سے۔

افراد کی موت وحیات، غم ومسرت، تونگری ومفلسی سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں نہ اپنے اختیار سے کوئی شخص وجود پاتا ہے اور نہ موت اس کے اختیار میں ہے، نہ دکھ اس کے قابو میں ہے اور نہ سکھ، نہ دولت اس کی اپنی ہے اور نہ غربت وافلاس، ہر چیز خدا کی طرف سے ہے اور اسی کے فیصلہ کے تحت وہ ظاہر ہوتی ہے۔

وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَىٰ ۝	اور بے شک خدا ہی ہنساتا اور رلاتا ہے اور یقیناً
وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتَ وَأَحْيَا ۝ وَأَنَّهُ	وہی مارتا اور جلاتا ہے اور یقیناً اسی نے مرد اور
خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ۝	عورت کے جوڑے پیدا کیے، نطفہ سے جب کہ وہ رحم
مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ۝ وَأَنَّ عَلَيْهِ	مادر میں ٹپکایا جاتا ہے، اور بے شک وہی دوبارہ
النَّشْأَةَ الْأُخْرَىٰ ۝ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَىٰ	اٹھائے گا اور بے شک وہی دولت اور تونگری
وَأَقْنَىٰ ۝ (النجم: ۴۳ تا ۴۸)	عطا کرتا ہے۔

افراد کا عروج وزوال ہی نہیں قوموں کا عروج وزوال بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ سطح زمین پر کب تک کس قوم کو باقی رہنا ہے اور کب اسے ختم ہونا چاہیے۔ اس کا یہ فیصلہ ناقابل تغیر

ہوتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس میں ایک لمحہ کی تقدیم و تاخیر نہیں کر سکتی۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل : ۶۲)

ہر امت کے فنا کا ایک خاص وقت ہے جب اس کا یہ وقت آجاتا ہے تو وہ اس سے ایک گھڑی نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کون ہے جو تم کو زمین میں ایک کے بعد دوسرے کو جانشین بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے؟ بہت کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

یہی معاملہ شعور اور حیات کا ہے۔ کائنات میں شعور اور زندگی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ کسی صاحبِ شعور ہستی نے اسے شعور عطا کیا ہے عقل کے لیے یہی دعوٰی ایک بہت بڑا معمہ ہے کہ کائنات ازخود وجود میں آگئی اور دوسرا معمہ جو اس سے کم نہیں ہے یہ دعوٰی ہے کہ اس میں زندگی بھی خود بخود آگئی۔ صاف بات ہے کہ بے جان مادہ کائنات کا خالق ہے تو کائنات کو بھی بے جان ہی ہونا چاہیے۔ یہ ناممکن ہے کہ جس کائنات میں شعور اور زندگی کے آثار نہیں تھے اس میں کسی شعور پیدا کرنے والے کے بغیر، شعور پیدا ہو گیا ہو۔

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (یونس : ۳۱)

خدا کے سوا وہ کون ہے جو کان اور آنکھوں کا مالک ہے۔

اگر خدا شعور کی قوتیں تم سے چھین لے تو کیا یہ قوتیں ازخود تم کو مل سکتی ہیں؟ کیا اس کائنات میں کوئی ایسا سامان ہے جس سے تم اپنی چھنی ہوئی قوتوں کو حاصل کر سکو؟ اگر یہ کائنات شعور عطا کرنے سے عاجز ہے تو پھر کس دلیل کی بنیاد پر تم صاحبِ شعور خدا کا انکار کرتے ہو؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○ (الانعام : ۴۶)

ان سے پوچھو کہ کیا تم نے غور کیا کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا وہ کون خدا ہے جو تمہیں یہ چیزیں پھر دے سکے؟ دیکھو کہ ہم دلیلیں کس طرح پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ اعراض کرتے ہیں۔

انسان اس کائنات میں سب سے زیادہ احساس اور شعور کی قوتیں رکھتا ہے۔ یہ قوتیں آپ سے آپ اس کو نہیں ملی ہیں۔ بلکہ خدا نے اس کو دی ہیں۔ اس کا پورا وجود، اس کے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ خدا نے اس کے اندر روح پھونکی ہے تب اس نے ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کی ہے، ورنہ ممکن نہیں ہے کہ از خود اس کے اندر قوتِ حیات پیدا ہو جائے۔ خدا نے اسے پہلے زندگی بخشی ورپھر اسے صاحب شعور بنایا۔

اَلَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَهٗ	خدا نے جس چیز کو پیدا کیا بہت خوب پیدا کیا۔
وَبَدَاَ خَلۡقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِیۡنٍ ۚ	اس نے انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی پھر اس نے
ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ	اس کی نسل چلائی ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے،
مَّآءٍ مَّهِیۡنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ	پھر اس نے اس کو ٹھیک کیا اور اس میں اپنی
فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ	روح پھونکی اور تمہارے لیے کان اور آنکھ اور
السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِیۡلًا	دل عطا کیے۔ بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو۔
مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۝ (السجدہ: ۷تا۹)	
قُلۡ هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَ	کہو، خدا ہی کی ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا
جَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ	اور (سننے کے لیے) تمہیں کان اور (دیکھنے کے لیے)
وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ ۝	تمہیں آنکھیں عطا کیں اور (سوچنے سمجھنے کے لیے)
(الملک: ۲۳)	دل دیا (اس کے باوجود) بہت کم تم اس کا شکر ادا کرتے ہو۔

خدا کائنات کی آخری علّت

اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کائنات اپنی تخلیق میں خدا کی محتاج ہے تو ماننا پڑے گا کہ خدا اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ کائنات کا پیدا کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو خود کسی چیز کا محتاج نہ ہو اور کائنات کے ہر احتیاج کو رفع کرے، جو دوسروں کو حرکت دے اور اس پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکے۔ اسی بات کو منطقی زبان میں اس طرح بیان کیا جائے گا کہ کائنات اگر مخلوق ہے تو یقیناً اس کا خالق غیر مخلوق ہے کیونکہ اگر اسے مخلوق مانا جائے تو اس کے لیے بھی ایک خالق کی ضرورت ہوگی۔ یہ سلسلہ

اسی وقت ختم ہوگا جبکہ ہم اس حقیقت کو تسلیم کرلیں کہ خالقِ کائنات کا وجود ذاتی و ازلی ہے اور اسے کسی نے نہیں پیدا کیا ہے۔ غرض یہ کہ خدا کا تصور اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب کہ اس کو ازلی و ابدی مانا جائے۔ کائنات کے ساتھ احتیاج کا تصور وابستہ ہے تو خدا کے ساتھ لازماً بے نیازی کا تصور ہونا چاہیے۔ قرآن اسی پہلو سے خدا کا تعارف کراتا ہے۔

هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (یونس : ٦٨)	وہ بے نیاز ہے۔ اسی کی ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔
يٰاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۤءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○ (الفاطر : ١٥)	اے لوگو! تم محتاج ہو خدا کے اور خدا ہر چیز سے بے نیاز اور ساری تعریفوں کا مستحق ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایسی قوت کو خدائی کا مقام دینا جہالت اور نادانی ہے جس کے تصور کے لیے ایک دوسرے خدا کو ماننا پڑے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (حم السجدہ : ٣٧)	اور رات اور دن اور سورج اور چاند اس کی نشانیوں میں سے ہیں (پھر ان کو سجدہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟) نہ تم سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔

جو لوگ کنکر اور پتھر، لکڑی اور لوہا، زمین اور آسمان، مادہ اور روح ان میں سے کسی بھی چیز کو خدائی کا درجہ دینا چاہتے ہیں ان پر قرآن کا یہی اعتراض ہے کہ وہ خالق نہیں ہیں۔ جو چیزیں خود محتاجِ تخلیق ہوں اور کائنات کی تخلیق میں جن کا کوئی حصہ نہ ہو کس منطق کی بنیاد پر ان کو خدا کہا جائے؟

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل : ١٧)	کیا وہ جو ہر چیز کو پیدا کرتا ہے اور وہ جو کسی چیز کو نہیں پیدا کرتا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ	یہ جن لوگوں کو خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ
لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ	کسی چیز کو نہیں پیدا کرتے بلکہ وہ خود پیدا کیے
اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ	گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ وہ یہ
اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ۝ (النحل: ۲۰-۲۱)	بھی نہیں جانتے کہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے؟

اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدا کائنات کی آخری علّت ہے۔ ہر چیز کو وجود اس کی طرف سے ملتا ہے اور خود اس کا وجود کسی کا عطا کردہ نہیں ہے بلکہ وہ آپ سے آپ موجود ہے۔ ہم اس کے وجود کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی ابتدا کا تصور ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

خدا ایک غیر محدود ذات

خدا کائنات کی علت ہے تو وہ غیر محدود ہے اور اس کی ذات کا احاطہ کسی طرح ممکن ہے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِہٖ عِلْمًا (طٰہٰ ۱۱۰) (وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے) اس کی ابتداء کا نہ ہمیں علم ہے اور نہ ہم اس کی انتہا کو جانتے ہیں۔ وہ اس وقت بھی تھا جب کہ کائنات نہیں تھی۔ کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ شَیْءٌ قَبْلَہٗ۔[1] (خدا تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی) اور اس وقت بھی ہوگا جب کہ کائنات کی ایک ایک چیز فنا ہو جائے گی۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔ الرحمٰن، ۲۶-۲۷ (زمین پر جتنی چیزیں ہیں سب فنا ہونے والی ہیں صرف تمہارے رب کی بزرگی اور عظمت والی ذات باقی رہ جائے گی) وہ "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" (زندہ اور قائم و دائم) ہے، وہ حیات بے پایاں ہے، اس پر کبھی عدم طاری نہیں ہوا اس کا تصور زندگی کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے، وہ موت سے نا آشنا ہے اس کی صفت ہے اَلْحَیُّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (زندہ جسے کبھی موت اور فنا نہیں) وہ ایسی ذات ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ زمین و آسمان کی ساری قوتیں صرف کر دی جائیں تب بھی اس کی ذات و صفات کے حدود کو پانا ممکن نہیں۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمَاتُ اللّٰہِ لقمان ۲۷ (زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان سب کے قلم بنا دیے جائیں اور موجودہ سمندر کے ساتھ سات اور سمندر ملا دیے

---

[1] بخاری، کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء

جائیں اور ان کو روشنائی کے لیے استعمال کیا جائے تو بھی اس کے ذریعہ کلماتِ الٰہی ضبطِ تحریر میں پوری طرح نہیں لائے جا سکتے۔ روشنائی ختم ہو جائے گی اور قلم گھس جائیں گے لیکن خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے)

کائنات کی محدودیت خدا کی غیر محدودیت کو ثابت کرتی ہے وہ اس طرح کہ کائنات کا ایک آغاز ہے ظاہر ہے جو چیز اپنا آغاز رکھتی ہے لازماً اس کا ایک انجام بھی ہوگا۔ ہر ابتدا کی ایک انتہا ضروری ہے۔ آپ ایک، دو، تین چار اور اس کے بعد کے عدد مسلسل لکھتے چلے جائیے کہیں نہ کہیں پہنچ کر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اسی طرح یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جو چیز اپنے ایک آغاز کے ساتھ بڑھتی ہے خواہ اس کی وسعت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، وہ پھر اپنے آغاز پر پہنچائی جا سکتی ہے۔ ایک عدد ترقی کر کے ہزار تک پہنچ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزار کو گھٹا کر پھر اسی عدد تک اسے لایا بھی جا سکتا ہے۔ جو چیز اپنی ابتدا اور انتہا سے اس طرح گھری ہو وہ لازماً محدود ہوگی۔ خدا وہ ہے جو محدودیت کا آغاز کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں خدا '' بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (آسمانوں اور زمین کا خالق وموجد) ہے گویا خدا کو ماننے والا ایک ہستی پر یقین رکھتا ہے جو اپنا آغاز نہیں رکھتی البتہ اس سے دوسروں کو آغاز ملتا ہے۔ جب خدا کی کوئی ابتدا ہی نہیں ہے تو اس کی انتہا بھی نہیں ہے۔ جو چیز عدد سے باہر ہے اس کو ہم اپنے حساب کے دائرہ میں نہیں لا سکتے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (خدا کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے) لیکن وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا طٰہٰ ۱۱۰ (انسانوں کا علم خدا کا احاطہ نہیں کر سکتا۔)

خدا مادیت سے پاک ہے

خدا غیر محدود ہے اس لیے وہ مادی خصوصیات سے پاک ہے۔ ہر مادی وجود کچھ خاص اجزا سے مرکب ہوتا ہے اسی وجہ سے اس میں محدودیت پیدا ہوتی ہے۔ ہم تجزیہ کر کے بتا سکتے ہیں کہ انسان کا جسم کن اجزا سے ترکیب پاتا ہے اور پانی میں کونسے اجزاء شامل ہیں۔ اجزا کی یہ ترکیب خدا کی قدرت سے وجود میں آتی ہے۔ خدا کی قدرت نہ ہو تو نمک، لوہے اور چونے جیسی چند چیزیں انسانی پیکر میں ڈھل نہیں سکتیں۔ اگر ہم خدا کو بھی کوئی مادی وجود مانتے ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غیر محدود نہیں ہے اور چند اجزائے خاص سے مرکب ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کو کائنات کی حقیقی علت نہیں مانتے۔ کیونکہ ہر مادی وجود اس بات کا محتاج ہے کہ وہ جن اجزاء سے ترکیب یافتہ ہے اس کو ترکیب دینے والا کوئی پایا جائے اسی لیے قرآن کے نزدیک خدا کا اپنا ایک وجود ہے، لیکن اس کا

وجود ہر مادی وجود سے مختلف ہے۔ وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کسی بھی چیز سے مشابہت نہیں رکھتا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا ۝ (مریم : ۶۵)

وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ان چیزوں کا بھی جو ان کے درمیان ہیں پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر جمے رہو۔ کیا تم اس کا مماثل اور ہمسر کہیں دیکھتے ہو؟

سورہ شوریٰ میں ہے:

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱۱)

اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

یعنی گو کہ خدا سنتا اور دیکھتا ہے لیکن ہم کسی بھی سننے اور دیکھنے والے وجود سے اس کی تشبیہ نہیں دے سکتے۔ وہ کائنات کی ہر چیز سے جدا ہے اور کوئی چیز اس جیسی نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

قد علم بالشرع مع العقل ان اللہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیء لا فی ذاتہ ولا فی صفاتہ ولا فی افعالہ کما قال اللہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیءٌ وقال تعالیٰ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِیًّا وقال تعالیٰ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وقال تعالیٰ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ وقد علم بالعقل ان المثلین یجوز علیٰ احدهما ما یجوز علی الآخر ویجب له ما یجب له ویمتنع علیه ما یمتنع علیه فلو کان المخلوق مماثلا للخالق للزم اشتراکهما فیما یجب

شریعت اور عقل دونوں سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مشابہت نہیں رکھتی نہ تو اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے صفات میں اور نہ اس کے افعال و اعمال میں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اس جیسی کوئی چیز نہیں" اور فرمایا "کیا تمہارے علم میں اس کا کوئی ہمسر ہے"۔ ایک اور جگہ فرمایا: "جانتے بوجھتے تم اس کے لیے شرکاء نہ ٹھہراؤ" ایک اور مقام پر فرمایا "اس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں ہے"۔ یہ ایک خالص عقلی بات ہے کہ دو چیزیں جب ایک دوسرے کے مماثل ہوں تو ان میں سے ایک کے بارے میں وہ ساری باتیں جائز ہوں جو دوسری کے لیے جائز ہیں۔

ويجوز ويمتنع والخالق يجب وجوده وقدمه والمخلوق يستحيل وجوب وجوده وقدمه بل يجب حدوثه وامكانه فلو كانا متماثلين للزم اشتراكهما في ذلك فكان كل منهما يجب وجوده وقدمه ويمتنع وجوب وجوده وقدمه ويجب حدوثه وامكانه فيكون كل منهما واجب القدم واجب الحدوث واجب الوجود ليس واجب الوجود يمتنع قدمه لا يمتنع قدمه وهذا جمع بين النقيضين [1]

اور ایک کے لیے جو ضروری ہوگا وہ دوسرے کے لیے بھی ضروری ہوگا اور جو ایک کے لیے ممتنع اور محال ہوگا وہ دوسرے کے لیے بھی محال ہوگا۔ پس اگر مخلوق خالق سے مشابہ ہے تو لازماً ان دونوں میں اشتراک ان ساری باتوں میں ہوگا جو (ان میں سے کسی ایک کے لیے) ضروری یا جائز یا محال ہیں۔ خالق وہ ہے جس کا وجود و قدم واجب ہے (یعنی یہ اس کی ذاتی خصوصیات ہیں ان میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے) مخلوق کے بارے میں یہ بات محال ہے، نہ اس کا وجود ذاتی ہے اور نہ وہ قدیم ہے۔ بلکہ اس کا حادث اور ممکن ہونا ضروری ہے۔ پس اگر دونوں کو مماثل مانا جائے تو دونوں کا ان تمام باتوں میں اشتراک لازم آتا ہے۔ ایک طرف خالق اور مخلوق دونوں واجب الوجود اور قدیم ہوں گے ساتھ ہی ان کا واجب الوجود اور قدیم ہونا محال بھی ہوگا اور ضروری ہوگا کہ وہ حادث اور ممکن ہوں۔ اسی طرح ہر ایک کا قِدَم بھی واجب ہوگا اور حدوث بھی واجب ہوگا۔ ہر ایک واجب الوجود بھی ہوگا اور واجب الوجود نہیں بھی ہوگا ان کا قدیم ہونا محال بھی ہوگا نہیں بھی ہوگا اور یہ صراحتاً دو نقیضوں کے درمیان جمع کرنا ہے۔"

امام رازی فرماتے ہیں :۔

"خدائے تعالیٰ کا کوئی مادی جسم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جسم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور قرآن کے بقول خدا کسی سے مشابہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات قرآن کے نص کے صریح خلاف ہوگی کہ ہم خدا کو مادی جسم مانیں۔"

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص۸ مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ (فتاوی ابن تیمیہ الجزء الخامس)

اس کے بعد امام موصوف نے ایک سوال اٹھایا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح انسان اور گھوڑا دونوں جسم رکھتے ہیں لیکن اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس طرح کیا یہ ممکن نہیں کہ خدائے تعالیٰ کا بھی کوئی جسم ہو اور اس میں وہ خصوصیات نہ ہوں جو کائنات کے دوسرے اجسام میں پائی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

والجواب من جهتين الاولیٰ انا سنقيم الدلالة علیٰ ان الاجسام كلها متماثلة فی تمام الماهية فلو كان تعالیٰ جسما لكان ذاته مماثلا لسائر الاجسام وذلك يخالف لهذا النص والانسان والفرس ذات كل واحد منهما مماثلة لذات الأخر والاختلاف انما وقع فی الصفات والاعراض والذاتان اذا كانتا متماثلتين لكان اختصاص لكل واحدة منهما بصفاته المخصوصة من الجائزات لا من الواجبات لان الاشياء المتماثلة فی تمام الذات والماهية لا يجوز اختلافهما فی اللوازم فلو كان الباری تعالیٰ جسما لوجب ان يكون اختصاصه بصفاته المخصوصة من الجائزات ولو كان كذلك لزم

اس کا جواب دو پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے ایک پہلو تو یہ ہے کہ اجسام سارے کے سارے اپنی ماہیت میں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ ہم اس مسئلہ پر آگے چل کر دلیل دیں گے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ جسم ہوتا تو اس کی ذات بھی دوسرے اجسام کے مماثل ہوتی اور یہ بات اس نص قرآنی کے خلاف ہے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے) انسان اور گھوڑا ان میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے مماثل ہے اختلاف جو کچھ ہے وہ صفات اور اعراض میں ہے۔ دو ذات جب مماثل ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا اپنی مخصوص صفات کے ساتھ اختصاص ضروری نہیں ہے بلکہ صرف جائز ہے (یعنی وہ اختصاص ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا)، کیونکہ جو اشیاء اپنی اصل ذات اور ماہیت میں مماثل ہیں، ان کا اپنے لوازم میں اختلاف جائز نہیں ہے۔ اس لیے اگر اللہ تعالیٰ جسم ہے تو ضروری ہے کہ اس کا اپنی مخصوص صفات

افتقاره الى المدبر والمخصص و
ذلك يبطل القول بكونه تعالىٰ
الٰه العالم۔ الثانی ان بتقدیر
ان یکون ھو تعالیٰ مشارکاً لسائر
الاجسام فی الجسمیة ومخالفا لها
فی الماھیة المخصوصة یجب
وقوع الکثرة فی ذات اللّٰه تعالیٰ
لان الجسمیة مشترکة فیما بین اللّٰه
وبین غیره وخصوصیة ذاته
غیر مشترکة فیما بین اللّٰه تعالیٰ
وبین غیره ومابه المشارکة غیر
مابه الممائزة وذلك یقتضی
الترکیب فی ذاته المخصوصة
وکل مرکب ممکن لا واجب علیٰ
ما بیناه فثبت ان ھذا السوال
ساقط واللّٰه اعلم[1]

کے ساتھ اختصاص صرف جائز ہو۔ اگر یہ بات
مان لی جائے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ
خدائے تعالیٰ کسی مدبر اور مخصص کا محتاج ہو
اور اس سے یہ قول باطل قرار پا جائے گا کہ خدا
سارے عالم کا الٰہ ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ
اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ اللّٰہ تعالیٰ صرف
جسم کے معاملہ میں دوسرے اجسام کے ساتھ
شریک ہے۔ اور اپنی مخصوص ماہیت میں
وہ دوسروں سے مختلف ہے تو اس سے خدا
کی ذات میں کثرت لازم آتی ہے کیونکہ جسمیت
خدا اور غیر خدا دونوں میں مشترک ہے اور
اس کی ذات کی مخصوص خصوصیات کسی
دوسرے میں نہیں پائی جاتیں اس طرح
خدا میں دو مختلف قسم کی چیزیں جمع ہو جاتی
ہیں ایک وہ جو خدا اور غیر خدا میں مشترک ہے
اور دوسری وہ جو صرف خدا کے ساتھ مخصوص
ہے، جب خدا کی ذات میں دو مختلف چیزیں پائی گئیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں
ترکیب واقع ہے حالانکہ جو چیز ترکیب یافتہ ہوتی ہے وہ ممکن ہوتی ہے واجب نہیں ہوتی
(یعنی وہ ترکیب پا بھی سکتی ہے اور نہیں بھی پا سکتی ہے) جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ پس
اس سے ثابت ہوا کہ یہ سوال ہی ساقط ہے۔ واللّٰہ اعلم۔

خدا کا حسّی مشاہدہ نہیں ہو سکتا

خدائے تعالیٰ کا جب کوئی مادی وجود نہیں ہے تو وہ
ہمارے مشاہدے میں بھی نہیں آ سکتا، ہم کسی بھی چیز کو

[1] اساس التقدیس فی علم الکلام ص ۲۸-۲۹ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ

اسی وقت دیکھ سکتے ہیں جب کہ وہ کسی خاص جگہ میں ہو، اپنا کوئی طول وعرض رکھتی ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہماری نگاہ کے احاطہ میں بھی آسکے۔ اگر یہ تمام شرائط جمع نہ ہوں تو ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ فضا میں پھیلے ہوئے ذرات جو بغیر کسی آلہ کی مدد کے دیکھے نہیں جاسکتے وہ بھی اپنا ایک حسی وجود رکھتے ہیں اسی لیے وہ ہماری نگاہ کی گرفت میں آتے ہیں۔ خدا کا کوئی حسی وجود ہی نہیں ہے تو ناممکن ہے کہ ہم اس کو اپنے حواس کی مدد سے پاسکیں۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (الانعام : ۱۰۳)

(مخلوقات کی) نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں لیکن وہ (ان کی) نگاہوں کو پالیتا ہے وہ بہت ہی باریک بین اور باخبر ہے۔

خدا کا اپنا ایک وجود ہے، لیکن اس کے وجود کا یقین ہمیں اس کو چھو کر یا دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ ان بے شمار دلائل سے ہوتا ہے جو کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک دو نہیں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے مشاہدے سے باہر ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کو مانتے ہیں کیونکہ ان کو مانے بغیر ہم ان آثار وشواہد کی کوئی توجیہہ نہیں کرسکتے جو ان کے وجود پر دلالت کرتے ہیں "زندگی" ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارا یقین ہے۔ اس یقین کو کسی بھی ذریعہ سے متزلزل نہیں کیا جاسکتا حالانکہ ہم میں سے کسی نے فی نفسہ زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا ہے۔ اس یقین کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم ہر جاندار میں زندگی اور حیات کے آثار دیکھتے ہیں۔ اس لیے زندگی کا اس وقت تک انکار نہیں کرسکتے جب تک کہ ان آثار ہی کو نہ جھٹلادیں۔ یہی حال خدا کی ذات کا ہے اس میں شک نہیں کہ موجودہ حواس کے ذریعہ اس کا ادراک ہمارے لیے ناممکن ہے لیکن بے شمار دلائل اس کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔ جو شخص بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ ان دلائل کا مطالعہ کرے گا وہ کبھی خدا کا انکار نہیں کرسکتا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ○ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کیے اور پہاڑوں میں بھی مختلف رنگوں کی گھاٹیاں ہیں بعض سفید اور بعض سرخ اور بعض انتہائی سیاہ اور اسی طرح انسانوں، جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ ہیں

وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۚ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ۝ (فاطر : ۲۷-۲۸)	اس طرح ہم نشانیاں بیان کرتے ہیں لیکن اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا غلبہ والا ہے اور ساتھ ہی وہ بخشنے والا بھی ہے۔

خدا کے رسول انسانوں کو ان دلائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو خدا کے وجود کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کو خدا کا حسی مشاہدہ کرا سکتے ہیں بلکہ وہ صرف اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں کے سامنے آتے ہیں کہ خدا موجود ہے اس لیے کہ اس کے وجود کی شہادتیں یہاں ہمیں ملتی ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (یونس ۱۰۱)	ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے غور سے دیکھو اور (امر واقعہ یہ ہے کہ) خدا کی نشانیاں اور خدا کی طرف سے آنے والی تنبیہیں ان لوگوں کے لیے کچھ بھی مفید نہیں ہیں جو ایمان لانا نہیں چاہتے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

ان الجسم والعرض مدرکان بالمشاهدة فاما موجود ليس بجسم ولا جوهر متحيز ولا عرض فيه فلا يدرك بالحس ونحن ندعي وجوده وندعي ان العالم موجود به وبقدرته وهذا يدرك بالدليل لا بالحس[1]	جسم اور عرض یہ دونوں چیزیں مشاہدے سے معلوم کی جا سکتی ہے لیکن ایک ایسا وجود جو جسم نہیں ہے اور نہ وہ کسی جگہ موجود جو ہر ہے اور نہ وہ کسی جگہ کے اندر پایا جانے والا عرض (مثلاً رنگ) ہے تو وہ حواس کے ذریعہ نہیں پایا جا سکتا۔ ہم خدائے تعالیٰ کے وجود کا دعویٰ کرتے ہیں ساتھ ہی ہمارا یہ بھی دعوی ہے کہ یہ عالم اسی کی ذات اور قدرت سے موجود ہے۔ ایسی ذات کو حواس سے نہیں پایا جا سکتا صرف دلیل سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

[1] الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۱۳ مطبوعہ مصر ۱۳۲۷ھ۔

موجودہ دور کے ایک سائنس داں کے بقول :-

"وجود باری کو دو اور دو چار کی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ کسی عمل ہی سے اس کی ذات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے وہ ایک غیر مادی وجود ہے۔ وہ ایک ایسی قوت ہے جو حکمت و دانائی، روحانیت، تخلیق اور ربوبیت کی جملہ صفات سے بدرجۂ کمال آراستہ ہے۔ اگرچہ اس کے وجود کے اثبات کے لیے عام سائنسی طریق استدلال چنداں بار آور ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن مظاہر قدرت اور خود انسانی فطرت کی بوقلمونیاں صبح سے شام تک لاتعداد شہادتیں پیش کرتی ہیں کہ یہ کارخانہ ہست و بود الل ٹپ از خود وجود میں نہیں آگیا۔ اس کے پیچھے کوئی کارفرما قوت امر، کوئی حکیم مدبّر ضرور موجود ہے۔ یہ ساری شہادتیں بہت ہی واضح ہیں۔"

خدا کا حسّی مشاہدہ ممکن نہیں کیونکہ محسوسات کا دائرہ بہت تنگ ہے، خدا کی لامحدود ہستی اس دائرہ میں نہیں آسکتی۔ خدا پر یقین کے لیے ہم اس کے حسّی مشاہدہ کے قطعاً محتاج بھی نہیں ہیں۔ آثار کائنات جو ہمارے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں خدا کے وجود کی براہ راست گواہی دے رہے ہیں۔ اگر یہ آثار کائنات کسی کے اندر خدا کا یقین نہیں پیدا کرتے ہیں تو جاننا چاہیے کہ اس کے یقین کا اس عالم میں اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

فصل دوم

خدا کی صفات

خدا کی ذات کا شعور ہمیں اس کی صفات سے ہوتا ہے۔ خدا کا مجرد تصور تو ممکن نہیں ہے، البتہ اس کی صفات کی مدد سے ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ خدا کی ذات کا ہم اپنے ذہن میں اس کی صفات سے الگ کوئی تصور نہیں رکھتے۔ جب بھی ہم اس کا تصور کرتے ہیں تو کچھ صفات ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ خدا کی ذات ہمارے ذہن کی دسترس سے بہت دور ہے۔ لیکن اگر ہم خدا کو اس کی صفات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو وہ ہم سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور ہم اس کو بولتا ہوا، محبت کرتا ہوا، ہماری طرف دیکھتا ہوا اور ہماری باتیں سنتا ہوا پاتے ہیں۔ اس کی صفات کی وجہ سے ہم اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اس طرح اصلاً ہم کو خدا کی صفات کا شعور ملتا ہے لیکن صفات کا شعور ہمارے اندر خدا کی ذات اور اس کے وجود کا یقین پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صفات کسی وجود ہی میں پائے جائیں گے۔ محبّت، نفرت، علم، ارادہ، قوت غرض کسی بھی صفت کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ ہر صفت کسی نہ کسی وجود ہی کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔

فلسفہ کی دنیا میں یہ بحث بہت پہلے سے چل رہی ہے کہ وجود کیا صرف صفات کا مجموعہ ہے یا صفات کے علاوہ بھی اس کی کوئی "ہستی" ہے؟ لیکن اتنی بات طے ہے کہ ہر وجود اپنی ایک صورت رکھتا ہے۔ جب ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہماری نظر اس کی اسی صورت پر پڑتی ہے۔ صورت کے بغیر نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس میں اور دوسرے وجود میں فرق کر سکتے ہیں۔ انسان اور حیوان میں، درخت اور پہاڑ میں جو فرق ہم کرتے ہیں وہ صفات ہی کی بنا پر ہے۔ صفات کو اگر مٹا دیا جائے تو یہ فرق بھی مٹ جائے گا۔ اشیاء کے درمیان فرق و امتیاز ہمارا ایک ذہنی عمل ہے اور ذہن صفات

ہی کے ذریعہ اشیاء کا تصور اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے یہ صرف خارج کی دنیا ہی میں نہیں بلکہ خارج کی دنیا سے ہٹ کر کسی چیز کو آپ ذہن میں لائیے تو بھی لازمًا اس کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوگا، طول و عرض ہوگا، اور شکل و صورت ہوگی۔ اگر آپ ان خصوصیات کے بغیر کسی چیز کا تصور کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ آپ ایک ایسے انسان کا فرضی نقشہ الفاظ میں تو کھینچ سکتے ہیں جو ہر صفت سے خالی ہو نہ تو واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہوگا اور نہ آپ ذہنی طور پر اس کا تصور کر سکیں گے۔ جب بھی وہ پایا جائے گا اپنے اندر چند صفات ضرور لیے ہوئے ہوگا۔

خدا کی صفات کا جس قدر صحیح اور واضح علم ہمیں حاصل ہوگا اسی قدر صحت اور وضاحت کے ساتھ ہم خدا کی ذات کا تصور کر سکیں گے۔ اور خدا اور مخلوق کا فرق و امتیاز ہمیں معلوم ہوگا۔ خدا کی صفات کو سمجھنے میں ٹھوکر کھانے کے بعد نہ تو خدا کی اصل حقیقت ہم پر کھل سکتی ہے اور نہ ہم خدا کی عظمت اور بلندی کا صحیح احساس کر سکتے ہیں اس لیے خدا کے بارے میں ہمارا مطالعہ ناقص اور ادھورا رہے گا جب تک کہ ہم اس کی صفات پر غور و فکر مکمل نہ کر لیں۔

خدا کی صفات کیا ہیں؟

خدا اس کائنات کا خالق ہے، اگر اس مجمل حقیقت پر بھی ہمارا ایمان ہے تو اس سے فطری طور پر خدا کی بہت سی صفات کا ہمارے اندر یقین پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو خالق ماننے کے بعد ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ قوت اور طاقت رکھتا ہے، کیونکہ قوت کے بغیر تخلیق کا تصور بے معنی ہے۔ اسی طرح تخلیق کے لیے شعور اور ارادہ ضروری ہے۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا شعور اور ارادہ سے متصف ہے۔ ساتھ ہی ماننا پڑے گا کہ خدا کو اپنی مخلوق سے محبت ہے، کیونکہ محبت کے بغیر وہ اپنی مخلوق پر مسلسل احسان نہیں کر سکتا۔ تخلیق کا عمل، علم اور حکمت چاہتا ہے کیونکہ علم و حکمت کے بغیر تخلیق میں حسن و خوبی نہیں پیدا ہو سکتی، اس لیے خدا خالق ہے تو یقینًا وہ علیم اور حکیم بھی ہے۔ یہ ان صفات میں سے چند ہیں جو خدا کو خالق ماننے کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور ان میں سے ہر صفت دوسری بے شمار صفات کا تقاضا کرتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

اذا عرف انه الخالق فمن	جب یہ معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ خالق ہے تو
المعلوم بالضرورة ان الخالق	ظاہر بات ہے کہ خالق لازمًا قدرت بھی رکھتا
لایکون الا قادرًا بل کل فعل یفعله	ہوگا کیونکہ ہر وہ فعل جس کو کوئی شخص انجام

فاعل لا يكون الا بقوة وقدرة
.... والخلق اعظم الافعال فانه
لا يقدر عليه الا الله فالقدرة عليه
اعظم من كل قدرة وليس لها
نظير من قدر المخلوقين .....
ان الخلق يستلزم الارادة فان فعل
الشیئ على صفة مخصوصة ومقدار
مخصوص دون ما هو خلاف ذلك
لا يكون الا بارادة تخصص هذا عن
ذلك والارادة تستلزم العلم فلا
يريد المريد الا ما شعر به وتصور
فی نفسه والارادة بدون الشعور
ممتنعة وايضا فنفس الخلق،
خلق الانسان هو فعل لهذا الانسان
الذی هو من عجائب المخلوقات
وفيه من الاحكام والاتقان مما
قد بهر العقول والفعل المحكم
المتقن لا يكون الا من عالم بما
فعل وهذا معلوم بالضرورة ـ
فالخلق يدل على العلم من هذا
الوجه ومن هذا الوجه .....
ثم اذا ثبت انه قادر عالم
فذلك يستلزم كونه حيًّا

دیتا ہے وہ قوت اور قدرت ہی سے انجام پا سکتا
ہے۔ ..... اور تخلیق تو سب سے بڑا فعل ہے
کیونکہ اس پر سوائے خدا کے اور کوئی قادر نہیں
ہے اس لیے تخلیق کی قدرت بھی سب سے بڑی
ہے۔ مخلوق کی قدرت میں اس کی کوئی مثال
موجود نہیں ہے .... یہ ایک حقیقت ہے کہ
تخلیق کے لیے ارادہ ضروری ہے کیونکہ کسی کام
کو مخصوص صفت اور مخصوص مقدار میں انجام
دینا اور اس کی مخالف صورت میں انجام نہ
دینا ایک ایسے ارادہ کے بغیر ممکن نہیں جو اس
خاص حالت کو اس کی مخالف پر ترجیح دے
سکے۔ ارادہ کے لیے علم ضروری ہے، کیونکہ کوئی
بھی شخص ارادہ اسی چیز کا کرتا ہے جس کو وہ
محسوس کرتا ہے اور اپنے ذہن میں اس کا تصور
کرتا ہے۔ شعور کے بغیر ارادہ ممکن نہیں ہے۔
نیز نفس تخلیق، خاص طور پر انسان کی تخلیق
جو کہ ایک عجیب تر مخلوق ہے، جس کے اندر
ایسا استحکام اور مضبوطی پائی جاتی ہے کہ
عقل مبہوت رہ جاتی ہے، بغیر علم کے ممکن
نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ
کوئی محکم اور مضبوط فعل ایسے صاحب علم
ہی سے انجام پا سکتا ہے جو اپنے کام کو جانتا ہو،
پس تخلیق کا عمل، ارادہ اور استحکام دونوں

وكذلك الارادة تستلزم الحياة
والحي اذا لم يكن سميعًا بصيرًا
متكلما كان متصفا بضد ذلك
من العمى والصم والخرس وهذا
ممتنع في حق الرب تعالىٰ فيجب
ان يتصف بكونه سميعا بصيرا
متكلما والارادة اما ان تكون لغاية
حكيمة اولا فان لم تكن لغاية
حكيمة كانت سفها وهو منزه عن
ذلك فيجب ان يكون حكيما وهو
اما ان يقصد نفع الخلق والاحسان
اليهم او يقصد مجرد ضررهم
وتعذيبهم اولا يقصد واحدا
منهما بل يريد ما يريد سواء كان
كذا او كذا والثاني شرير ظالم
يتنزه الرب عنه والثالث سفيه
عابث فتعين انه تعالىٰ رحيم كما
انه حكيم[1]

پہلوؤں سے علم پر دلالت کرتا ہے..... پھر
جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدائے تعالیٰ قادر ہے
اور عالم ہے تو اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ
وہ زندہ ہے۔ اسی طرح ارادہ بھی حیات کو
ضروری قرار دیتا ہے، اگر کوئی ذی حیات سمیع و
بصیر اور متکلم نہیں ہے تو لازمًا اندھا، بہرا اور
گونگا ہوگا۔ خدا کے بارے میں یہ بات ممکن
نہیں ہے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ وہ سننے،
دیکھنے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہے ارادہ
یا تو کسی حکیمانہ مقصد کے لیے ہوگا یا اس کے
پیچھے کوئی حکمت نہ ہوگی اور اگر وہ حکمت سے
خالی ہے تو یہ بے وقوفی ہے اور خدا اس سے
پاک ہے، اس لیے ضروری ہے کہ خدا حکیم ہو،
پھر وہ مخلوق کے لیے نفع اور ان پر احسان کا
ارادہ کرے گا یا اس کا ارادہ ان کو نقصان
پہنچانے اور سزا دینے کا ہوگا یا ان میں سے
کوئی بھی ارادہ نہ ہوگا بلکہ جو ارادہ چاہے کرے گا
خواہ نفع کا ہو یا نقصان کا۔ دوسری صورت
میں وہ شریر اور ظالم قرار دیا جائے گا جس سے خدا کی ذات پاک ہے تیسری صورت میں وہ
لاغی اور بے وقوف ہوگا (نعوذ باللہ) اس سے ثابت ہوا کہ صرف پہلی صورت صحیح ہے یعنی یہ کہ
وہ رحیم ہے جیسا کہ وہ حکیم ہے۔"

---

[1] مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ مطبوعہ بمبئی صفحہ ۲۸۷-۲۸۵۔

متکلمین کا نقطۂ نظر

مسلمان متکلمین کہتے ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات ازلی و ابدی ہے اسی طرح اس کی صفات بھی ازلی و ابدی ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر بعد میں کوئی ایسی صفت پیدا ہو جائے جو پہلے سے نہ پائی جاتی ہو۔ وہ جب سے ہے اپنی تمام صفات اور خصوصیات کے ساتھ ہے، ان میں نہ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کمی کا امکان ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز تغیرات کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے اور ہر آن مختلف احوال سے گزرتی رہتی ہے، لیکن خدا کی ذات تغیر و انقلاب سے پاک ہے۔ وہ مسبب الاسباب اور علت العلل ہے، یہاں کوئی ایسا سبب اور علت ہی نہیں ہے جو اس پر اثر انداز ہو اور اس میں تغیر پیدا کر دے۔

اپنے اس فلسفہ کی بنیاد پر انہوں نے سلبی اور ایجابی دو طرح کی صفات بیان کی ہیں یعنی کچھ صفات تو وہ ہیں جن سے خدا کی ذات پاک ہے اور جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔ اور کچھ وہ ہیں جن سے وہ متصف ہے اور جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند نمایاں سلبی صفات یہ ہیں۔ (۱) خدا کی ماہیت ہر چیز کی ماہیت سے مختلف ہے۔ (۲) وہ غیر مرکب ہے یعنی اس کے اجزاء نہیں کیے جا سکتے (۳) وہ لامکان ہے، اس کا وجود کسی متعین جگہ میں نہیں ہے (۴) کسی کے ساتھ متحد نہیں ہوتا۔ (۵) وہ کسی کے اندر حلول نہیں کرتا (۶) اس کا کوئی خاص رخ اور متعین جہت نہیں ہے، اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ فلاں جہت میں ہے اور فلاں جہت میں نہیں ہے۔ (۷) اس کے ساتھ کسی صفت حادث کا قیام ممکن نہیں ہے۔ یعنی اس کی جتنی صفات ہیں سب ازلی و ابدی ہیں (۸) وہ کسی چیز سے نہ تو لذت یاب ہوتا ہے اور نہ الم محسوس کرتا ہے۔ (۹) اس کی ذات رنگ و بو اور لذت و کیفیت سے متصف نہیں ہے۔[1]

---

[1] یہاں ہم نے متکلمین میں اشاعرہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے، ان کے دلائل سے بحث نہیں کی ہے۔ بعض دوسرے کلامی فرقوں کو اس نقطۂ نظر اور اس کے حق میں دیے جانے والے دلائل دونوں سے اختلاف ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ نقطۂ نظر اپنے دلائل سمیت خامیوں سے پاک نہیں ہے۔ اشاعرہ کے خیالات اور ان کے دلائل کے لیے دیکھیے امام غزالیؒ کی الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۲۷-۱۳ مطبوعہ مطبعہ سعادہ مصر ۱۳۲۷ھ اور امام رازی کی محصل افکار المتقدمین صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۱۔ اس پر تنقید و تبصرہ کے لیے ملاحظہ ہو تلخیص المحصل للعلامہ نصیر الدین الطوسی۔ موخر الذکر دونوں کتابیں مطبع حسینیہ مصر سے ۱۳۲۳ھ میں ایک ساتھ چھپی ہیں۔

اشاعرہ نے لکھا ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ایجابی صفات سات ہیں[۱] قدرت، علم، حیات، ارادہ، سمع و بصر اور کلام[۲]۔ بعض متکلمین کو اصرار ہے کہ خدا کی ثبوتی صفات صرف یہی سات ہیں، ان کے علاوہ اس کی کوئی دوسری ثبوتی صفت نہیں ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تحدید کی دلیل کیا ہے؟ جب کہ قرآن وحدیث میں سات سے زیادہ صفات کا ذکر ہے اور اس طرح ذکر ہے گویا وہ سب کی سب خدا کی لازمی وابدی صفات ہیں۔ مثلاً عدل وحکمت، رحم وکرم، رضا وغضب وغیرہ اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ قرآن وحدیث سے خدا کی صفات کو ثابت کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اسے عقل اور استدلال سے ثابت کرنا چاہیے۔ اور استدلال کے وقت ہمیں دو حقیقتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ایک تو یہ کہ ہمارے سامنے خدا کی ذات نہیں بلکہ اس کے اعمال ہیں۔ ان ہی سے ہم اس کی صفات معلوم کرسکتے ہیں۔ وہ ایسا کاریگر ہے جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، ہم اس کی صرف کاریگری کو دیکھ رہے ہیں۔ اسی سے ہمیں اس کی خوبیوں اور کمالات تک پہونچنا ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات اس کی تمام مخلوقات سے بالکل جدا ہے۔ اس کی کوئی بھی مخلوق نقص اور عیب سے خالی نہیں ہے جب کہ خود وہ ایک بے مثال وبے عیب ہستی ہے۔ اس لیے اس کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جاسکتی جو اس کی تنزیہ وتقدیس کے منافی ہو۔ ان دو حقیقتوں کو مان کر جب ہم غور کرتے ہیں تو خدا کی یہی سات صفات ثابت ہوتی ہیں۔ امام رازی نے ان کا نقطۂ نظر ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

انا کلفنا بکمال المعرفۃ و   ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ خدا کا عرفان

---

[۱] اشاعرہ میں سے بعض کے نزدیک ثبوتی صفات سات سے زیادہ ہیں۔ ملاحظہ ہو شرح عقائد ج ۲ صفحہ ۷۹-۸۲

[۲] ماتریدیہ نے "تکوین" یا "تخلیق" کو بھی ایک الگ صفت مانا ہے۔ اس طرح ان کے نزدیک ایجابی صفات کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اشاعرہ تکوین اور قدرت میں فرق نہیں کرتے۔ وہ دونوں کو ایک ہی صفت مانتے ہیں۔ لیکن ماتریدیہ کہتے ہیں کہ کسی چیز پر قدرت کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ ہو سکتی ہے۔ اور "تکوین" کے معنی ہیں اس کا عملاً وجود میں آجانا۔ ظاہر ہے امکان اور وجود میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے وہ ان کو دو مستقل صفات مانتے ہیں۔ محصل مع تلخیص ص ۱۳۵۔

كمال المعرفة انما يحصل بمعرفة	کلی حاصل کریں، اور عرفان کلی تمام صفات کی معرفت
جميع الصفات ومعرفة جميع الصفات	کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور اس کا طریقہ صرف
لايتاتى الا بطريق ولاطريق الا الاستدلال	ایک ہے اور وہ ہے خدا کے افعال سے استدلال
بالافعال والتنزيه عن النقائص و	اور نقائص سے اس کی تنزیہ۔ ان دونوں طریقوں
هذان الطريقان لايدلان الا	سے بس یہی سات صفات ثابت ہوتی ہیں۔
على هذه الصفات۔[1]	

وہ کہتے ہیں کہ ان سات صفات کو ہم "نقل" کا سہارا لیے بغیر عقل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ خدا ہے تو لازمًا اس کو ان صفات سے متصف ماننا پڑے گا۔ ورنہ خدا کا وجود ایک فرضی وجود ہوگا یا وہ ایسا ناقص وجود ہوگا جس میں خدا بننے کی صلاحیت نہ ہوگی اور عقل کے لیے اس کا قبول کرنا دشوار ہوگا۔

ان سات صفات کے علاوہ اگر آپ خدا کی اور بھی کوئی صفت مانتے ہیں تو ان کو اعتراض ہے کہ اس سے خدا کی تنزیہ و تقدیس باقی نہیں رہتی۔ اس لیے قرآن وحدیث میں جن صفات کا ذکر ہے وہ ان کی ایسی توجیہات کرتے ہیں کہ بظاہر وہ صفات نہیں رہ جاتیں۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے۔ قرآن مجید میں خدا کو رحیم کہا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رحم رقتِ قلب کا نام ہے۔ یہ ایک کمزوری ہے جو مخلوق کو تو لاحق ہو سکتی ہے اور ہوتی بھی ہے، لیکن اگر ہم اسے خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تو اس سے اس کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ اس لیے خدا کے رحیم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہاں ایسی نعمتیں پیدا کرتا ہے جن سے اس کی مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔

بعض لوگ ان سات صفات کو بنیادی صفات سمجھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ ان کو تسلیم کیے بغیر خدا کی مزید صفات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ اور ان کو مان لینے کے بعد خدا کو ان تمام صفات سے متصف مانا جا سکتا ہے جن کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے۔ کیونکہ وہ سب ضمنی ہیں اور ان ہی سات کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک محبت، رحمت، رضا اور غضب مستقل صفات نہیں ہیں، بلکہ ارادہ کے مختلف پہلو ہیں۔

---

[1] محصل افکار المتقدمین ص ۱۳۶۔

امام رازی اور ان کے ہم خیال بعض دوسرے بزرگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ متکلمین کی بیان کردہ سات صفات کے علاوہ بقیہ تمام صفات کے بارے میں توقف کرنا چاہیے۔ ان کی نفی یا اثبات کا فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

والانصاف انہ لادلالۃ علیٰ	انصاف کی بات یہ ہے کہ ان صفات کے
ثبوت ھذہ الصفات ولا علیٰ	ثبوت یا نفی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے
نفیھا فیجب التوقف [1]	اس لیے توقف ضروری ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا، خدا ہے، اور اس کی مخلوق، مخلوق ہے، ان دونوں کے درمیان کسی بھی معنی میں مماثلت نہیں ہے، اس لیے متکلمین نے اپنے تمام مباحث میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی مخلوق سے مشابہ نہ قرار پائے۔ اس لیے وہ ان تمام صفات کا انکار یا توجیہہ کرتے ہیں، جن سے ان کے خیال میں، خدا کی تنزیہ وتقدیس مجروح ہوتی ہے۔ حالانکہ جن سات صفات کو مانتے ہیں ان سے خدا کی تنزیہ وتقدیس پوری طرح محفوظ رہتی ہے تو دوسری صفات سے بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اگر دوسری صفات سے مخلوق کے ساتھ خدا کی مشابہت ظاہر ہوتی ہے تو ان سات صفات سے بھی یقیناً ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب انسان کے اندر اپنے نفع یا نقصان کا میلان پیدا ہوتا ہے تو اسے ہم "ارادہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے خدا نفع یا نقصان سے قطعاً بے نیاز ہے۔ لہٰذا اس کی طرف ارادہ کی نسبت نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن متکلمین ارادہ کو خدا کی ایک ثبوتی صفت مانتے ہیں۔

متکلمین کے ایک گروہ نے خدا کو ان تمام صفات سے متصف مانا ہے جن کا قرآن وحدیث میں ثبوت موجود ہے۔ انہیں ان لوگوں پر سخت اعتراض ہے۔ جو خدائے تعالیٰ کے افعال اور اس کی تنزیہ وتقدیس ہی سے اس کی صفات ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ قطع نظر اس سے کہ ان دونوں بنیادوں کے ذریعہ صرف وہی سات صفات ثابت ہوتی ہیں جن کا وہ ذکر کرتے ہیں یا اس سے زیادہ صفات ثابت کی جاسکتی ہیں، اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ خدا کی صفات کو ثابت کرنے کے بس یہی دو طریقے صحیح ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث بھی خدا کی صفات کو ثابت کرنے کا ایک صحیح اور معقول

---

[1] محصل افکار المتقدمین ص ۱۳۶۔

ذریعہ ہیں رجب ہمارا ان پر ایمان ہے تو ان میں جن صفات کا ذکر ہے ان پر بھی ہمارا ایمان ہونا چاہیے۔

علامہ سعد الدین تفتازانی کہتے ہیں:۔

لانسلم انہ لاطریق سوی ماذکرتم الیس الشرع طریقاً وصراطاً قویماً مستقیماً[1]

ہم اس بات کو نہیں مانتے کہ اثبات صفات کا جو طریقہ تم نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کیا شریعت اس کا سیدھا اور مضبوط طریقہ نہیں ہے؟

علامہ نصیر الدین طوسی نے اس گروہ کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے:۔

والذین یقولون بالصفات الزائدۃ لایقولون ان اثبات الصفات یکون من جھۃ الافعال والتنزیہ فقط بل یقولون السمع ایضاً طریق آخر فی اثباتھا وانما اثبتوھا لورود النص بھا وکونھا غیر مرادفۃ لسائر الصفات[2]

جو لوگ ان سات صفات سے زیادہ صفات کے قائل ہیں وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ صرف خدا کے افعال اور اس کی تنزیہ ہی کے ذریعہ اس کی صفات ثابت کی جا سکتی ہیں، بلکہ ان کے نزدیک شریعت بھی اس کا ایک ذریعہ ہے انہوں نے ان صفات کو اس لیے مانا ہے کہ ان کے حق میں نصوص موجود ہیں اور یہ کہ وہ دوسری تمام صفات کے مرادف نہیں ہیں بلکہ ان سے الگ ہیں۔

علامہ موصوف نے ایک جگہ اس سے آگے کی بات کہی ہے۔ وہ یہ کہ خدا کی طرف ہم کسی ایسی صفت کو منسوب ہی نہیں کر سکتے جس کی تائید شریعت نہ کرتی ہو، خواہ وہ منطق کی رو سے ثابت ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کل صفۃ لایقارنھا الاذن الشرعی لایوصف تعالیٰ بھا[3]

جس صفت کو شریعت کی سند نہ حاصل ہو اس سے اللہ تعالیٰ کو متصف نہیں کیا جا سکتا۔

امام ابن تیمیہؒ کی تنقید

امام ابن تیمیہؒ نے اس نقطۂ نظر کی پوری قوت سے ترجمانی کی ہے۔ ہم یہاں ان کے خیالات کسی قدر تفصیل سے پیش کرتے ہیں:

---

[1] شرح المقاصد مطبوعہ استنبول ۱۲۷۷ھ جلد ۲ صفحہ ۷۹۔ [2] تلخیص المحصل صفحہ ۱۳۶۔ [3] ایضاً صفحہ ۱۱۵۔

ولا ريب ان ما اثبته هولاء الصفاتية[1] من صفات الله تعالىٰ ثابت بالشرع مع العقل وهو متفق عليه بين سلف الامة وخلفها وانما خصوا هذه الصفات بالذكر دون غيرها لانها هي التي دل العقل عليها عندهم كما نبّه عليه المصنف[2] ولكن لا يلزم من عدم الدليل المعين عدم المدلول فلا يلزم نفي ماسوىٰ هذه الصفات والسمع قد اثبت صفات اخرى وايضاً فان الرازي ونحوه ممن لم يثبت السمع طريقا الى اثبات الصفات ولا نزاع بينهم انه طريق صحيح

اس میں شک نہیں کہ "صفاتیہ"[1] نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو ثابت کیا ہے، وہ شریعت اور عقل سے ثابت ہیں اور ان پر امت کے سلف اور خلف دونوں کا اتفاق ہے لیکن وہ اس لیے ان ہی چند صفات کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری صفات کا ذکر نہیں کرتے، کہ ان کے نزدیک عقل صرف ان ہی صفات پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مصنف[2] نے صراحت کی ہے۔ لیکن معین دلیل کے نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعتاً بھی مدلول کا وجود نہ ہو۔ اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ ہم ان مخصوص صفات کے علاوہ دوسری صفات کی نفی کر دیں۔ جب کہ "سمع" (قرآن و حدیث) سے دوسری صفات ثابت ہیں۔ نیز امام رازی اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک "سمع" سے صفات

---

[1] صفاتیہ، ابتدا میں سلف صالحین کو کہا جاتا تھا جو خدا کی تمام صفات کو ازلی و ابدی مانتے تھے اور ان کے درمیان صفات ذات اور صفاتِ فعل کا فرق نہیں کرتے تھے، لیکن بعد میں یہ اصطلاح اشاعرہ کے لیے استعمال کی جانے لگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے "الملل والنحل" لعبد الکریم الشہرستانی تذکرۂ صفاتیہ۔

[2] اس سے مراد محمد بن محمود بن محمد بن عبد الکافی ہیں جو عام طور پر شمس الدین الاصفہانی کہے جاتے ہیں۔ یہ ۶۱۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور ۶۸۸ھ میں وفات پائی اور بمقام قرافہ دفن ہوئے۔ یہ صاحب تصانیف اور اپنے وقت کے بہت قابل انسان تھے۔ عقائد پر ان کا ایک بہت ہی مختصر سا متن ہے جو زیادہ سے زیادہ ایک صفحہ میں لکھا جا سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے بڑے سائز کے ۱۵۰ صفحات میں اس کی تنقیدی شرح کی ہے۔ اس شرح کو عقائد پر خالص اسلامی رنگ میں بحث کرنے والی سب سے معیاری اور قابل اعتماد کتاب سمجھنا چاہیے۔

لکن یفرقون بین ما اثبتوہ وبین ما توقفوا فی ثبوتہ بان العقل دل علیٰ ما اثبتناہ ولم یدل علی ما توقفنا فیہ ولہم فیما لم یثبتوہ طریقان منہم من نفاہ ومنہم من توقف فیہ فلم یحکم فیہ باثبات ولا نفی وھٰذہ طریقۃ محققیہم کالرازی والاٰمدی وغیرھما بل ومن الناس من یثبت صفات اخریٰ بالعقل فالذی اتفق علیہ سلف الامۃ وائمتھا ان یوصف اللہ بما وصف بہ نفسہ وبما وصفہ بہ رسولہ من غیر تحریف ولا تعطیل ومن غیر تکییف ولا تمثیل [۱]

ثابت نہیں کی جا سکتیں۔ (اس لیے کہ اس نقطۂ نظر کے مطابق عقل ہی سے صفات کا اثبات ہو سکتا ہے) ان کے درمیان اس بات میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ "سمع" (کبھی اثبات صفات کا) ایک صحیح طریقہ ہے لیکن جن صفات کو انہوں نے ثابت کیا ہے اور جن کے ثبوت کے بارے میں توقف کیا ہے، ان دونوں کے درمیان وہ فرق کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جن صفات کو ہم ثابت کرتے ہیں، عقل ان پر دلالت کرتی ہے اور جن صفات کے بارے میں ہم توقف کرتے ہیں عقل ان پر دلالت نہیں کرتی۔ پھر جو صفات ان کے نزدیک ثابت نہیں ہیں ان کے بارے میں ان کے دو نقطۂ نظر ہیں بعض نے سرے سے ان کی نفی کر دی ہے اور بعض نے توقف کیا ہے نہ تو اثبات کا فیصلہ کیا ہے اور نہ نفی کا اور یہی ان کے محققین مثلاً امام رازی اور علامہ آمدی وغیرہ کا مسلک ہے۔ بلکہ جن صفات کا یہ متکلمین اثبات کرتے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سی دوسری صفات کو بعض لوگوں نے عقل ہی سے ثابت کیا ہے۔ وہ بات جس پر امت کے اسلاف اور ائمہ نے اتفاق کیا ہے۔ یہ ہے کہ اللہ کو ان تمام صفات سے متصف مانا جائے جن سے خود اس نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے، یا ان کے رسول نے جن صفات کا اس کو حامل قرار دیا ہے بغیر کسی تحریف وتعطیل (خدا کو صفات سے معطل قرار دینا) کے اور بغیر اس کے کہ ان کی کیفیت متعین کی جائے یا ان کی تمثیل بیان کی جائے۔

---

[۱] شرح العقیدہ الاصفہانیہ صفحہ ۸۔

آگے چل کر فرماتے ہیں :۔

ولیس لقائل ان یقول انما خصصت هذه الصفات بالذکر لان السمع موقوف علیها دون غیرها فان الامر لیس کذلک لان التصدیق بالسمعیات لیس موقوفاً علی اثبات السمع والبصر ونحو ذلک[1]

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان صفات کو مخصوص طور پر اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ "سمع" (قرآن وحدیث کی تصریحات کا سمجھنا اور ماننا) ان ہی پر موقوف ہے کسی دوسری صفت پر موقوف نہیں ہے کیونکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ سمعیات کی تصدیق سمع وبصر وغیرہ کے اثبات پر موقوف نہیں ہے۔

بحث کے خاتمہ پر فرماتے ہیں :۔

وانما المقصود هنا التنبیه علیٰ ان ما یجب اثباته لله تعالیٰ من الصفات لیس مقصوراً علیٰ ما ذکره هؤلاء مع اثباتهم بعض صفات بالعقل وبعضها بالسمع[2]

یہاں صرف اس حقیقت سے آگاہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جن صفات کا ثابت کرنا ضروری ہے وہ وہی چند صفات نہیں ہیں جن کا متکلمین نے ذکر کیا ہے اور جن میں سے بعض کو وہ عقل سے اور بعض کو سمع (نقل) سے ثابت کرتے ہیں۔

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص۱۱۔ [2] ایضاً ص۲۱ اس بحث کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس کے پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ کی چند موٹی موٹی باتوں کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ سوال یہ تھا کہ خدا کی صفات کیا ہیں؟ اور جو صفات ہیں وہ عین ذات ہیں یا غیر ذات؟ پھر ان میں سلبی صفات کیا ہیں اور ثبوتی صفات کیا؟ فلاسفہ اور معتزلہ کے نزدیک صفات عین ذات ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر صفات کو خدا کی ذات سے الگ مانا جائے اور ان کو ازلی قرار دیا جائے تو گویا صرف خدا کی ذات ازلی یا باصطلاح فلسفہ "قدیم" نہیں رہی بلکہ کچھ اور چیزیں بھی قدیم ہوئیں۔ اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قدیم صرف خدا کی ذات ہے اور اگر صفات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ قدیم نہیں ہیں بلکہ بعد میں خدا کے اندر پیدا ہوئی ہیں تو فلسفہ کی اصطلاح میں خدا "محل حوادث" ہوتا ہے یعنی اس پر واقعات وحالات اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح مخلوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اگر مان لیا جائے تو خدا "قدیم" نہیں رہتا۔ اشاعرہ متکلمین (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

امام غزالی کی رائے

امام غزالیؒ نے متکلمین کی عام راہ سے کسی قدر ہٹ کر صفات کے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ کے اسماء (صفات) چار قسم کے ہیں۔ (۱) بعض اسماء خدا کی صرف "ذات" پر دلالت کرتے ہیں جیسے اسم "موجود" یہ خدا کی ذات پر ازلی و ابدی طور پر صادق آتا ہے۔ خدا ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گا۔ (۲) بعض اسماء خدا کی "ذات" پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ چیزوں کی اس سے نفی بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا "قدیم" ہے۔ یہ اسم ظاہر کرتا ہے کہ خدا عدم سے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ وہ ازل سے موجود ہے۔ یا خدا کا ایک اسم "باقی" ہے۔ اس اسم کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ایسا وجود ہے جسے کبھی عدم لاحق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا کا ایک اسم "واحد" ہے جو خدا کی ذات سے شرک کی نفی کرتا ہے۔ یہی حال "غنی" کا ہے، جو بتاتا ہے کہ خدا بے نیاز ہے اور کسی معاملہ میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک ازلی و ابدی صفت ہے۔ جب خدا سے صفتِ احتیاج سلب کر لی گئی ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی ذات سے یہ صفت الگ رہے گی۔ (۳) اسماء کی تیسری قسم وہ ہے جن سے خدا کی "ذات" کے لیے کوئی معنی زائد ثابت ہوتا ہے، اس میں خدا کے حسب ذیل اسماء آتے ہیں۔

الحی (زندہ) القادر (قدرت والا) المتکلم (بولنے والا) المرید (ارادہ کرنے والا)

السمیع (سننے والا) البصیر (دیکھنے والا) العالم (جاننے والا)

ان ہی اسماء میں وہ اسماء بھی شامل ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے مذکورہ بالا اسماء سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے "آمر" "ناہی" "خبیر" وغیرہ (۴) چوتھی قسم ان اسماء کی ہے جو خدا کی ذات پر اس طرح دلالت کرتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ان اعتراضات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک صفات زائد از ذات اور ازلی ہیں اور وہ مذکورہ بالا سات صفات کو ثبوتی صفات مانتے ہیں۔ اس بحث کو طے کرنے کے لیے دلائل کی ضرورت تھی۔ لیکن متکلمین نے قدرت، علم، حیات اور ارادہ کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور سمع و بصر اور کلام کے اثبات کے لیے دلیلیں پیش کی ہیں حالانکہ ان صفات کو بھی عقل کی روشنی میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض متکلمین نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے اس کتاب میں جہاں ان صفات پر بحث کی ہے وہاں اس کی تفصیل دیکھی جائے۔ امام غزالی نے ان صفات پر عقلی رنگ میں بحث کرتے ہوئے نقل سے بھی مدد لی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاقتصاد فی الاعتقاد)

ہیں کہ ان سے خدا کا کوئی عمل نمایاں ہوتا ہے جیسے خدا "رازق" ہے۔ "خالق" ہے "عزت دینے والا" اور "ذلت دینے والا" ہے وغیرہ۔ اس چوتھی قسم کے اسماء کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خدا پر ازل سے صادق آتے ہیں۔ ورنہ ماننا پڑے گا کہ خدا پر تغیر و انقلاب آتا ہے۔ لیکن بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسماء ازلی نہیں ہیں "خلق" بعد کی چیز ہے تو ہم اسم "خالق" کو ازلی کیسے مان لیں۔

اس بحث کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:۔

والکشف للغطاء عن انّ ھٰذا السیف فی الغمد یسمّی صارما وعند حصول القطع بہ وفی تلک الحالۃ علی الاقتران یسمی صارما وھما بمعنیین مختلفین فھو فی الغمد صارم بالقوۃ وعند حصول القطع صارم بالفعل وکذٰلک الماء فی الکوز یسمی مرویا وھما اطلاقان مختلفان فمعنی تسمیۃ السیف فی الغمد صارما ان الصفۃ التی یحصل بہا القطع فی الحال لا لقصور فی ذات السیف وحدتہ واستعدادہ بل لامر اٰخر وراء ذاتہ فبالمعنی الذی یسمی السیف فی الغمد صارما یصدق اسم الخالق علی اللہ تعالیٰ فی الازل فان الخلق اذا جری بالفعل لم یکن

حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا ہے جب ہم اس پہلو سے غور کرتے ہیں کہ تلوار کو نیام میں بھی "صارم" (کاٹنے والی) کہا جاتا ہے، اور اس وقت بھی اسے "صارم" ہی کہا جاتا ہے جب کہ اس سے کاٹنے کا عمل ہو رہا ہو۔ اس طرح تلوار کو دو مختلف معنوں میں "صارم" کہا جاتا ہے۔ تلوار نیام میں بالقوۃ "صارم" ہے اور کاٹتے وقت بالفعل۔ اسی طرح پانی جو صراحی میں ہے اس کو ہم سیراب کرنے والی چیز کہیں گے اور جس وقت اسے پیا جائے اس وقت بھی اس کے لیے یہی لفظ بولا جائے گا اور یہ دو مختلف قسم کے اطلاقات ہیں۔ تلوار جب نیام میں ہے اس وقت اسے "صارم" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خصوصیت جس کی بنا پر کاٹنے کا عمل اس سے اس وقت ہونا چاہیے وہ اگر نہیں ہو رہا ہے تو یہ اس کی ذات یا اس کی تیزی اور کاٹ کی صلاحیت میں کسی خامی کی وجہ سے

لتجدد امر فی الذات لہ یکن	نہیں ہے بلکہ اس کا سبب دوسرا ہے جس کا
بل کل ما تشترط لتحقیق الفعل موجود	اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس
فی الازل و بالمعنی الذی یطلق	معنی میں اللہ تعالیٰ پر "خالق" کی صفت کا اطلاق
حالت مباشرۃ القطع للسیف	ازل سے ہوسکتا ہے، کیونکہ تخلیق کا عمل جب
اسم الصارم لا یصدق فی الازل	وجود میں آیا تو اس وقت اس کی ذات میں
فھذا حظ المعنی فقد ظھر ان	کوئی ایسی نئی بات نہیں ہوئی جو پہلے نہیں
من قال انہ لا یصدق فی الازل	تھی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فعل کو وجود میں
ھذا الاسم فھو محق و اراد بہ	لانے کے لیے جو کچھ شرائط ہیں وہ سب
المعنی الثانی و من قال یصدق	ازل سے موجود ہیں۔ البتہ جس معنی میں ہم
فی الازل فھو محق و اراد بہ معنی	تلوار کے لیے صارم کا لفظ اس کے کاٹنے کے
الاول و اذا انکشف الغطاء علیٰ	عمل کے وقت بولتے ہیں۔ اس معنی کے
ھذا الوجہ ارتفع الخلاف [1]	لحاظ سے خدا پر ازل میں خالق کا لفظ صادق

نہیں آتا۔ یہ ہے اس بحث کی روح۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خالق کا اطلاق خدا پر ازل میں نہیں ہوتا وہ بھی صحیح کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے دوسرا معنی مراد لیا ہے اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ خالق کا اطلاق ازل ہی سے ہوسکتا ہے وہ بھی صحیح کہتے ہیں کیونکہ وہ پہلا معنی مراد لیتے ہیں۔ جب اس طرح حقیقت کھل گئی تو اختلاف بھی باقی نہیں رہا۔"

واقعہ یہ ہے کہ متکلمین نے جو بحثیں پیدا کی ہیں ان سے حقیقت کھلنے کے بجائے اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ امام غزالیؒ کی تقریر میں ان پرانی بحثوں کا کسی قدر حل موجود ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ صاف نہیں ہوا ہے۔ ہمیں غور و فکر کا وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو بالکل فطری اور ہر طرح کی مصنوعیت سے پاک ہو اور جس میں کسی غیر ضروری بحث کی آمیزش نہ ہو[2]

---

[1] الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۶۵-۶۶۔ [2] امام غزالیؒ نے جس ڈھنگ پر اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے علامہ ابن رشد کو اس سے اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات کے بارے میں بالقوہ اور بالفعل

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

بحث کے دو پہلو

خدا کی کیا صفات ہیں اور وہ کیا خصوصیات رکھتا ہے اس سوال پر انسان نے ہمیشہ دو پہلوؤں سے غور کیا ہے؟ ایک پہلو یہ کہ کائنات کے خالق کے اندر کن صفات کا پایا جانا ضروری ہے؟ اور یہ وسیع کائنات کس قسم کے خدا کا تقاضا کرتی ہے؛ دوسرا پہلو یہ کہ انسان "اپنے" خدا کو کن صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے؟ کیونکہ خدا کا مسئلہ انسان کے لیے خالص کائناتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کا جذباتی و نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔ جو تصور خدا پہلے سوال کا جواب نہ دے وہ خدا اور کائنات کے تعلق کو بتا نہیں سکتا۔ اور جو تصور دوسرے سوال کو حل نہ کرے اس میں انسان کا مقصود اور منتہا بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

قرآن نے خدا کا تعارف ان ہی دو پہلوؤں سے کرایا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خدا اور کائنات کے درمیان کیا تعلق ہے اور انسان خدا سے اپنا رشتہ کیسے جوڑ سکتا ہے؟ قرآن کا خدا، کائنات کا خالق ہے، مدبر و منتظم ہے اور سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ساتھ ہی وہ انسان کا بہی خواہ ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کی بحث قرآن و حدیث کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے نقطہ نظر کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ خدا عالم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "انہ عالم بالشیٔ قبل ان یکون علیٰ انہ سیکون وعالم بالشی اذا کان علیٰ انہ قد کان وعالم بما قد تلف انہ تلف فی وقت تلفہ وھذا ھو الذی تقتضیہ اصول الشرع" الکشف من مناہج الادلہ ۵۲

یعنی کسی چیز کے وجود میں آنے سے پہلے خدا کے عالم ہونے کا یہ معنی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ چیز وجود میں آئے گی اور جب وہ وجود میں آجاتی ہے تو اس وقت اس کے عالم ہونے کا یہ معنی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ چیز وجود میں آگئی۔ جو چیز تلف ہوئی اس کی مناسبت سے اس کے عالم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس وقت تلف ہوئی خدا اس وقت جانتا ہے کہ وہ تلف ہو چکی۔ خدا کی صفات کے بارے میں اصول شریعت اسی تشریح کا تقاضہ کرتے ہیں۔)

ہمارے خیال میں ابن رشد نے کتاب و سنت کی روح سے قریب تر بات کہی ہے لیکن یہ بحث جس حد تک علمی رنگ میں غور و فکر کی طالب ہے ابن رشد نے اس حد تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ممکن ہے ابن رشد نے کسی دوسرے مقام پر یہ بحث اور زیادہ علمی انداز میں کی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

محسن ہے، حامی و ناصر ہے اور اس کا ملجا و ماویٰ ہے۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝

(المومنون: ۸۸۔۸۹)

تم ان سے پوچھو اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور وہی پناہ دیتا ہے اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ طاقت و اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے، ان سے کہو کہ پھر تم کہاں بہکے جاتے ہو۔

آئیے اب ہم ان دونوں پہلوؤں پر الگ الگ غور کریں۔

قرآن خدا کی صفات کو کائنات سے ثابت کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے کچھ خصوصیات اور صفات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہ صفات اور خصوصیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا بھی ان سے متصف ہے۔ ایک تحریر جو آپ کے سامنے ہے اسے دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کا لکھنے والا کن صلاحیتوں کا مالک ہے، وہ کن علوم سے واقف ہے اور اس کو اپنی بات پیش کرنے کا کتنا سلیقہ ہے؟ ٹھیک اسی طرح یہ کائنات بتاتی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والی ہستی کن صفات کی حامل ہے اور وہ کیا صلاحیتیں اور قوتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ آپ کسی جاہل انسان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ کوئی کامیاب تحریر لکھے گا۔ بالکل اسی طرح عقل کہتی ہے کہ جو صفت خالق کائنات میں نہیں ہے وہ اپنی مخلوق میں بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

قرآن خدا کی ایک ایک صفت کو اسی فطری اور واضح اصول کے تحت انسان کے ذہن نشین کراتا ہے۔ مثال کے طور پر خدا نے کائنات کی ہر چیز پیدا کی ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ الانعام ۱۰۲، اور تخلیق میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جن لوگوں کو یہ خدا کا ہمسر اور شریک سمجھتے ہیں ان کو کوئی اختیار نہیں ہے) اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خدا ہی کو خالق ماننا چاہیے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ الانعام ۱۰۳ (یہ اللہ ہے تمہارا رب، سوائے اس کے کوئی معبود نہیں وہ ہر چیز کا خالق ہے پس تم اسی کی عبادت کرو) ایک دوسری مثال لیجیے۔ رزق خدا کی طرف سے

ملتا ہے۔ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ ط السبا ۲۴ (تم ان سے پوچھو وہ کون ہے جو تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے کہو اللہ!) اس لئے "لازق" صرف خدا کی ذات ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ۔ ذاریات ۵۸ - (بلاشبہ اللہ ہی ہے جو رزق دینے والا، قوت والا اور مضبوط ہے) اسی طرح جو قوت وطاقت جو علم وحکمت اور جو خوبی اور کمال اس کائنات میں موجود ہے ماننا پڑے گا کہ خدا کے اندر بھی وہ ساری خوبیاں ہیں۔ قرآن کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات میں جو صفات پائی جاتی ہیں اگر خدا کے اندر وہ صفات نہیں تو کائنات میں وہ کیسے پیدا ہوگئیں۔ علت جن اثرات سے خالی ہے معلول میں وہ اثرات کہاں سے آگئے۔

وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً (حم سجدہ ۱۵)	وہ کہتے ہیں ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟ کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا اس کی قوت وطاقت ان کی قوت سے بھی زیادہ ہے

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

کل ما فی المخلوقات من قوة وشدة تدل علی ان اللہ اقوی واشد وما فیھا من علم یدل علی ان اللہ اعلم وما فیھا من علم وحیٰوة یدل علی ان اللہ اولیٰ بالعلم والحیٰوة[1]	مخلوقات میں جو قوت اور طاقت پائی جاتی ہے وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خدا ان سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے اور مخلوقات میں جو علم ہے وہ بتاتا ہے کہ اللہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے اسی طرح مخلوقات میں جو علم اور حیات ہے ظاہر کرتا ہے کہ خدا بدرجہ اولیٰ علم اور حیات سے متصف ہے۔

اب انسان کی نفسیات کے پہلو سے غور کیجیے، انسان جن وجوہ سے خدا کو مانتا ہے ان میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کا محتاج ہے۔ انسان اپنے لیے ایک مضبوط سہارا چاہتا ہے اور اس کائنات میں سوائے خدا کے کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس پر وہ اعتماد کرسکے۔ دنیا میں جتنے ممکن

---

[1] مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص۲۸۹۔

سہارے ہیں وہ سب اسے دھوکا دے جاتے ہیں۔ وہ اپنی قوت و توانائی پر بھروسہ نہیں کر سکتا کیونکہ بیماری کا ایک ہی حملہ اس کو بے بس کر دیتا ہے۔ زندگی اس کے لیے ناقابل اعتبار ہے کیونکہ زندگی کے جو لمحات آج اسے حاصل ہیں یقین نہیں کہ کل وہ باقی رہیں گے۔ مال و دولت پر وہ تکیہ نہیں کر سکتا اس لیے کہ جس طرح دوسروں سے چھن کر دولت اس کے ہاتھ میں آئی ہے اسی طرح اس کے ہاتھ سے بھی چھن سکتی ہے۔ وہ اپنے خویش و اقارب کی مدد پر یقین نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بہت سے معاملات میں وہ بھی اسی کی طرح عاجز ہیں۔ اس لیے انسان کی نفسیات میں خدا کی طلب موجود ہے۔ وہ فطری طور پر اس کو ہر مصیبت میں اپنا سہارا تصور کرتا ہے اور اس کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے اندر بہت سی ایسی لازوال اور بے پایاں خوبیاں ہوں جو کائنات کی کسی بھی چیز میں نہیں ہیں۔ انسان جن چیزوں پر اعتماد کر سکتا ہے وہ سب فانی ہیں۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کا خدا غیر فانی ہو، جس کی زندگی لامحدود اور ابدی ہو اور جس کے بارے میں وہ کبھی یہ سوچ نہ سکے کہ اس کا سہارا ختم ہو گیا ہے۔ قرآن انسان کی اس نفسیاتی طلب کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں تمہارا خدا ایسا ہی ہے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ (الفرقان: ۵۸) (تم بھروسہ کرو اس خدا پر جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں ہے) انسان چاہتا ہے کہ خدا اس کی پناہ گاہ ہو، کہیں اسے پناہ نہ ملے تو اس کے دامن میں پناہ ملے اور وہ بے بس ہو کر خدا کی طرف ہاتھ پھیلائے تو اس کی مدد کے لیے وہ موجود ہو۔ انسان کی اس فطری مانگ کے جواب میں قرآن بتاتا ہے کہ خدا یقیناً تمہارا پناہ دہندہ ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ النمل ۶۲ (جب کوئی مجبور و بے قرار انسان اس کو پکارتا ہے تو خدا کے سوا کون ہے جو اس کی پکار کو سنتا ہے اور تکلیف کو دور کرتا ہے) انسان چاہتا ہے کہ خدا اس سے قریب ہو، اس کی پکار کا جواب دے اور اس کی دعائیں سنے، قرآن خدا کی طرف سے اعلان کرتا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ	اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں
قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا	دریافت کریں تو انہیں بتا دو کہ میں تم سے
دَعَانِ	قریب ہوں جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو
(البقرہ: ۱۸۶)	میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

انسان چاہتا ہے کہ خدا اپنے دوستوں سے محبت کرے اور جو اس کے باغی اور نافرمان ہیں ان کا اس کی

محبت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ قرآن خدا کی صفت یہ بیان کرتا ہے :

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ	یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ان لوگوں کا سرپرست
اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى	ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کا کوئی
لَهُمْ (محمد : ۱۱)	سرپرست نہیں ہے۔

اسی طرح انسان کی خواہش ہے کہ خدا کے اندر ایک دو نہیں وہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہوں جن سے وہ واقف ہے اور وہ ان تمام نقائص سے پاک ہو جو اس کے نزدیک کسی کے شرف کو داغدار بنانے والے ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ خدا عظمت و بزرگی کے سب سے اونچے مقام پر ہو، وہ اتنا بلند و برتر ہو کہ وہ اس کے جلال و جمال کا تصور کرنا چاہے تو تھک تھک جائے پھر بھی اس کی عظمت کو نہ پا سکے۔ انسان کے ان فطری احساسات کی تسکین ہو جاتی ہے جب قرآن خدا کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے سب سے اونچی مثال ہے) وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ الجاثیہ ۳۷۔ (آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے ہے ساری بڑائی اور وہ غالب اور حکمت والا ہے)

کائنات کا مطالعہ اور اپنی بے بسی کا احساس یہ دو چیزیں ہیں جو انسان پر خدا کی صفات کو کھولتی ہیں۔ انسان کا مطالعۂ کائنات جتنا وسیع اور گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ خدا کی صفات کا شعور بھی اس کو حاصل ہوگا۔ اسی طرح انسان کے اندر اگر اپنی بے بسی کا احساس بڑھا ہوا ہے تو ہر نعمت اور ہر مصیبت میں خدا کی خدائی اور اس کی قدرت کے راز اس پر کھلیں گے۔ قرآن میں خدا کے بہت سے اسماء صفات بیان ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا ہے :۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ	کہہ دو کہ تم اس کو اللہ کے لفظ سے پکار و یا
اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى	رحمٰن کے لفظ سے یاد کرو۔ جس نام سے بھی
(بنی اسرائیل ۔ ۱۱)	تم یاد کرو سارے اسماءِ حسنیٰ اسی کے لیے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے اسماءِ حسنیٰ کسی خاص تعداد میں محدود نہیں ہیں بلکہ قیامت تک اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان پر خدا کے حسن و جمال کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوں اور وہ ان کے ذریعہ خدا کو یاد کر سکے، اس کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا سے ہوتی ہے :۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ	اے اللہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں تیرا غلام
وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ	ہوں اور تیرے غلام اور باندی کی اولاد ہوں
مَاضٍ فِیَّ حُکْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ	میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ مجھ پر تیرا
اَسْئَلُكَ بِکُلِّ اسْمٍ ھُوَلَكَ سَمَّیْتَ	ہر حکم جاری ہو رہا ہے۔ میرے بارے میں تو
بِہٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَہٗ فِیْ کِتَابِكَ	جو بھی فیصلہ کرے وہ سراسر عدل و انصاف
اَوْ عَلَّمْتَہٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ اَوْ	ہوگا۔ خدایا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں
اِسْتَاْثَرْتَ بِہٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ	تیرے ہر اس نام کے ذریعہ جس سے تو نے
عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ	اپنی ذات کو موسوم کیا ہے یا جسے تو نے اپنی
قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ	کتاب میں نازل کیا ہے یا جسے تو نے اپنے
وَذِھَابَ ھَمِّیْ وَغَمِّیْ [1]	بندوں میں سے کسی بندے کو سکھا یا ہے یا جو

تیرے علم غیب میں موجود ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار اور میرے سینہ کا نور بنا دے، میرا حزن و ملال اس سے دور ہو اور میرا فکر و غم اس سے چھٹ جائے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کے اسماء وہی نہیں ہیں جو خدا کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں یا جن سے خدا نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے۔ بلکہ بہت سے اسماء وہ ہیں جن تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ ہمارے لیے علم غیب ہیں۔ ساتھ ہی حدیث یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کو خدا کے نئے اسماء کا علم ہو سکتا ہے وہ خدا کی ان صفات سے واقف ہو سکتا ہے جن سے ابھی تک دوسرے نا آشنا ہیں۔

لیکن اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس اور نفسیات کے مطالعہ سے انسان کو خدا کی

---

[1] آپؐ نے فرمایا، انسان کو تکلیف یا صدمہ پہنچے اور وہ یہ دعا پڑھے تو اللہ اس کی تکلیف کو دور فرمائے گا اور اس کے غم کو خوشی سے بدل دے گا۔ اس حدیث کو صاحب مشکوٰۃ نے صرف رزین کے حوالہ سے نقل کیا ہے (باب الدعوات فی الاوقات ص۲۰۸) لیکن علامہ محمد بن مرتضیٰ یمانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مسند احمد اور صحیح ابو عوانہ میں موجود ہے۔ ہیثمی کی مجمع الزوائد میں مسند احمد کے ساتھ ابو یعلیٰ اور بزار کے حوالہ بھی ملتے ہیں تفصیل کے لیے دیکھیے "ایثار الحق علی الخلق" مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۸ھ ص۱۷۰۔

معرفت حاصل ہو جائے گی۔ خدا کی ذات وصفات کا شعور اس شخص کو نصیب ہوتا ہے جس کے اندر خدا کو پانے اور اس کی صفات کو سمجھنے کی سچی تڑپ ہو اور وہ کائنات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھے کہ وہ خدا کی تخلیق ہے۔ ایسا شخص کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کی نئی نئی صفات کا جلوہ دیکھے گا۔ وہ ٹھنڈی ہوا میں سانس لے یا راستہ چلتے ہوئے ٹھوکر کھائے دونوں صورتوں میں خدا کی قدرت کا ایک نیا احساس اس کے اندر جاگ اٹھے گا۔ وہ کائنات کے سیدھے سادے مشاہدہ اور روزمرہ کے واقعات سے اس حقیقت تک پہنچ جائے گا جس تک کوئی ایسا شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو خدا سے بے نیاز ہو کر کائنات کی وسعتوں میں کھویا ہوا ہو۔ اس پر کائنات کے نئے نئے گوشے کھلتے چلے جائیں گے لیکن پھر بھی وہ خدا کے یقین اور اس کی صفات کے شعور سے محروم ہی رہے گا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں
وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ	ہیں جن پر سے یہ گزرتے تو ہیں لیکن اعراض
عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ (یوسف ۱۰۵)	کرتے ہوئے اور منہ پھیرے ہوئے

ایک سوال

اوپر کی بحث سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ آئیے یہاں اس سوال پر غور کیا جائے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا صحیح اور مکمل تعارف کراتا ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قرآن میں خدا کی صفات کا واضح تعین ہو۔ تاکہ انسان خدا کی طرف کوئی نامناسب صفت منسوب نہ کر سکے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کو خدا کی نئی نئی صفات کا علم ہو سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن نے خدا کی صفات کا واضح اور متعین تصور نہیں دیا ہے اور اس بات کی گنجائش ہے کہ انسان اپنی عقل سے کچھ صفات کا اضافہ کر سکے۔ کیا یہ خیال قرآن کے مقصدِ نزول کے خلاف نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں خدائے تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر ہے وہ خدا کے بارے میں غور و فکر کے عنوانات ہیں۔ انسان کائنات پر جس قدر غور کرے گا اسی قدر خدا کی صفات کے نئے نئے پہلو اس کے سامنے آتے جائیں گے لیکن کوئی بھی نیا پہلو ایسا ہو نہیں سکتا جو قرآن کے بتائے ہوئے صفاتِ الٰہی میں شامل نہ ہو جائے۔ قرآن نے بھی خدا کی ایک ایک صفت کے مختلف پہلو نمایاں کیے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا کو صاحبِ علم کہا گیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ۔ (مومن : ۱۹)	وہ نگاہوں کی خیانت اور سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خدا کو مستقبل کے پردے میں چھپے ہوئے تمام واقعات کا علم ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِىْ نَفْسٌ بِاَىِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝ (لقمان : ۳۴)	اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، وہ بارش کو نازل کرتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب آئے گی، وہ جانتا ہے جو رحموں میں ہوتا ہے۔ کسی نفس کو نہیں معلوم کہ وہ کل کیا کمائے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی۔ بلاشبہ اللہ علم والا اور باخبر ہے

خدا کے صاحب علم ہونے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ماضی کا کوئی واقعہ اس کے ذہن سے غائب نہیں ہوتا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۝ (مریم:۶۴) تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے

اس کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ کس وقت کس کام میں خیر ہے اور کون سا کام نقصان دہ ہے اس کو وہ جانتا ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ:۲۱۶) اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

اس طرح کے اور بھی بہت سے پہلو ہوسکتے ہیں۔ قرآن نے خدا کے علم کے اُن مختلف پہلوؤں کو ابھارنے کے لیے خدا کے کئی ایک اسماء کا ذکر کیا ہے وہ کبھی اس کو "عالم" کہتا ہے، کبھی "علیم" کہتا ہے۔ کبھی "علام الغیوب" (غیب کی چیزوں کا جاننے والا) کہتا ہے۔ کبھی "خبیر" (باخبر) کہتا ہے، اور کبھی لطیف (باریک بین) کہتا ہے۔ حالانکہ ان تمام اسماء کا تعلق خدا کے علم ہی سے ہے لیکن چونکہ ان میں سے ہر اسم خدا کے صفت علم کے ایک خاص رخ کو واضح کرتا ہے اس لیے ان سب کو الگ الگ اسماءِ الٰہی مانا جاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن میں خدا کو حکیم اور قوی کہا گیا ہے، یہ ہوسکتا ہے کہ کسی شخص پر خدا کی حکمت اور قوت کا کوئی ایسا پہلو اجاگر ہو جو اس سے پہلے لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا اس لحاظ سے

اس کو خدا کا ایک نیا اسم دریافت ہوا ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کا امکان ہے کہ جو شخص خدا کے بارے میں غور و فکر کرے اس پر خدا کی صفات کے ایسے گوشے کھل جائیں جو دوسروں پر نہیں کھلے تھے۔ اس امکان کو ختم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا کے بارے میں جو کچھ سوچا جا چکا ہے اس سے آگے غور و فکر کو ہم بے معنی اور لاحاصل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی ذات و صفات کا احاطہ ممکن نہیں، وہ ایک بے پایاں سمندر ہے جس کی ابتدا اور انتہا کو کوئی نہیں پا سکتا۔[1]

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو خدا کی کوئی نئی صفت تو نہیں معلوم ہوتی، البتہ جن صفات کو وہ جانتا ہے ان کے درمیان ایک خاص معنوی ربط تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو خدا کی عظمت و بزرگی کے اظہار و اعتراف کے لیے موزوں ترین تعبیر مل جاتی ہے۔ اس کی مثالیں حدیث

---

[1] یہاں ایک حدیث کا ذکر کرنا ضروری ہے، کیونکہ اس کا اوپر کے سوال سے گہرا تعلق ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایت ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں: اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا مِائَۃً اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ (کتاب الذکر والدعاء، باب اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاہا) خدا ئے تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں ایک کم سو۔ جو شخص ان ناموں کو یاد کر لے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ترمذی کی ایک روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں محدثین کو بڑی زحمت پیش آئی ہے، کیونکہ خود قرآن میں جن اسماء الٰہی کا ذکر ہے وہ ننانوے سے زیادہ ہیں اور اگر اس کے ساتھ ان اسماء کو بھی شامل کر لیا جائے جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں تو یہ تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ معلومات علامہ مرتضیٰ یمانی نے اکٹھا کی ہیں (ملاحظہ ہو ایثار الحق علی الخلق ص ۱۷۷۔۱۶۹) انہوں نے ترمذی کی روایت کو جس میں اسماء الٰہی کی تفصیل ہے رد کر دیا ہے کیونکہ یہ سنداً کمزور ہے۔ لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ مجملاً اتنی بات صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں اور خود علامہ موصوف کو اعتراف ہے کہ قرآن و حدیث میں اسماء الٰہی مذکورہ تعداد سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ہمارا ذہن اس طرح کام کر رہا ہے کہ شاید خدا کے ننانوے اسماء اس کی بے شمار صفات کے ننانوے عنوانات ہوں اور پھر ہر عنوان کے تحت بہت سی صفات آتی ہوں۔ اگر اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ قرآن و حدیث میں جن اسماء الٰہی کا ذکر ہے ان کو ننانوے اسماء خاص یا ننانوے عنوانات کے تحت لایا جاسکے۔

میں بہت سی موجود ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر تعریف فرمائی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ ایک شخص نے نماز میں دعا کی۔ دعا کے الفاظ یہ تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنَّ لَکَ الْحَمْدُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ اَسْئَلُکَ۔	اے اللہ! میں تجھ سے مانگ رہا ہوں کیونکہ حمد تیرے ہی لیے ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو بڑا مہربان اور بڑا محسن ہے۔ تو آسمان اور زمین کا خالق ہے۔ اے وہ ذات جو زندہ و پایندہ اور قائم و دائم ہے، میں تجھ سے مانگ رہا ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا:

دَعَا اللّٰہَ بِاِسْمِہِ الْاَعْظَمِ الَّذِیْ اِذَا دُعِیَ بِہٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِہٖ اَعْطٰی[۱]	اس نے خدا کا اسمِ اعظم لے کر اس سے دعا کی ہے، اس نام کے ساتھ جب خدا کو بلایا جاتا ہے تو وہ ضرور جواب دیتا ہے اور اُس کے ذریعہ جب اس سے مانگا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے۔

قرآن نے خدا کی جو صفات بیان کی ہیں وہ ہمارے نزدیک خدا کے بارے میں غور و فکر کے حدود ہیں۔ ان حدود سے جو شخص آگے نکلنے کی کوشش کرے گا وہ غلط راہ پر پڑ جائے گا۔ البتہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے فکر و تدبر کا میدان بہت وسیع ہے۔ ایک مثال لیجیے۔ قرآن میں خدا کو سمیع و بصیر سننے اور دیکھنے والا۔ کہا گیا ہے۔ ہر دور میں انسان خدا کی ان صفات کے نئے نئے گوشے تلاش کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات خدا کے انکار کے ہم معنی ہوگی کہ خدا کو سمع و بصر کی قوتوں سے خالی مانا جائے اور اندھے بہرے مادے کو خدائی کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے۔ قرآن میں صراحت ہے کہ خدا کو اس کے اسماءِ حسنیٰ کے ساتھ یاد کرنا چاہیے۔ خدا کے مقدس ناموں کو بگاڑنا اور ان میں تحریف کرنا، ان لوگوں کی روش ہے جن کے سینے خدا کے خوف سے خالی ہیں۔

وَلِلّٰہِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ	اور اللہ ہی کے لیے ہیں تمام اچھے نام، تم

---

[۱] مشکوٰۃ، کتاب اسماء اللہ تعالیٰ بحوالہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ۔

بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْ اَسْمَائِهٖ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○
(الاعراف : ۱۸۰)

اس کو اچھے ناموں ہی سے پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں الحاد سے کام لیتے ہیں۔ ان کو ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

اس آیت میں جس عمل سے روکا گیا ہے وہ ہے "الحاد فی الاسماء" الحاد کے معنی ہیں پھیر دینا، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی کسی صفت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ جو صفت، خاص اس کی ہے اور جس کے بغیر خدا کا تصور مکمل نہیں ہوتا اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی کسی صفت میں دوسروں کو شریک کیا جائے۔ اور ایک خدا کو دس خداؤں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلی صورت کفر ہے اور دوسری شرک۔ اور یہ دونوں صورتیں قرآن کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم ہیں۔

خدا کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں

انسان کائنات کے مطالعہ اور اپنے باطن کے احساسات کی مدد سے خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کی کسی ایک ہی صفت کی وسعت اور گہرائی کو پالے۔ کیونکہ کائنات کے بارے میں انسان کی معلومات خواہ کتنی ہی بڑھ کیوں نہ جائیں اس کی وسعتیں ہمیشہ اس کے اندازے سے باہر ہی ہوں گی۔ کائنات ایک سمندر ہے جس کے ایک ننھے سے جزیرے پر ہم آباد ہیں۔ اس جزیرے پر کھڑے ہو کر ہم بہت ہی تھوڑے سے فاصلہ تک سطحِ سمندر کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے کنارے ہماری نگاہوں سے بہت دور ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی وسعت کیا ہے اور وہ کتنا گہرا ہے اور اس کے سینے میں کس قسم کی چیزیں چھپی ہوئی ہیں؟ کائنات کے بارے میں چند حقیر سی معلومات کو لے کر خالقِ کائنات کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ۔ (الانعام: ۵۹)

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

اسی کے ساتھ قرآن ایک اور حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، وہ یہ کہ کائنات جامد نہیں ہے بلکہ ہر آن تغیر و انقلاب سے گزر رہی ہے اور اس میں مسلسل تخریب و تعمیر کا عمل جاری ہے۔ اس لیے

انسان کائنات کے بارے میں تمام معلومات کو سمیٹنا چاہے تو سمیٹ نہیں سکتا۔ جو کائنات اس وقت ہے، تخلیق و فنا کا عمل ایک وقفہ کے بعد اس کو ختم کر کے ایک دوسری کائنات پیدا کر دیتا ہے۔ موجودات کو پیدا کرنے کے بعد ایسا نہیں ہے کہ خدائے تعالیٰ تخلیق کے کام سے فارغ ہو گیا ہو، بلکہ "یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ" فاطر۔۱ (وہ تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے) سورۂ نحل میں فرمایا: وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۰ ۸ (وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے جن کو تم نہیں جانتے) قرآن میں خدا کو رَبُّ کُلِّ شَیْءٍ (ہر چیز کا رب) کہا گیا ہے۔ قرآن کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (تعریف ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے) "رب" وہ ہے جو تربیت اور نشو و نما دے۔ خدا ہر چیز کا رب ہے، کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ترقی دے رہا ہے اور اس کو مخالف قوتوں سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ وہ اس کو اس طرح آگے کی طرف لے جا رہا ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہی ہے۔ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کائنات کی ساخت پر غور کریں۔ کائنات میں زندگی اور حیات ہے، لیکن یہ ایک خاص مقدار میں ہے۔ جب یہاں کوئی چیز اپنا عمل کرتی ہے تو اپنی قوت حیات کا مسلسل اخراج کرتی رہتی ہے، لہٰذا اس کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر نئی توانائی پیدا کی جاتی رہے ورنہ وہ اپنی قوت حیات کھو دے گی اور فنا ہو جائے گی۔ کائنات کو ہم حرکت اور عمل میں اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اس کا رب اس کے اندر پیہم زندگی اور حرارت پیدا کر رہا ہے۔ رَبُّکُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِیْ فَطَرَهُنَّ ۔ الانبیاء ۵۶ (تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جس نے ان کو پیدا کیا) یعنی وہ زمین و آسمان کا صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ ان کی تربیت اور نشو و نما بھی اس طرح کر رہا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں اور اپنا کام کر رہے ہیں۔

ایک ایسی کائنات، جس میں مسلسل تخلیق و فنا کا عمل ہو رہا ہے اور جس کی تربیت اور نشو و نما جاری ہے۔ اس کے بارے میں انسان کا مطالعہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک چیز کو پائے گا نہیں کہ دس چیزیں اس سے چھوٹ جائیں گی۔

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ انسان کے باطن میں خدا کا زبردست احساس موجود ہے لیکن یہ احساس خدا کو سمجھنے کا بہت ہی ناکافی ذریعہ ہے۔ اس سے خدا کی ذات و صفات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

کوئی بھی شخص خدا کی صفات کا جیسی کہ وہ ہیں احساس نہیں کرتا بلکہ اپنے مزاج اور صلاحیت کے لحاظ سے ان کو محسوس کرتا ہے۔ صلاحیتوں کی کمی بیشی سے صفات کا فہم بھی کم یا زیادہ ہو جاتا ہے۔ ایک سائنسداں خدا کی قدرت اور علم و حکمت کا جتنا وسیع تصور کر سکتا ہے اتنا وسیع تصور غیر سائنسداں کے لیے دشوار ہے۔ علاوہ ازیں جس وقت انسان خدا کے احساس سے سرشار ہوتا ہے، وہ آزاد نہیں ہوتا بلکہ خارج کے حالات اس پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ایک مریض جسے خدا نے صحت عطا کی ہو اس بات کا بڑا اچھا احساس کر سکتا ہے کہ خدا ہمدرد اور مہربان ہے، جب کہ ایک توانا و تندرست انسان کے لیے اس کا پورا پورا احساس دشوار ہے۔ ایک بے کس انسان کی بے کسی دور ہو جائے تو اس کو خدا کی دستگیری کا جو گہرا شعور نصیب ہوگا وہ اس شخص کو نہیں مل سکتا جس نے بے کسی کا مزہ نہ چکھا ہو۔ ایک بھوکا جسے اچانک پیٹ بھر کر کھانا مل جائے اس کے لیے ایک خوش حال انسان کے مقابلہ میں خدا کی رزاقی کو سمجھنا بہت آسان ہے، اس لیے یہ ایک قطعی بات ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا کی کسی صفت کی کم یا زیادہ جو اہمیت متعین ہوتی ہے وہ واقعہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے ذہن اور حالات کے لحاظ سے ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک انسان کے احساسات میں جو نقص ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دوسرے انسانوں کے احساسات کے مطالعہ سے وہ دور ہو جائے، کیا نوع انسانی کے مختلف طبقات کے احساسات خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر فرد کے احساسات کی دنیا دوسرے فرد کے احساسات کی دنیا سے بالکل الگ ہے۔ محبّت اور نفرت، غصّہ اور خوشی، ہمدردی اور بے رحمی ہر شخص کی ذاتی ملکیت ہیں ان پر نہ تو کسی کا حق ہے اور نہ یہ منتقل کیا جانے والا سامان ہے۔ یہ باطنی کیفیات ہیں جن کو انسان پوری شدت کے ساتھ اپنی جگہ محسوس کرتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ تو کسی تحریر میں انھیں قلم بند کیا جا سکتا ہے اور نہ تقریر کے ذریعہ ان کا اظہار ممکن ہے۔ ایک مصیبت زدہ شخص کو دیکھ کر دوسرے شخص کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور وہ اس کے ہاتھ میں چند پیسے رکھ دیتا ہے تو ہم اس کو ہمدردی کا نام دیتے ہیں لیکن اس واقعہ کے نتیجہ میں ان چند پیسوں کے دینے والے پر کیا کیفیت گزری اور ان کے لینے والے نے کن احساسات کے ساتھ لیا، اس کو آپ کسی ڈکشنری میں نہیں پا سکتے۔ البتہ ڈکشنری کی تصریحات سے

زیادہ واضح طور پر اس کو وہ دونوں افراد محسوس کر رہے ہیں جن پر یہ واقعہ گزر رہا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص ہر طرف سے مایوس ہو کر خدا کے دربار میں اپنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے اور اس کے بعد اس کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ہاں اب تمہاری دعا سن لی گئی اور تمہارے ہاتھ مراد سے بھر گئے تو یہ ایسی کیفیت ہے جسے نہ تو کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ اسے سمجھا یا جا سکتا ہے۔ لیکن جس شخص نے اس کیفیت کو محسوس کیا ہے اس کے لیے آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز سے زیادہ یہ یقینی چیز ہے۔ خدا کے رحم و کرم کو ہر شخص محسوس کر سکتا ہے، لیکن اس احساس کی نوعیت ہر ایک کے لیے بالکل جدا ہے۔ آپ خدا کے رحم و کرم کے بارے میں جس قسم کے احساسات رکھتے ہیں حقیقت اسی میں محدود نہیں ہے بلکہ خدا کی رحمت ہر شخص کے لیے ویسی ہے جیسے کہ وہ خود محسوس کر رہا ہے۔ آپ کے احساسات میں نہ تو کوئی دوسرا شریک ہے اور نہ دوسرے کے احساسات میں آپ کا کوئی حصہ ہے۔ بے شمار انسانوں کو اپنی زندگی کے نشیب و فراز میں خدا کی بہت سی صفات کا احساس ہوتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا احساس بالکل انفرادی احساس ہے جسے ہم دوسروں تک وسیع نہیں کر سکتے۔ انفرادی احساس کے بارے میں ہم جان سکتے ہیں کہ وہ حقیقت کے تابع نہیں ہوتا، بلکہ فرد کے حالات اور صلاحیتوں کے تابع ہوتا ہے۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدا کے بارے میں تمام انسانوں کے احساسات بھی خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

تدبر کائنات اور نفسیات کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ جو شخص اپنے علم و فکر کے بارے میں دھوکے میں نہیں ہے، اور ساتھ ہی اپنی حقیقت سے بھی آگاہ ہے وہ جب کبھی خدا کے بارے میں غور کرے گا اس کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اپنی بے بسی کا لازماً اعتراف کرنا پڑے گا۔ آپؐ نے سجدہ میں سر رکھ کر فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ[1]	اے اللہ میں تیری رضا کے واسطے سے تیرے غصے سے اور تیرے عفو و درگزر کے واسطے سے تیری سزا سے پناہ مانگتا ہوں اور خود تجھ سے پناہ چاہتا ہوں میں تیری حمد و ثنا پوری طرح کر نہیں سکتا خدایا تو بالکل ویسا ہے جیسا کہ خود تو نے اپنے بارے میں کہا ہے۔

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب ما یقال فی الرکوع والسجود

خدااور مخلوق کی صفات کا فرق

قرآن میں خدائے تعالیٰ کی بہت سی صفات بیان ہوئی ہیں۔ ان صفات پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی نوعیت میں انسان اور کائنات کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا خالق ہے، قادر ہے، عالم ہے، سمیع و بصیر ہے، رازق ہے، مددگار ہے، زندہ ہے اور شعور اور ارادہ رکھتا ہے وغیرہ۔ ان صفات کی جھلک ہم انسان کی ذات اور کائنات میں دیکھتے ہیں یہاں بھی ہمیں زندگی اور ارادہ ملتا ہے، علم اور قدرت اور سننے اور دیکھنے کی قوتیں ملتی ہیں، اور ہمدردی اور تعاون کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے، تو کیا خدا کی صفات کی یہی حقیقت ہے کہ جس پیمانہ پر ہم یہاں ان کا مشاہدہ اپنی ذات اور اپنی ذات سے باہر کر رہے ہیں وہ خدا کے اندر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں؟

تاریخ میں بہت سے انسانوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جس چیز میں بھی انہوں نے کچھ غیر معمولی قوتوں کا مشاہدہ کیا اس کو خدا بنا لیا یا جن افراد نے اپنے اندر دوسروں سے زیادہ قوت دیکھی وہ خدا بن بیٹھے اور جسے کمزور پایا اسے اپنی بندگی کی دعوت دینے لگے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ الجن ۱۸ (پس تم خدا کے سوا کسی کو نہ پکارو) کیونکہ کسی مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ ان کا مخلوق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کے تابع ہیں اور خدائی کے حق سے محروم ہیں۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا۔ (مریم: ۹۲: ۹۳)	آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب کی سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آنے والی ہیں ان کو اس نے شمار کر لیا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے۔

فرعون نے اپنے اقتدار کو خدائی کے ہم معنی سمجھا اور اعلان کیا:

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى	تمہارا سب سے بڑا رب تو میں ہوں

قرآن کہتا ہے کہ:

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى۔ (النازعات: ۲۵،۲۴)	اللہ نے اس کو اس طرح پکڑا کہ دنیا اور آخرت میں عبرت کا سامان بن گیا۔

فرشتے اور جن کم از کم مذہب کی دنیا میں غیر معمولی قوتوں کے مالک سمجھے گئے ہیں۔ قرآن بھی ان کے وجود کو مانتا ہے اور ان کی بڑھی ہوئی قوتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے نزدیک خدا نہیں ہیں۔ فرشتوں کے بارے میں کہا:

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰـهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۲۹)	ان میں سے جو یہ کہے کہ خدا کے بجائے میں الٰہ ہوں تو ہم اس کی اس بات پر اسے جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

جنوں کے متعلق کہا:

وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ	بلاشبہ جن خوب جانتے ہیں کہ ان کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے۔

پیغمبروں کو ان کی اخلاقی و روحانی خصوصیات کی وجہ سے انسانوں کے درمیان ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل رہا ہے، لیکن ان کی اس خصوصیت اور بلندی کو بعض اوقات الوہیت کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ قرآن نے جگہ جگہ اس کی تردید کی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (آل عمران: ۷۹-۸۰)	ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اپنی طرف سے کتاب، قوت اقتدار اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم بجائے خدا کے میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ جو کچھ کہے گا یہ ہے کہ تم خدا پرست بن جاؤ، جبکہ تم خدا کی کتاب دوسروں کو سکھاتے اور خود پڑھتے ہو، اور نہ وہ تم کو اس بات کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب بنالو، کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو؟

انسان خدا کی مخلوق کو کیوں خدا سمجھنے لگتا ہے؟ جو چیزیں خدا کی پیدا کردہ ہیں اور جو خدا کی مدد اور سہارے کے بغیر ایک لمحہ کے لیے زندہ نہیں رہ سکتیں، انسان ان کے بارے میں کیوں اس غلط فہمی میں پڑجاتا ہے کہ وہ خدا ہیں؟

اس سوال کا جواب آپ کو آسانی سے مل جائے گا اگر آپ ایک خاص پہلو سے اس پر غور کریں۔

انسان کی صلاحیت کار ایک غیر مادی چیز ہے، لیکن جب وہ کوئی مادی کام کرتا ہے تو اس غیر مادی چیز کو ٹھوس اور مادی وجود عطا کر دیتا ہے۔ ایک حسین عمارت اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ کسی انجینئر نے اپنی عمارت سازی کی صلاحیت کو اس میں منتقل کیا ہے، بلکہ زیادہ صحیح تعبیر شاید یہ ہوگی کہ انجینئر کی صلاحیت نے عمارت کا روپ دھار لیا ہے۔ اسی طرح جس وقت آپ کوئی کتاب لکھتے ہیں تو اپنی قوت تصنیف کو الفاظ کے پیکر میں ڈھالنے لگتے ہیں اور یہی الفاظ جب کاغذ پر پھیل جاتے ہیں تو کتاب تیار ہو جاتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ آپ کی قوت تصنیف جسے کوئی آنکھ دیکھ نہیں سکتی اسے آپ کتاب کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں، جس کا مطالعہ ہر شخص کے لیے ممکن ہے، کتاب بے جان ہے، اگر اس میں روح پھونک دی جائے تو وہ آپ ہی کی طرح علم و تحقیق کا مظاہرہ کرے گی۔ وہ بول نہیں سکتی، لیکن اگر اس کو قوت گویائی حاصل ہو تو ان علوم پر دنیا سے خطاب کرے گی جو اس کے اندر موجود ہیں۔ فرض کیجیے۔ کتاب اس حقیقت کو بھول جائے کہ اس کا وجود اپنا نہیں ہے بلکہ آپ کا دیا ہوا ہے اور اس میں جو علم و فن ہے وہ اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ آپ کے علم و فن کی محض نمائندگی کرتا ہے تو یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ وہ بذات خود محقق ہے اور اپنے طور پر اس نے علم و فن حاصل کیا ہے۔ اس کے اس دعویٰ کو وہ لوگ بڑی آسانی سے قبول بھی کر لیں گے جو آپ سے اس کتاب کے مصنف کی حیثیت سے ناواقف ہوں گے۔ کیونکہ ان کے سامنے ایک ایسی کتاب ہوگی جس سے علم و تحقیق نمایاں ہیں۔

یہی حال اس کائنات کا ہے، خدا جو خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے وہ اس کائنات میں نمایاں ہیں۔ یہاں وجود، علم، حکمت، قوت اور اقتدار جو کچھ ہے وہ حقیقت میں خدا کی مختلف خصوصیات ہیں جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ہیں۔ یہاں محبت اور ہمدردی ہے تو وہ خدا کی محبت اور ہمدردی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں علم اور حکمت ہے تو وہ خدا کے علم اور حکمت کی ترجمان ہے، یہاں شعور اور حیات ہے تو وہ خدا کے شعور اور حیات سے نکلا ہے۔ یہاں قوت اور توانائی

ہے تو وہ خدا کی قوت اور توانائی کا ایک حصہ ہے۔ غرض یہ کہ یہاں جو صفات اور خصوصیات ہم دیکھ رہے ہیں وہ خدا کی صفات اور خصوصیات ہم دیکھ رہے ہیں وہ خدا کی صفات اور خصوصیات سے ماخوذ ہیں [1] لیکن جو چیز ماخوذ ہے اس کو اصل قرار دینا بے وقوفی کی دلیل ہے کسی اقتدار کے نمائندے کو اقتدار کا اصل مالک وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی عقل ماؤف ہو چکی ہو یا جو عمدًا دوسروں کو دھوکا دینا

---

[1] اس موضوع پر احادیث میں بکثرت اشارے موجود ہیں۔ ہم یہاں صرف دو حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهٗ ۔ بخاری۔ کتاب الآداب، باب من وصل وصلہ اللہ "شجنہ" کہتے ہیں درخت کی گنجان جڑوں کو، حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ "رحم" (رشتہ اور قرابت داری) رحمان سے نکلی ہوئی جڑ ہیں ہیں اور یہیں سے وہ پھیلی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے "رحم" جو شخص تجھے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو اپنے سے کاٹوں گا۔ مطلب یہ کہ جو شخص رشتے کا پاس و لحاظ رکھے اس کا خدا سے رشتہ جڑے گا اور جو اس کا احترام نہ کرے خدا سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ یہی حدیث ان الفاظ میں بھی آئی ہے۔ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اَنَا الرَّحْمٰنُ وَهِیَ الرَّحِمُ شَقَقْتُ لَهَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِیْ مَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ ۔ ابوداؤد۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب فی صلۃ الرحم (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں رحمٰن ہوں اور وہ رحم ہے۔ میں نے اس کا نام اپنے نام سے نکالا ہے۔ جو شخص اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا اور جو شخص اس کو کاٹ دے گا میں بھی اس کو کاٹ دوں گا) دوسری حدیث ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الرَّحْمَةَ فِیْ مِائَةِ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَّتِسْعِیْنَ جُزْءًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ یَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ حَتّٰی یَرْفَعَ الْفَرَسُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْیَةً اَنْ تُصِیْبَهٗ بخاری، کتاب الادب، باب رحمۃ الولد وتقبیلہ الخ، مسلم، کتاب التوبہ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا تغلب غضبہ (اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے، ننانوے حصے اپنے پاس رکھ لیے اور ایک حصہ زمین پر نازل کیا۔ اس ایک حصے کا یہ اثر ہے کہ مخلوق آپس میں رحمت و الفت سے پیش آتی ہے۔ یہاں تک کہ گھوڑا اس ڈر سے کہ اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اپنا پیر اس پر نہیں رکھتا)

ان حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ قرابت اور رشتہ داری اور رحمت اور الفت کا سرچشمہ خدا کی صفات ہیں۔ ان دو صفتوں پر دوسری تمام صفات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

چاہتا ہو۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ عظمت اور بڑائی صرف خدا کے لیے ہے۔ کیونکہ یہاں جس چیز میں بھی کوئی عظمت پائی جاتی ہے وہ اس کی عظمت نہیں خدا کی عظمت ہے اور اسی کی عظمت کی ترجمانی کر رہی ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اسی کے لیے ہے ساری بڑائی آسمانوں اور زمین
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (الجاثیہ: ۳۷)	میں، اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان میں خدا کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِىْ وَالْعَظْمَةُ اِزَارِىْ	بڑائی میری چادر ہے، اور عظمت میرا تہمد،
فَمَنْ نَازَعَنِىْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهٗ	پس جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی مجھ سے
فِى النَّارِ[1]	چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو جہنم میں
	پھینک دوں گا۔

یہاں ہمیں دو باتوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ پہلی بات یہ کہ کائنات کی ایک حد ہے اور اس کی وسعت کی ایک انتہا ہے لیکن خدا کی ہر صفت بے پایاں اور غیر محدود ہے۔ اس لیے خدا کی خصوصیات اور صفات، کائنات میں اسی حد تک نمایاں ہیں جس حد تک اس کی وسعت اور صلاحیت ہے۔ ہر تخلیق اپنے ظرف کے لحاظ سے خالق کی خصوصیات کو جذب کر سکتی ہے، اس سے زیادہ کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ محدود کائنات خدا کی غیر محدود قوتوں کی پوری طرح حامل نہیں ہے۔ اس میں خدا کی قوت اور قدرت ایک محدود پیمانہ پر ظاہر ہوئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم خدا کی کسی صفت کی آخری حد کو پالیں اور اس کی وسعتوں کو سمجھ لیں۔ کیونکہ صفات کا وجود ہمارے لیے اضافی ہے۔ ایک صفت کی مدد سے ہم دوسری صفت کو سمجھتے ہیں۔ موم کی نرمی سے ہمیں پتھر کی سختی کا تصور حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح پتھر لوہے اور لکڑی تینوں میں سختی ہے، لیکن ان تینوں کی سختی میں فرق ہم اضافت کے ذریعہ کرتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی اضافت خدا کی صفات کا مکمل تصور ہمیں نہیں دے سکتی۔ کائنات میں خدا کی جو خصوصیات نمایاں ہیں ان کے ذریعہ ہم خدا کی حقیقی خصوصیات کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔

---

[1] مشکوٰۃ، باب الغضب والکبر بحوالہ مسلم۔

ایسا کوئی عددی ضابطہ نہیں ہے جو ہمیں بتا سکے کہ خدا اپنی مخلوق سے اس درجہ بلند ہے اور اس کی امتیازی حیثیت یہاں ختم ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے وجود اس کائنات کا بھی ہے اور خدا بھی وجود رکھتا ہے لیکن کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَهٗ۔ قصص: ۸۸ (کائنات کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور خدا کی ہستی ہمیشہ باقی رہے گی) انسان اور جن قدرت اور طاقت رکھتے ہیں لیکن یہ ایسی طاقت ہے جسے کمزوری اور بے لبسی نے گھیر رکھا ہے۔

یَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ	اے گروہ جن وانس اگر تم زمین و آسمان کے
اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ	کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ
وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ	جاؤ، لیکن تم خدا کے حکم کے بغیر کہیں بھاگ
اِلَّا بِسُلْطٰنٍ۔ (الرحمٰن: ۳۳)	نہیں سکتے۔

اس کے برعکس خدا بھی قوی اور صاحب اقتدار ہے۔ لیکن اس کا اقتدار عجز اور کمزوری سے ناآشنا ہے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ	اللہ ایسا نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین
فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ	میں کوئی بھی چیز اس کو عاجز کردے۔
(فاطر: ۴۴)	

یہاں ہر کام کے لیے انسان کو محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، اور جتنی اس کی محنت ہوتی ہے اتنا ہی اس کو ملتا بھی ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی) لیکن خدا کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔

اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ	جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو
يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (یٰس: ۸۲)	حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے

انسان علم اور آگہی کا دعویٰ رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم سے زیادہ جہل اس کے حصے میں آیا ہے اور وہ اپنی نادانی کی وجہ سے بڑے سے بڑے ظلم اور زیادتی کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝	اس میں شک نہیں کہ انسان بڑا ہی ظالم اور
(الاحزاب: ۷۲)	نادان واقع ہوا ہے

لیکن خدا کے علم سے زمین اور آسمان کی ذرہ برابر کوئی چیز غائب نہیں ہوتی۔

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَا اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

تمہارے رب سے ذرہ برابر کوئی چیز غائب نہیں ہے، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور ہر چیز خواہ وہ ذرہ سے بھی چھوٹی ہو یا بڑی ایک کھلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس ذریعہ سے ہم صفات کا احساس کرتے ہیں اس سے خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتے، ہم وہ الفاظ نہیں رکھتے جن سے خدا کی خدائی کی حد بندی کی جا سکے۔ کائنات کی بڑی سے بڑی قوت اور طاقت کے ذریعہ خدا کی قوت اور اقتدار کا اندازہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی اضافت اس فرق کو بیان نہیں کر سکتی جو خدا اور اس کی پیدا کی ہوئی کسی بھی چیز کے درمیان موجود ہے۔ جو لوگ خدا اور مخلوق کے اس فرق کو مٹاتے ہیں وہ قرآن کے نزدیک شرک کا ارتکاب کرتے ہیں وہ ایک محدود حقیقت کو ایک غیر محدود حقیقت کے درجے میں رکھ رہے ہیں۔ آج وہ اپنے اس جرم کو محسوس کریں یا نہ کریں لیکن کل وہ خدا کے سامنے اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے۔

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ○ (الشعراء: ۹۷ تا ۹۹)

قسم خدا کی ہم کھلی گمراہی میں تھے جب کہ ہم (اے معبودانِ باطل) تم کو اس خدا کے برابر کر رہے تھے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے ہم کو تو ان مجرموں نے راہِ راست سے بھٹکایا ہے۔

قرآن نے انسان کو خدا کی صفات کا تصور، ان صفات کے ذریعہ دیا ہے جن سے وہ واقف ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر وہ خدا کی صفات کو سمجھ نہیں سکتا لیکن ساتھ ہی اس نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ محض تقریب فہم کے لیے ہے یہ ایک تمثیل ہے جس سے حقیقت کو ذہن کے قریب کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:-

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ○ (القمر: ۵۰)

ہمارا کام تو بس ایک اشارہ ہوتا ہے جیسے کوئی پلک جھپکے۔

قیامت ایک بہت بڑا واقعہ ہے جو اس کائنات میں پیش آنے والا ہے۔ یہ واقعہ خدا کی قدرت سے

کس طرح پیش آئے گا اس کو ظاہر کرنے کے لیے یہی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ۔ (النحل: ۷۷)

قیامت تو اس طرح واقع ہوگی جیسے کوئی پلک جھپکے یا اس سے بھی بہت پہلے۔

انتہائی قدرت اور طاقت کے اظہار کے لیے انسان جس تعبیر سے آشنا ہے خدا کے حق میں اس تعبیر کے استعمال کے بعد بتا دیا گیا کہ یہ بھی محض ایک تمثیل ہے۔ خدا کی قدرت اور اس کے اقتدار کو انسان جن الفاظ میں بیان کر سکتا ہے حقیقت اس سے بہت آگے ہے، انسان کبھی اسے پا نہیں سکتا۔

خیر و شر کی حقیقت

کائنات میں حسن و قبح دونوں نمایاں ہیں۔ اچھائی اور برائی ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ عدل کے ساتھ ظلم ہے، سچائی کے ساتھ جھوٹ ہے اور نیکی کے ساتھ بدی پائی جاتی ہے۔ لیکن خدا کمال سے متصف ہے۔ اس کی طرف کسی قسم کے نقص کا انتساب صحیح نہیں ہے۔ اس کو صرف اسماء حسنیٰ سے یاد کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا کوئی برا نام نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

تم اس کو اللہ کہو یا رحمٰن جس نام سے بھی تم پکارو سارے اسماء حسنیٰ اسی کے لیے ہیں۔

خدا کو ہم اس کی کسی مخلوق پر قیاس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مخلوق اپنے اندر کمال کے ساتھ نقص بھی لیے ہوئے ہے اور خدا ان تمام نقائص سے پاک ہے جو کسی بھی مخلوق میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ایک اونچی مثال چاہیے جو کائنات میں کہیں نہیں ہے۔ کوئی عظمت اس کی عظمت کو بیان نہیں کر سکتی، کسی رفعت اور بلندی سے اس کی بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (الروم: ۲۷)

اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی مثال ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:-

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (النحل: ۶۰)

اور اللہ ہی کے لیے ہے اونچی مثال اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

کائنات میں جو خیر و خوبی ہے اور جو حسن و جمال ہے وہ خالقِ کائنات کے خیر و خوبی اور حسن و جمال پر دلالت کرتا ہے، لیکن یہاں جو نقص ہے ہم اس کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ آپ کے اندر جو پاکیزہ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا بھی یہ اوصاف رکھتا ہے۔ لیکن اگر آپ کے اندر برے اوصاف پائے جاتے ہیں تو یہ آپ کی ذات تک محدود ہیں، خدا ان سے پاک ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:-

ان اللّٰہ سبحانہ لا یجوز ان یدخل ھو و غیرہ تحت قیاس الشمول الذی تستوی افرادہ ولا تحت قیاس التمثیل الذی یستوی فیہ حکم الاصل والفرع فان اللّٰہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیٔ لا فی نفسہ المذکورۃ باسمائہ ولا فی صفاتہ ولا فی افعالہ ولکن یسلک فی شانہ قیاس الاولیٰ کما قال اللّٰہ تعالیٰ وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فانہ من المعلوم ان کل کمال و نعت ممدوح لنفسہ لا نقص فیہ یکون لبعض الموجودات المخلوقۃ المحدثۃ فالرب الخالق الصمد القیوم القدیم الواجب الوجود بنفسہ ھو اولیٰ بہ وکل نقص وعیب یجب ان ینزہ عنہ بعض المخلوقات المحدثۃ الممکنۃ فالرب الخالق القدوس

خدائے تعالیٰ اور کسی دوسری چیز کو قیاس شمول" کے تحت لانا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قیاس میں افراد مساوی ہوتے ہیں اور نہ خدا کو "قیاس تمثیل" کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے جس میں کہ فرع اور اصل کا حکم ایک ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی چیز اس کی مانند نہیں ہے، نہ تو اس کی ذات میں جس کا ذکر اس کے اسماء کے ذریعہ ہوا ہے اور نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال میں۔ اس طرح کے قیاسات سے ہٹ کر خدا کے بارے میں قیاسِ اولیٰ سے کام لیا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اللہ کے لیے سب سے اونچی مثال ہے۔ کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ ہر کمال یا اچھی صفت جس میں کوئی نقص نہ ہو اگر کسی چیز میں پایا جاتا ہے جو کہ حادث اور مخلوق ہے تو خدائے تعالیٰ جو خالق و بے نیاز ہے، کائنات جس کی ذات سے قائم ہے اور جو قدیم اور واجب ہے، بدرجۂ اولیٰ وہ کمال اس میں موجود ہوگا اور

السلام القديم الواجب وجوده بنفسه هو اولیٰ بان ينزه عنه[1]

ہر نقص اور ہر عیب جس سے کہ کسی بھی مخلوق کو پاک ہونا چاہیے جو کہ حادث وممکن ہے، بدرجۂ اولیٰ خدا اس سے پاک ہے، کیونکہ وہ خالق، بے عیب، سلامتی والا اور قدیم اور واجب الوجود ہے

خدا کی صفات کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جن صفات میں صرف مدح اور خیر کا پہلو نکلتا ہے قرآن خدا کے لیے مطلقاً ان کا استعمال کرتا ہے لیکن جن صفات میں خیر و شر دونوں پہلو موجود ہیں خدا کے حق میں وہ ان ہی پہلوؤں کا استعمال کرتا ہے جن سے خیر کا اظہار ہوتا ہے۔

الاسماء الحسنیٰ المعروفة هي التي يدعى الله بها وهي التي جاءت في الكتاب والسنة وهي التي تقضي المدح والثناء بنفسها والعلم والقدرة والرحمة ونحو ذلك هي في نفسها صفات مدح والاسماء الدالة عليها اسماء مدح واما الكلام والارادة فلما كان جنسه ينقسم الى محمود كالصدق والعدل والى مذموم كالظلم والكذب والله تعالیٰ لا يوصف إلّا بالمحمود دون المذموم جاء ما يوصف به من الكلام والارادة في اسماء تخص المحمود كاسمه الحكيم

معروف اسماء حسنیٰ وہی ہیں جن سے کہ اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جاتا ہے جن کا ذکر کتاب و سنت میں ہے یہ وہ اسماء ہیں جو فی نفسہ مدح ثنا کا تقاضا کرتے ہیں۔ علم، قدرت اور رحمت وغیرہ بذات خود تعریف کی صفات ہیں اور جو اسماء ان صفات پر دلالت کرتے ہیں وہ اسماء مدح ہیں۔ اس کے برعکس کلام اور ارادہ یہ پسندیدہ وناپسندیدہ دونوں ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سچائی اور انصاف یا ظلم اور جھوٹ۔ اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفات ہی سے متصف کیا جا سکتا ہے اس لیے قرآن وحدیث میں جب بھی کلام اور ارادہ کو خدا کے حق میں استعمال کیا گیا ہے تو ایسے اسماء کی شکل ہی میں استعمال کیا گیا ہے

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص ۴۳-۴۴۔

والرحیم والصادق والمومن والشهید والرؤف والحلیم والفتاح ونحو ذلک مما یتضمن معنی الکلام والارادۃ[1]

جن میں مدح کا پہلو پایا جاتا ہے جیسے، حکیم رحیم، صادق، مومن، شہید، رؤف، حلیم فتاح وغیرہ۔ یہ وہ اسماء ہیں جن میں کلام اور ارادہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اس دنیا میں موت بھی ہے اور زندگی بھی، صحت بھی ہے اور بیماری بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ آپ جن مصیبتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوجاتے ہیں وہ آپ کے کسی نہ کسی نقص کا نتیجہ ہیں اور اگر آپ کو خوشی اور راحت نصیب ہوتی ہے تو یہ خدا کا فضل ہے۔ اس کی نعمت اور احسان ہے جو آپ کو ملا ہے۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ (النساء: ۷۹)

جو بھی بھلائی تمہیں ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے اور جو برائی تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہاری ذات کی طرف سے پہنچتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ (الشعراء: ۸۰)

اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا وہ دیتا ہے۔

خدا کو بلند و برتر تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے تمام نقائص سے پاک مانا جائے، اس کے بغیر خدا کے بارے میں بلندی کا تصور مکمل نہیں ہوتا، خدا کا ہر نقص سے پاک ہونا اور اس کے اندر تمام صفات کمال کا موجود ہونا لازم و ملزوم ہے۔ قرآن میں حکم ہے:۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى (الاعلیٰ: ۱) پاکی بیان کرو اپنے رب کی جو سب سے بلند ہے۔

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی تسبیح کی جائے۔ دوسرے یہ کہ خدا سب سے بلند و برتر ہے۔ جو شخص اپنی زبان سے سبحان اللہ کہے اس کے اندر یہ احساس ابھرنا چاہیے کہ خدا ہر نقص سے پاک ہے، لغزش اور کوتاہی اس سے نہیں ہوسکتی اس کا ہر عمل خیر ہی خیر ہے اور اس میں کسی غلطی

---

[1] شرح العقیدہ الاصفہانیہ ص۴۲

اور خامی کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ جس کے اندر یہ احساس ابھرے گا وہ خود بخود پکار اٹھے گا کہ خدا سب سے بلند ہے عظمت اور رفعت اسی کے لیے ہے۔ اس کے بارے میں نقص اور پستی کا تصور بھی صحیح نہیں ہے۔

خدا نقائص سے کیوں پاک ہے؟

ہم اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ کائنات میں خدا کی صفات اور خصوصیات منتقل ہوئی ہیں۔ اس لیے آپ کہیں گے کہ کائنات میں جو عیوب اور نقائص ہیں ان کو بھی خدا ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ ہم خدا کو صرف خیر کا سرچشمہ مانیں اور برائیوں سے یکسر اسے پاک قرار دیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات محدود ہے اس لیے ایک خاص حد ہی کے اندر خدا کی صفات کا اس میں ظہور ہوا ہے۔ یہاں کسی بھی چیز کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں وہ محدود ہیں۔ حد سے زیادہ اور غیر محدود کوئی قوت اسے نہیں ملی ہے، یہی محدودیت اس کے نقص کا سبب ہے۔ خدا کی ذات چونکہ محدودیت سے ناآشنا ہے اس لیے وہ نقص سے پاک ہے۔ پانی تالاب اور گڑھے میں گدلا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی پانی دریا اور سمندر میں گدلا نہیں ہوتا اور صاف و شفاف رہتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے۔ خدا صاحبِ علم ہے۔ انسان کو اس کے علم کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ وہ کچھ چیزوں کو جانتا ہے تو بہت سی چیزوں کو نہیں جانتا۔ لیکن انسان کے اس جہل کی وجہ خدا کے علم کا نقص نہیں ہے بلکہ خود انسان کا نقص ہے۔ وہ اپنی صلاحیت اور قوت استعداد کے لحاظ سے علم کے ایک حصہ ہی کا حامل ہو سکتا ہے۔ اسی مثال پر آپ پوری کائنات کو قیاس کر سکتے ہیں یہاں کی ہر چیز میں خیر ہے لیکن یہ خیر خاص دائرے میں ہے۔ اس دائرے سے باہر وہ ختم ہو جاتا ہے۔ کسی ڈبے سے اتنی ہی بجلی پیدا ہو سکتی ہے جتنی اس میں طاقت ہے۔ اس سے زیادہ بجلی وہ پیدا نہیں کر سکتا۔ گویا کائنات کی اصل حالت، خیر کی حالت ہے شر ایک سلبی صفت ہے۔ جو خیر کے نہ ہونے کا نام ہے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ شر کا سبب اگر محدودیت ہے تو محدودیت بھی خدا ہی کی پیدا کردہ ہے۔ کائنات کی حدیں توڑ دی جاتیں اور وہ لامحدود ہوتی تو شر سے خالی ہوتی اس لیے خدا کی طرف شر نہ بھی منسوب کیا جائے تو کیا اس پر محدودیت کے پیدا کرنے کا الزام نہیں آتا؟

یہ سوال ختم ہو جاتا ہے اگر آپ اس پر اس پہلو سے غور کریں کہ کائنات میں بلاشبہ محدودیت ہے

لیکن اس محدودیت کے پیچھے خدا کی زبردست حکمت اور مصلحت کام کر رہی ہے۔ یہ حکمت بے پایاں اور لامحدود ہے، جس کو کوئی بھی شخص پوری طرح پا نہیں سکتا۔ کائنات کی محدودیت کو خدا کی لامحدود حکمت کے ساتھ اگر ملا دیا جائے تو یہ محدودیت ختم ہو جائے گی اور وہ ایک لامحدود حقیقت میں تبدیل ہو جائیگی۔ کائنات کی محدودیت میں نقص اس لیے نظر آ رہا ہے کہ خود ہماری نگاہ محدود ہے اور ہمارے سامنے خدا کی وسیع تر حکمتیں نہیں ہیں۔ اگر ان حکمتوں کی روشنی میں ہم کائنات کا مطالعہ کر سکیں تو وہ سراسر خیر معلوم ہوگی۔

قرآن میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ خدا کی ہر صفت بے پایاں ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ غیر محدود ہے، لیکن کائنات جس شکل میں اس وقت موجود ہے اس کو اسی شکل میں باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خدا اپنے نہ ختم ہونے والے خزانوں سے ہر چیز کو ایک خاص مقدار میں نازل کرے۔ ورنہ کائنات کا موجودہ نقشہ بدل جائے گا نقشہ ہی نہیں بدلے گا بلکہ اس کے ساتھ وہ مقصد بھی ختم ہو جائے گا جس کے لیے یہ کائنات بنی ہے، کیونکہ اس مقصد سے یہی نقشہ مناسبت رکھتا ہے۔ کوئی دوسرا نقشہ اس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ	کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے
وَمَا نُنَزِّلُہٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ	ہمارے پاس نہ ہوں۔ لیکن ہم اس کو
(الحجر : ۲۱)	ایک خاص مقدار میں اتارتے ہیں

خدا "خلاق" ہے۔ اس کی قوتِ تخلیق کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن یہ کائنات ایک خاص حد ہی کے اندر تخلیق کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ ورنہ نظمِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی لیے خدا کی صفت تخلیق کا ظہور ایک محدود پیمانے پر ہوا ہے اور کوئی بھی مخلوق یہاں حد سے بڑھی ہوئی نہیں ہے۔

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰہُ بِقَدَرٍ	ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے مطابق
(القمر : ۴۹)	پیدا کیا ہے۔

مال و دولت کو دنیا خیر سمجھتی ہے۔ خدا کے پاس اس کی کوئی کمی نہیں ہے وہ اگر چاہے تو ہر شخص کو شہنشاہِ وقت بنا سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ کم ظرف انسان کے اندر

تکبر اور گھمنڈ کی ہوا بھر جائے گی اور فتنہ و فساد پھوٹ پڑے گا۔ خدا کائنات کو اس سے بچانا چاہتا ہے اس لیے اس نے یہاں امارت و افلاس میں ایک خاص تناسب رکھا ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۝	اور اگر اللہ تعالیٰ رزق کو پھیلا دے تو وہ زمین میں بغاوت کر بیٹھیں گے اس لیے اللہ ایک اندازے کے مطابق جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔
(الشوریٰ: ۲۷)	یقیناً وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے اور ان کو دیکھتا ہے۔

ایک قوم اگر بلندی پر پہنچ رہی ہے تو آپ کے نزدیک وہ خیر کو پا رہی ہے۔ دوسری قوم پستی میں چلی جاتی ہے تو آپ کہیں گے کہ شر اس کے حصے میں آیا ہے لیکن جس خدا کے ہاتھ میں عروج و زوال اور عزت و ذلت کا فیصلہ ہے، وہ کبھی شر سے آلودہ نہیں ہوتا۔ اس سے خیر ہی کا صدور ہوتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝	تم کہو اے اللہ! سلطنت کے مالک تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ ساری بھلائی تیرے
(آل عمران: ۲۶)	ہاتھ میں ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔

بہت سے اعمال جنہیں ہماری محدود نگاہ غلط سمجھتی ہے وہ اپنے وسیع تر تقاضوں کے تحت صحیح ہوتے ہیں بلکہ بظاہر وہ جس قدر ناروا اور غیر مستحسن معلوم ہوتے ہیں واقعہ کے لحاظ سے وہ اسی قدر ضروری اور پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ فرد اگر قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ جرم ہے لیکن یہی جرم قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے جب کہ اس کا نفاذ کرسی عدالت سے ہوتا ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ فرد کی نگاہ محدود ہے وہ صرف اپنے مفاد کو دیکھتا ہے۔ لیکن عدالت کی نظر وسیع ہوتی ہے اس کے سامنے پورے سماج کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کے بہت سے اعمال جو ہماری کم نگاہی سے غلط یا خلافِ مصلحت ہوتے ہیں اس کی وسیع تر مصلحتیں ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر

وہ کسی ایک فرد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو ہلاک کر دے تو بھی سزاوار حمد ہوگا۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (الانعام: ۴۵)	پس جن لوگوں نے ظلم کیا ان کی جڑ کاٹ دی گئی اور (ہر طرف سے) کہا گیا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام عالموں کا رب ہے۔

وہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے حق و صداقت اور عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ (حم سجدہ: ۴۶)	اور تیرا رب بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

اس پہلو سے آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ خیر و شر ہماری نسبت سے ہے خدا کی نسبت سے خیر ہی خیر ہے اس کے کاموں میں شر کسی بھی پہلو سے داخل نہیں ہوتا۔

لَهُ الْحَمْدُ فِى الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (القصص: ۷۰)	اسی کے لیے ہے حمد ابتداء میں بھی اور انتہا میں بھی، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ حقیقت اور زیادہ واضح الفاظ میں موجود ہے۔ رات کی تنہائیوں میں آپ جو دعائیں کرتے تھے ان میں سے ایک دعا کے بعض الفاظ یہ ہیں:۔

وَالْخَيْرُ كُلُّهٗ فِىْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ اِلَيْكَ اَنَابِكَ وَاِلَيْكَ تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ[1]	اور بھلائی ساری کی ساری تیرے ہاتھ میں ہے اور برائی تو تیری طرف جاتی ہی نہیں، میرا وجود تجھ سے ہے اور تیری ہی طرف مجھے جانا ہے تو بابرکت اور بلندی و عظمت والا ہے۔

جو بھی شخص اشیاء کے نقص اور محدودیت پر غور کرے گا وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ خدایا تو ہر عیب سے پاک ہے، ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ شر ہماری ذات میں ہے اور تو سرچشمہ خیر ہے۔ تجھ سے محض خیر ہی وجود میں آسکتا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ۔ باب صلوٰۃ النبیؐ و دعائہ باللیل۔

فصل سوم

خدا ایک ہے[1]

قرآن کا دعویٰ ہے کہ "اس کائنات کا صرف ایک خدا ہے اور خدائی کے تمام اوصاف اسی کی ذات میں مرکوز ہیں۔" قرآن کے نظامِ فکر میں اس دعویٰ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس کی ساری تعلیمات اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر کوئی شخص خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو ایک نہیں مانتا تو قرآن کے نزدیک اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا برابر ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا کے انکار کے بعد کائنات ہمارے لیے ایک معمہ بن جاتی ہے، اسی طرح بہت سے خداؤں کو ماننے سے بھی کائنات کے بارے میں پیدا ہونے والے مسائل کا کوئی صحیح حل نہیں ملتا۔ اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنا جس قدر لغو اور مہمل ہے، قرآن کے نزدیک اسی قدر یہ بات بھی لغو اور مہمل ہے کہ اس کے کئی خدا مانے جائیں۔ کائنات کے بارے میں ابھرنے والا ہر سوال عقل کی روشنی میں حل ہو جاتا ہے جب ہم خدا کو ایک مانتے ہیں، اور ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے کے بعد ہماری کوئی منطق کائنات کے کسی بھی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی۔

پہلے آپ قرآن کے دعوے کو اسی کی زبان میں سنیے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (سورۂ اخلاص)	کہو، کہ اللہ ایک ہے۔
اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	اللہ ایک ہے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔
(البقرۃ: ۲۵۵)	وہ زندہ ہے اور کائنات کو تھامے ہوئے ہے

---

[1] توحید خدا کی ایک صفت ہے اس لیے صفات ہی کے ذیل میں اس پر گفتگو ہونی چاہیے تھی۔ لیکن قرآن نے اسے چونکہ بنیادی اہمیت دی ہے اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس پر مستقل بحث کی جائے۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ؀ (البقرہ: ۱۶۳)

اور تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہ بڑا مہربان اور رحیم ہے:

هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الزمر:)

وہ اللہ جو اکیلا ہے اور جو سب پر غلبہ رکھتا ہے۔

قرآن کا یہ دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ دلیل بھی رکھتا ہے۔ خدا ہے تو اس کا ایک ہونا طے شدہ اور یقینی ہے۔ اس کے اثبات کے لیے سوائے اس کے اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ وہ موجود ہے۔ اس کا وجود خود اس بات کے ماننے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک ہے۔ کیونکہ کسی بھی وجود کا تصور آپ کم سے کم ایک کے عدد میں کر سکتے ہیں۔ ایک کے نیچے وجود کا درجہ ختم ہوجاتا ہے۔ اور عدم وجود کی سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ اس لیے خدا کو ایک مانے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ بہت سے خداؤں کو مانتے ہیں قرآن ان سے کہتا ہے کہ خدا کا ایک ہونا تمہارے اور ہمارے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ اب اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ اس ایک خدا کے ساتھ بہت سے خدا اور بھی ہیں تو ان کے حق میں کوئی آسمانی سند پیش کرو، یا کوئی علمی ثبوت فراہم کرو۔ آخر وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر تم نے بہت سے خدا مان رکھے ہیں؟

قُلْ اَرُوْنِیَ الَّذِیْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ؀ (السبا: ۲۷)

ان سے کہو جن کو تم نے خدا کے ساتھ اس کے شریکوں کی حیثیت سے ملا رکھا ہے (ذرا) انہیں مجھے بھی تو دکھاؤ (کہ وہ کہاں ہیں؟) ہرگز نہیں (خدا کا کوئی شریک نہیں ہے) بلکہ وہی (ایک) خدا ہے عزیز و حکیم ہے۔

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (النمل: ۶۴)

کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی ہے ان سے کہو تم اپنی دلیل تو پیش کرو۔ اگر تم واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو؟

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً

کیا انہوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود

قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ
(الانبیاء: ۲۴)

بھی بنا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل تو لاؤ۔

قرآن نے جو مثالی کردار ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ان میں سے ایک کردار وہ ہے جس کو اس نے "اصحاب کہف" کا نام دیا ہے۔ اصحاب کہف فرماتے ہیں:-

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ۭ لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍۢ بَيِّنٍ ۭ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝
(کہف: ۱۵)

یہ ہماری قوم جس نے خدا کے سوا دوسرے معبود گھڑ رکھے ہیں آخر وہ اس پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتی؟ اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کرے۔

اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝
(الانعام: ۱۹)

(ان سے پوچھو) کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کچھ اور بھی الٰہ ہیں۔ تم کہو کہ میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ ان سے کہو کہ وہ صرف اکیلا معبود ہے اور بے شک میں تمہارے شرک سے بری ہوں۔

مطلب یہ کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اور خدائی میں کسی دوسرے کے شریک ہونے کی تردید کرتا ہوں، لیکن اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے خدا ہیں تو بتاؤ اس کی دلیل کیا ہے؟ بغیر دلیل کے تمہارا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے اور میں جھوٹ میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔

کیا شرک کا کوئی امکان ہے؟

ایک سے زیادہ خداؤں کے ماننے کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خدا کو ایک ماننے سے کائنات کی تخلیق کا مسئلہ حل نہیں ہوتا یعنی کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے بہت سے خداؤں کی ضرورت ہے تو ماننا پڑے گا کہ واقعۃً خدا ایک نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نظم کائنات کئی خداؤں کا تقاضا کرتا ہے۔ مشاہدۂ کائنات اگر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے چلانے کے لیے ایک خدا کافی نہیں ہے تو ہمیں خداؤں کی اتنی تعداد ماننی چاہیے جتنی کہ نظم کائنات کے لیے ضروری ہے۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انسان کی نفسیات ایک خدا سے مطمئن نہیں ہیں۔ انسان کے باطن میں خدا کی طلب اور احتیاج موجود ہے۔ یہ باطنی طلب خدا کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔ ایک خدا سے اگر یہ طلب پوری نہیں ہوتی ہے تو انسان اس کو پورا کرنے کے لیے کئی خداؤں کے ماننے پر مجبور ہوگا۔

آیئے اب ہم تینوں وجہوں پر تفصیل سے غور کریں:

تخلیق کائنات میں شرک کا ثبوت نہیں ہے

یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ اس کا نہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی تاریخی ریکارڈ ہے جو اس کے وجود کے قطعی اسباب بیان کر سکے۔ بلکہ ایک واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے جس کے اسباب ہمیں معلوم کرنے ہیں۔ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ جو واقعہ اپنے ظہور کے لیے جن اسباب کا اور جتنے اسباب کا محتاج معلوم ہو، ان ہی اسباب کو اور اتنے ہی اسباب کو اس واقعہ کی علت قرار دیا جائے۔ جس واقعہ کو وجود میں آنے کے لیے صرف پانچ چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو، بے عقلی ہوگی اگر ہم دس چیزوں کو اس کے وجود کا سبب مانیں۔ فلسفہ اور سائنس دونوں کے نزدیک یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ کم سے کم مفروضات سے جس واقعہ کی توجیہ ممکن ہے اس کے لیے زیادہ مفروضات قائم کرنا لغو اور مہمل ہے۔ ایک مثال لیجیے۔ آپ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں وہاں آپ کو ایک میز اور کرسی رکھی ہوئی نظر آتی ہے آپ کے ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ میز اور کرسی یہاں کیسے پہنچ گئیں؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے آپ فرض کرتے ہیں کہ کسی انسان نے میز اور کرسی کو یہاں رکھا ہوگا اس سے آپ کا سوال حل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان صاحب شعور ہے اور اس کے ایک فرد میں اتنی قوت بھی ہے کہ وہ یہ عمل انجام دے سکے۔ جب ایک انسان کو تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال حل ہو جاتا ہے تو اس کے لیے دس انسانوں کا فرض کرنا بے معنی ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس آپ کسی قلعہ کے بارے میں سوچ نہیں سکتے کہ اس کو کسی ایک فرد نے تعمیر کیا ہوگا، کیونکہ یہ اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے آپ کو اس کی تعمیر میں بہت سے افراد کو شریک ماننا پڑے گا۔

اس اصول کو سامنے رکھیے اور پھر اس سوال پر غور کیجیے کہ کائنات کو بہت سی ہستیوں نے پیدا کیا ہے یا اس کا صرف ایک خالق ہے؟ اگر ہم کائنات کی تخلیق میں بہت سی ہستیوں کو شریک مانتے ہیں تو اس کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ ہر تخلیق میں ان سب کی شرکت ہو۔ بالفاظ دیگر

تخلیق کو کسی ایک ذات کا انفرادی عمل نہ قرار دیا جائے بلکہ ایک مخصوص جماعت کا مشترکہ عمل سمجھا جائے۔ ذرّے سے لے کر آفتاب تک جس چھوٹی بڑی چیز کے خالق کا بھی آپ تصور کریں تو اسے ایک فرد کی حیثیت میں نہ کریں بلکہ ایک گروپ کی شکل میں کریں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز کا اور بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا ایک خالق ماننے میں کیا دشواری ہے کہ ہم اسے بہت سی ہستیوں کی تخلیق قرار دیں۔ اس کا جواب غالباً یہ دیا جائے گا کہ تخلیق کائنات کے لیے جس بے پایاں قدرت کی ضرورت ہے وہ ایک جماعت میں تو پائی جاسکتی ہے لیکن کسی ایک فرد میں اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شخص پہاڑ توڑ نہیں سکتا لیکن اشخاص کے ایک گروہ کے لیے یہ ناممکن نہیں ہے۔

اس جواب میں ایک بہت بڑی منطقی خامی ہے۔ جسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ ہمارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ پہاڑ کو ایک فرد توڑ نہیں سکتا اور ایک جماعت توڑ سکتی ہے۔ کیونکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد میں اس کام کی طاقت نہیں ہے اور جماعت میں اس کی طاقت ہے۔ اگر جماعت کی اس قوت کا ہمیں پیشگی علم نہ ہوتا تو یقیناً ہم اس دعویٰ کی پوزیشن میں کبھی نہ ہوتے۔ لیکن کیا کوئی شخص کائنات کے "پیدا کرنے والوں" کے بارے میں بھی اس طرح کا علم رکھتا ہے؟ کیا وہ یقین کے ساتھ بتا سکتا ہے کہ ان میں کے ایک فرد کی حد وسع میں کونسی چیز ہے اور کونسا کام اس کی طاقت سے باہر ہے۔

پھر یہ کہ جو کام فرد کے امکان میں نہ ہو، ضروری نہیں کہ جماعت کے حق میں لازماً اس کا امکان پیدا ہو جائے۔ چنانچہ جس طرح ہم ایک انسان سے اس کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ کسی تن مردہ میں روح پھونک کر اسے از سر نو زندگی عطا کر دے گا اسی طرح ایک جماعت سے بھی اس کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں فرد اور جماعت دونوں بے بس ہیں۔ اس لیے اگر کوئی ایک ہستی کائنات کی تخلیق سے قاصر ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوجاتا کہ بہت سی ہستیاں مل جل کر یہ کام انجام دے سکتی ہیں، جہاں تک قیاس عقلی کا تعلق ہے، اس کے نزدیک ایک فرد کا خالق کائنات ہونا ناممکن نہیں ہے، جیسے ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ تخلیق کی قوت دس ہاتھوں میں ہوگی، ٹھیک اسی طرح یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ یہ قوت صرف ایک ہاتھ میں ہوگی۔ جب دونوں پہلوؤں کا یکساں امکان ہے تو فطری بات ہے کہ اس قوت کو پہلے ہمیں ایک ہی ہستی میں مرتکز ماننا چاہیے۔ ہاں اگر اس میں کوئی رکاوٹ ہو تو ہم اسے ایک سے زیادہ ہستیوں میں تسلیم کر سکتے ہیں۔ قرآن کا یہی مطالبہ ہے کہ تم خدا کو ایک مانو اور پھر دیکھو کہ

کائنات کی کس کس چیز کے پیدا کرنے سے وہ عاجز ہے ؟ اگر خدائے واحد کے تصور سے کائنات کی تخلیق کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سے خداؤں کو شریک کرنا عقل و بصیرت کی محرومی کی دلیل ہے ۔ چنانچہ بار بار وہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کائنات کی وہ کونسی ضرورت ہے جس کے لیے تم ایک خدا کے بجائے بہت سے خداؤں کو مان رہے ہو؟ خدائے واحد پر ایمان کے بعد وہ کونسی گتھیاں ہیں جو حل ہونے سے رہ جاتی ہیں کہ جن کے حل کے لیے تم مزید خداؤں کو اپنے ذہن و فکر پر مسلط کر رہے ہو؟ خدائے واحد تخلیق کا کونسا کام انجام نہیں دے سکتا کہ خداؤں کی ایک جماعت کا ماننا تمہارے لیے ضروری ہو گیا ہے ؟ آسمان و زمین ، چاند ، سورج اور دوسرے بے شمار سیارے ان میں سے کون اس بات کا محتاج ہے کہ تنہا خدا کو اس کا خالق نہ مانا جائے اور مزید خداؤں کو اس کے ساتھ شامل کیا جائے ؟ اگر خدائے واحد ہر چیز پیدا کر سکتا ہے تو دعویٰ شرک کی اس کائنات میں عقلاً کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

شرک کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم وصفِ تخلیق میں شرکت کو تسلیم کریں اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیق کسی ایک ذات کی صفت خاص نہیں ہے بلکہ یہ صفت بہت سی ہستیوں میں پائی جاتی ہے ۔ اور ان میں سے ہر ایک نے الگ الگ اس صفت کا مظاہرہ کیا ہے ۔ کسی نے ایک چیز کو پیدا کیا تو کسی نے دوسری چیز کو زمین کا خالق ایک ہے تو آسمان کا دوسرا ۔ جو خالق پانی کا ہے وہ آگ کا خالق نہیں ہے ۔ جو پہاڑوں کا پیدا کرنے والا ہے ، ہواؤں کا پیدا کرنے والا اس سے جدا ہے ۔ غرض مختلف پیدا کرنے والوں نے مختلف چیزیں پیدا کیں جن سے ”مجموعۂ کائنات“ تیار ہو گیا ۔ لیکن یہ دعویٰ اسی وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے پاس اس کا کوئی واقعاتی ثبوت موجود ہو ۔ اس کے بغیر دعوی شرک کی اس کائنات میں کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ واقعاتی ثبوت کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے ، ایک یہ کہ اس کائنات کے جتنے خالق تجویز کیے جائیں ان کے بارے میں پورے تعین اور مضبوط دلائل کے ساتھ بتایا جائے کہ ان میں سے کس نے کائنات کی کونسی چیز پیدا کی ہے اور تخلیق میں اس کا کیا حصہ ہے ؟ اور یہ کہ دوسرے خالق اس کو کیوں نہیں پیدا کر سکتے ؟ دوسری بات یہ کہ ان کے پیدا کرنے والوں میں سے ہر ایک کی تخلیقی انفرادیت ثابت کی جائے ۔ ایک خالق کی تخلیق جس مادہ اور جن بنیادی اجزاء سے وجود میں آئی ہے

دوسرے خالق کی تخلیق کے مواد اور حقیقی اجزاء کو اس سے اس حد تک مختلف ہونا چاہیے کہ ہم دونوں کی قوت تخلیق کا الگ الگ تصوّر کر سکیں۔ اگر کسی میں تخلیقی انفرادیت نہیں ہے تو اس کو خالق ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لیکن نہ تو ہم دلائل کے ساتھ اس دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں کہ کائنات میں مختلف خالقوں کی تخلیقی قوت کا مظاہرہ ہوا ہے اور نہ اس بات کی ہمارے پاس کوئی دلیل ہے کہ اشیاء کائنات اپنے مادہ اور بنیادی اجزاء کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ آج یہ حقیقت علمی دنیا میں ثابت ہو چکی ہے کہ پوری کائنات کی تخلیق ایک ہی مادہ سے ہوئی ہے اور اس کے بنیادی اجزاء میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن ہم سے کہتا ہے کہ جب شرک کا کوئی واقعاتی ثبوت نہیں ہے تو دعویٰ شرک کس بنیاد پر کرتے ہو؟

قُلْ اَرَاَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَہُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِکِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ ھٰذَا اَوْ اَثٰرَۃٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

(الاحقاف: ۴)

اے پیغمبر ان سے پوچھو کیا تم نے ان چیزوں (کی حقیقت) پر غور بھی کیا ہے جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو؟ بتاؤ کہ انہوں نے زمین کی کونسی چیز پیدا کی؟ یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصّہ ہے؟ تمہارے پاس اس سے پہلے کوئی کتاب یا علم و بصیرت کی کوئی نشانی ہے تو اس کو پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ شُرَکَآءَکُمُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؕ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَہُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ج اَمْ اٰتَیْنٰہُمْ کِتٰبًا فَہُمْ عَلٰی بَیِّنَتٍ مِّنْہُ بَلْ اِنْ یَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُہُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ○ (فاطر: ۴۰)

اے پیغمبر! ان سے پوچھو کیا تم نے اپنے شرکاء کے بارے میں غور کیا جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے بتاؤ کہ انہوں نے زمین میں کونسی چیز پیدا کی یا کیا ان کا آسمانوں میں کوئی حصّہ ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ اس سے ان کو اپنے خیال پر کوئی دلیل مل گئی ہے؟ بلکہ واقعہ

یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے سے جو وعدہ کرتے ہیں وہ محض دھوکا ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ۝ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝

(لقمٰن : ۱۰-۱۱)

اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر کسی ستون کے جس کو تم دیکھ رہے ہو، اور زمین میں اس نے بھاری پہاڑ گاڑ دیئے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا اور زمین میں ہر قسم کی عمدہ چیزیں پیدا کیں۔ یہ خدا کی تخلیق ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ خدا کے سوا (جو معبود تم نے بنا رکھے ہیں) انھوں نے کیا پیدا کیا ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ظالم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

ان آیات میں اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ کائنات کے بہت سے خالق ہیں، کیونکہ وہ ایک زبردست وحدت ہے۔ اگر کائنات ازخود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کو کسی نے پیدا کیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک ہے۔ قرآن کے اس دعویٰ کو اب تک کی علمی تائید حاصل ہے۔ انسان مدت دراز سے کائنات کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہا ہے، تاکہ اس کے آغاز و انجام اور اس کے مقصد کو سمجھ سکے گو اس کے نتائج فکر مختلف رہے ہیں لیکن اس حقیقت کو ہر مفکر نے تسلیم کیا ہے کہ کائنات ایک وحدت ہے۔ اسے الگ الگ حصّوں میں ہم تقسیم نہیں کر سکتے۔ فلسفۂ قدیم وجدید دونوں کو اعتراف ہے کہ کائنات کے مختلف حصوں کے درمیان ناقابل شکست ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ اور ایک چیز سے دوسری چیز اس طرح ملی ہوئی ہے کہ کسی بھی مرحلہ میں وہ جدا نہیں ہوتی۔ اسی ربط و تسلسل کو ہم کبھی علت کہتے ہیں، کبھی سبب کہتے ہیں اور کبھی کسی دوسرے نام سے یاد کرتے ہیں یہی چیز ہمارے تمام استدلالات کی بنیاد ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی واقعہ سے کوئی

نتیجہ اخذ کرتے ہیں تو ہمیں یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اس واقعہ اور نتیجہ کے درمیان گہرا ربط و تلازم پایا جاتا ہے۔ اگر یہ یقین ختم ہو جائے تو ہم کسی بھی نتیجہ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ شرک حقیقت میں وحدت کائنات کی نفی ہے۔ وہ کائنات کو مختلف غیر مربوط حصوں میں تقسیم کرتا ہے اور ان میں سے ہر حصہ کو ایک مستقل خالق کی تخلیق قرار دیتا ہے۔ مثال کے طور پر فلسفۂ شرک میں بارش کا ایک الگ خالق ہے، وہ جب چاہتا ہے پانی برساتا ہے اور جب نہیں چاہتا پانی نہیں برستا۔ گویا بارش کا ہونا یا نہ ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جس کا کائنات کی کسی بھی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ بارش کا ہمارے نظام شمسی سے بہت ہی گہرا تعلق ہے اور نظام شمسی دوسرے سیاراتی نظاموں سے جڑا ہوا ہے۔ یہ بات سائنس کی دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے کہ کائنات میں پھیلا ہوا سیاراتی نظام انتہائی مربوط ہے۔ جس طرح ایک جال کی کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں، اسی طرح قانون کشش نے کائنات کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑ دیا ہے یہ ایک کل ہے جس کے کسی بھی جزء کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

قرآن کا مشرکین پر یہی اعتراض ہے کہ تم کائنات کے بہت سے خالق قرار دیتے ہو اور خود کائنات کی ساخت صاف بتا رہی ہے کہ اس کو ایک خدا نے پیدا کیا ہے۔ کائنات کی تخلیق کے پیچھے کوئی ایک ذہن نہ ہوتا تو یہاں وہ وحدت نہ ہوتی جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں بلکہ چند بکھرے ہوئے اجزاء ہوتے جن کے درمیان یہ ربط و علاقہ ناپید ہوتا۔

کائنات کا ایک وحدت کی شکل میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا بھی ایک ہے۔ کیونکہ کسی واقعہ کی ایک ہی علت ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ واقعہ ایک ہو اور علتیں کئی ایک جمع ہو جائیں۔ علامہ ابن رشد نے اس موضوع پر بڑی اچھی بحث کی ہے۔ یہ بحث بہت لمبی ہے۔ ہم اسے یہاں اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں:۔

انہ من المعلوم بنفسہ انہ اذا	یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر دو بادشاہ
کان ملکان کل واحد منھما	ہوں اور ہر بادشاہ وہی کام کرے جو دوسرا
فعلہ فعل صاحبہ فانہ لیس	کرتا ہے تو ممکن نہیں کہ ان دونوں کی تدبیر
یمکن ان یکون عن تد[illegible]	سے نظام شہر ایک ر[illegible] ہے۔ کیونکہ ا[illegible]ک ہی

مدينة واحدة لانه ليس يكون عن فاعلين من نوع واحد فعل واحد فيجب ضرورة ان فعلا معا ان تفسد المدينة الواحدة الا ان يكون احدهما يفعل و يبقى الآخر عطلاً وذلك منتف في صفة الالهة فانه متى اجتمع فعلان من نوع واحد على محل واحد فسد المحل ضرورة..... انه يلزم في الالهة المختلفة الافعال التي لا يكون بعضها مطيعا لبعض ان لا يكون عنها موجود واحد ولما كان العالم واحد وجب ان لا يكون موجوداً عن الهة متفنة الافعال ......

ان العلماء يعلمون من ايجاد العالم وكون اجزائه بعضها من اجل لبعض بمنزلة الجسد الواحد اكثر مما يعلمه الجمهور من ذلك.....

.....والاشبه ان لو كان اثنين ان يكون العالم اثنين فاذا العالم واحد فالفاعل واحد فان الفعل الواحد انما يوجد

نوعیت کے دو کام کرنے والوں سے صرف ایک ہی فعل وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ واضح بات ہے کہ اگر دونوں عمل کریں تو شہر بگڑ جائے گا، الّا یہ کہ ان میں سے ایک عمل کرے اور دوسرا معطل رہے اور یہ بات خداؤں کی صفت خدائی کے منافی ہے۔ جب بھی کبھی ایک ہی جگہ میں ایک ہی نوعیت کے دو عمل جمع ہو جائیں گے تو لازماً اس جگہ میں فساد رونما ہوگا........ ایسے خدا جن کے عمل مختلف ہوں اور جو ایک دوسرے کے مطیع اور تابع نہ ہوں ان سب سے صرف ایک ہی چیز وجود میں نہیں آسکتی (عمل مختلف ہیں تو وجود میں آنے والی چیزیں بھی مختلف ہونی چاہئیں) اب جبکہ عالم ایک ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ایسے کئی خداؤں سے وجود میں نہیں آیا ہے، جن میں سے ہر ایک کا عمل اپنی جگہ مضبوط اور محکم ہو........ عالم کے ایجاد کے بارے میں اور اس حقیقت کے بارے میں کہ اجزاء عالم ایک جسم کی طرح باہم ملے ہوئے ہیں اہل علم عوام سے زیادہ واقف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر خدا دو ہوتے تو عالم بھی دو ہوتے۔ لیکن جب عالم ایک ہے تو خدا بھی

عن واحد[1] — ایک ہے کیونکہ ایک عمل ایک ہی سے صادر ہو سکتا ہے۔

تنظیم کائنات ایک خدا چاہتی ہے

اب آئیے، نظم کائنات کے پہلو سے غور کریں۔ کائنات پر صرف ایک خدا کی حکومت ہے، یا بہت سے خدا اس کو چلا رہے ہیں؟ اس سوال کا تخلیق کائنات کے سوال سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ ان دونوں سوالات کو ملاکر ایک ساتھ ان پر غور کریں تو دعویٰ شرک آپ کو انتہائی لغو اور خلاف عقل معلوم ہوگا۔ کائنات کا خالق ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اقتدار بہت سے خداؤں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ صاف بات یہ ہے کہ کائنات کے اندر اسی ذات کی حکومت ہونی چاہیے جو ذات کہ اس کی خالق ہے۔ جو شخص اس کے ساتھ کسی دوسرے کو حاکم بناتا ہے وہ ایسی بے دلیل بات کہتا ہے جسے عقل کبھی باور نہیں کر سکتی۔ قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ اس عظیم کائنات کے ایک ایک ذرہ کا تنہا خدا مالک ہے کیونکہ کائنات کی تخلیق میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ عقل سے اسی قدر قریب ہے کہ اس کی تردید عقل کے واضح مسلمات کی تردید ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۚ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا لَھُمْ فِیْھِمَا مِنْ شِرْکٍ وَّمَا لَہٗ مِنْھُمْ مِّنْ ظَھِیْرٍ ٥

(السبا: ۲۲)

ان سے کہو، بلاؤ تم خدا کے سوا ان لوگوں کو جن کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کے شریک ہیں۔ وہ نہ تو آسمانوں میں کسی ایک ذرے کے مالک ہیں اور نہ زمین میں، اور نہ آسمانوں اور زمین (کے بنانے) میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا معاون و مددگار رہا ہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰہُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ انہیں بتا دو کہ اللہ ان کا

---

[1] فلسفہ ابن رشد (الکشف من مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ) صفحہ ۵۲،۵۱

مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِکُوْنَ لِاَنْفُسِہِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۵ لا اَمْ ھَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۵ج اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰہِ شُرَکَآءَ خَلَقُوْا کَخَلْقِہٖ فَتَشَابَہَ الْخَلْقُ عَلَیْہِمْ ؕ قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ۵

(الرعد: ۱۶)

رب ہے ان سے کہو تو پھر کیا تم نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے جو اپنے لیے بھی نہ تو نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے۔ تم ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں ایک ہو سکتے ہیں یا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں؛ کیا انہوں نے خدا کے لیے شرکاء مقرر کر رکھے ہیں جنہوں نے بھی خدا کی طرح چیزوں کو پیدا کیا ہے کہ اس کی وجہ سے تخلیق کا معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا ہے؛ تم ان سے کہو صرف خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ اکیلا اور سب پر غالب ہے۔

قرآن، تخلیق اور اقتدار دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے۔ جو خالق ہے وہی اقتدار کا مالک بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ پیدا کرنے والا کوئی ہو اور حکومت کسی دوسرے کی قائم ہو جائے۔ کائنات میں حکم اسی کا چلنا چاہیے جو اس کا خالق ہے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ قف یُغْشِی الَّیْلَ النَّھَارَ یَطْلُبُہٗ حَثِیْثًا لا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِہٖ ؕ اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۵

(الاعراف: ۵۴)

بے شک تمہارا رب اللہ ہے۔ جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے کہ رات دن کے پیچھے تیزی سے لپکی چلی آتی ہے اور اس نے سورج اور چاند اور ستارے پیدا کیے یہ سب سب اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ سن لو پیدا اسی نے کیا ہے۔ اور حکم بھی اسی کا ہے

بڑی بابرکت ہے اللہ کی ذات، جو سارے
جہانوں کا پروردگار ہے۔

انسان کا یہ ایک فطری احساس ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے اور کمانے میں تنہا اس کی توفیق صرف ہوئی ہوں اس کا مالک بھی اسی کو ہونا چاہیے۔ پیدا کرنے میں اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے تو اس میں اس کا حق ملکیت بھی نہیں ہے۔ اسی احساس کی بنا پر انسان اپنے کسی محکوم اور غلام کو اپنی کمائی ہوئی دولت میں شریک نہیں تصور کرتا۔ قرآن سوال کرتا ہے کہ انسان اپنے اس احساس کے خلاف شرک کی غیر فطری اور غیر معقول بات خدا کی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟ اپنے غلاموں کے ساتھ اس کا معاملہ جس احساس کے تحت ہوتا ہے خدا کے بارے میں وہ اپنے اس احساس پر پردہ کیوں ڈال دیتا ہے؟ حالانکہ غلام اور آقا کا فرق بنیادی اور حقیقی فرق نہیں ہے۔ دونوں اپنے جذبات و احساسات، شکل و صورت اور بہت سی قوتوں اور صلاحیتوں میں ایک حیثیت اور ایک درجہ کے ہوتے ہیں۔ کسی آقا نے اپنے غلام کو پیدا نہیں کیا بلکہ دونوں کی موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے۔ نہ حاکم اپنی قوت و طاقت سے حاکم بنا ہے اور نہ محکوم اپنی مرضی سے محکوم ہے بلکہ خدا کی حکمت و مصلحت نے ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنایا ہے، لیکن اس کے باوجود جب کوئی شخص اپنے کسی غلام کو اپنے برابر کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو خدا کی مخلوقات کا درجہ خدا کے برابر کیسے ہوسکتا ہے اور وہ اس کے اقتدار میں کیسے شریک ہوسکتی ہیں؟

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ أَنْفُسِكُمْ ط هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَأَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ ط كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ (الروم: ۲۸)	اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تم ہی میں سے ایک مثال دیتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو کیا وہ اس روزی میں تمہارے شریک ہیں جس کو ہم نے تمہیں دیا ہے کہ تم اور وہ اس میں برابر ہو اور تم ان سے ایسے ہی ڈرتے ہو جیسے کہ خود اپنے آپ سے ڈرتے ہو؟ اسی طرح ہم آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔

خالقِ کائنات ہی کا حاکمِ کائنات ہونا خالص عقلی استدلال ہے۔ اب آپ نظمِ کائنات پر غور کیجیے۔ کائنات کا نظم جس انداز سے چل رہا ہے کیا یہ اس بات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ یہاں ایک خدا کی حکومت ہے، یا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کائنات میں متعدد خداؤں کا اقتدار نافذ ہے؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ نظمِ کائنات میں کوئی خدا کا شریک نہیں ہے یہاں اس کا اور صرف اسی کا حکم چل رہا ہے، اس کی مرضی کے خلاف کوئی بھی واقعہ وجود میں نہیں آسکتا، حتیٰ کہ کوئی پتہ تک حرکت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ	بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝ (الملک: ۱)	سارا اقتدار ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔
وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُوْ	اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے
الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝	والا ہے عرش والا اور بزرگ ہے وہ جو
(البروج :)	چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔
وَاللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ	اور اللہ ہر چیز کا فیصلہ کرتا ہے اس کے
لِحُكْمِهٖ ۔ (الرعد: ۴۱)	حکم کا پیچھا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔
لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ	وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں
یُسْئَلُوْنَ ۝	اس سے سوال کرنے والا کوئی نہیں ہے جبکہ
(الانبیاء: ۲۳)	باقی سب اپنے کاموں کے بارے میں پوچھے جائیں گے۔

ان آیتوں میں بظاہر محض یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ نظمِ کائنات تنہا خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی دعویٰ میں اس کی دلیل بھی چھپی ہوئی ہے۔ کائنات کا نظم چند متعین اصول کے تابع ہے۔ کبھی ان اصول کی کہیں سے مخالفت نہیں ہوتی جس واقعہ کے وجود میں آنے کا جو ضابطہ متعین ہے، اس کے تحت لازماً وہ واقعہ وجود میں آتا ہے۔ ہر انقلاب کی ایک راہ ہے کوئی بھی طاقت اس راہ کو بدل کر کسی دوسری راہ سے وہ انقلاب نہیں لاسکتی۔ اس طرح کائنات میں صرف ایک قانون کا پایا جانا اور کہیں سے اس کی مخالفت کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت ایک ہی

خدا کی ہے۔ یہاں اگر کئی خدا ہوتے تو قانون ایک نہ ہوتا بلکہ جتنے خدا ہیں اتنے ہی قانون موجود ہوتے۔

حضرت ابراہیمؑ نے وقت کے ایک با اقتدار شخص کو خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دی وہ اقتدار کے نشہ میں مست تھا۔ اس نے کہا خدا کہاں ہے اقتدار تو میرے ہاتھ میں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا "رَبِّیَ الَّذِی یُحْیِی وَیُمِیتُ" خدا کی خدائی کا ثبوت یہ ہے کہ موت و حیات اس کے قبضے میں ہے اگر خدائی کا تم دعویٰ کرتے ہو تو خدا جسے مارنا چاہے تم اسے جلا دو، یا وہ جسے زندہ رکھنا چاہے تم اسے مار دو۔ اس نے کہا یہ کام تمہارا خدا ہی نہیں کرتا بلکہ میں بھی جسے چاہوں زندہ رکھوں اور جس سے چاہوں زندگی چھین لوں۔ حضرت ابراہیمؑ کے استدلال کے جواب میں جب اس نے اس طرح ضد اور کٹ حجتی کا مظاہرہ کیا تو آپ نے خدا کے اقتدار اور قدرت کا ایسا ثبوت پیش کیا جس کو وہ کسی دلیل سے کاٹ نہیں سکتا تھا۔ آپ نے فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ۔

پس اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تمہارے پاس بھی اقتدار ہے تو تم اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دلیل ایسی تھی کہ جس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قرآن کہتا ہے:۔

فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ (البقرۃ:۲۵۸) پس کافر مبہوت ہو کر رہ گیا۔

حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کو پوری طرح سمجھنے کے لیے دو باتوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ جو واقعہ ہمارے مشاہدے سے باہر ہو رہا ہے، اس کا علم ہم کو آثار و شواہد ہی سے ہو سکتا ہے۔ آثار و شواہد اس کی گواہی نہ دیں تو ہمارے لیے اس کا یقین کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کائنات میں خدا کے اقتدار کے ساتھ کسی دوسرے کے اقتدار کو ہم اسی وقت مان سکتے ہیں جب کہ یہاں اس کے آثار موجود ہوں اور خدا کی حکومت کے ساتھ دوسروں کی حکومت کا بھی ثبوت مل رہا ہو۔

دوسری بات یہ کہ اس کائنات میں بظاہر ایک ہی قانون کی حکومت ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا ایک ہے۔ اگر کوئی اور خدا بھی ہے تو اس حکومت کی اس کو مخالفت کرنی چاہیے اور یہاں اپنا حکم اسے چلانا چاہیے۔ اسی سے اس کی خدائی کا ثبوت مل سکتا ہے۔

لیکن جب کہیں سے خدائے واحد کی مخالفت نہیں ہو رہی ہے تو بہت سے خداؤں کا دعویٰ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا ہے۔

فرض کیجیے آپ کو کسی ایسے ملک میں پہنچا دیا جاتا ہے جس کے نظامِ حکومت سے آپ بالکل ناواقف ہیں، آپ ملک کے مختلف معاملات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے خلاف کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ حاکمِ وقت کے کسی فرمان کی کہیں سے مخالفت نہیں ہو رہی ہے بلکہ وہی ہوتا ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ نہ کہیں اختلاف ہے نہ تصادم، نہ احتجاج اور بغاوت ہے اور نہ ہنگامے اور شورش، بلکہ پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ نظامِ حکومت چل رہا ہے ظاہر ہے اس صورت میں آپ یہی سمجھیں گے کہ ملک کا ایک ہی با اقتدار حاکم ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر آپ کے اس یقین کے خلاف کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس ملک کا حاکم ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ ہیں تو آپ فوراً یہی سوال کریں گے کہ اگر بہت سے حاکم ہیں تو یہاں ان کے اقتدار اور حکومت کے آثار کیوں نہیں نظر آتے؟ وہ کہاں چھپے بیٹھے ہیں کہ کہیں ان کا حکم نہیں چلتا؟ کیا سوائے ایک حاکم کے بقیہ سب حاکم صرف نام کے حاکم ہیں یا اپنے حق حاکمیت سے دست بردار ہو گئے ہیں؟ لیکن اگر یہ بات نہیں ہے بلکہ وہ سب کے سب اس ملک پر حکومت کر رہے ہیں تو فطری طور پر یہاں وہ سکون نہیں ہونا چاہیے تھا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ جب بھی کسی ملک میں بیک وقت ایک سے زیادہ حاکموں کی حکومت ہوگی اس میں سکون باقی نہیں رہ سکتا لازماً وہ اضطراب اور انتشار کی نذر ہو کر رہے گا۔

ٹھیک یہی قرآن کی بنائے استدلال ہے۔

(۱) وہ کہتا ہے کہ خدا کے ایک ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کائنات میں اسی کا ارادہ پورا ہو رہا ہے، جس گوشہ میں دیکھو اسی کا حکم چلتا ہے، زمین، آسمان، چاند، سورج، دن رات ہر چیز پر اسی کی فرماں روائی ہے اور کسی میں اس کی نافرمانی کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کا خیال ہے کہ کائنات کے بہت سے خدا ہیں تو آخر کائنات کے کس حصہ میں ان کی فرماں روائی ہے اور کون سی چیز ان کے احکام کے تابع ہے؟ اور وہ حکومت و فرماں روائی ہمیں نظر کیوں نہیں آتی؟

(۲) اگر یہاں بہت سے خدا ہوتے تو اس کا ثبوت ہمیں تصادم اور ٹکراؤ کی شکل میں ملنا

چاہیے تھا۔ ایک خدا کی مرضی دوسرے خدا کی مرضی سے ٹکراتی ۔ ایک خدا جو کام کرنا چاہتا دوسرا اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا۔ کیونکہ ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ کائنات پر صاحبِ ارادہ اور با اختیار خداؤں کی حکومت ہو اور ان کے درمیان اختلاف اور تصادم نہ پایا جائے ۔ خدا وہ ہے جس کی مرضی اس کائنات میں پوری ہو اور اگر اس کی مرضی پوری نہیں ہوتی ہے تو یہ اس کے خدا ہونے کی نفی ہے ۔ کائنات کے بہت سے خدا ہیں تو ان کے مختلف و متضاد ارادے بیک وقت یہاں پورے ہونے چاہیے تھے جس کا نتیجہ لازمًا بگاڑ اور فساد کی شکل میں رونما ہوتا لیکن صورت حال یہ نہیں ہے بلکہ کائنات میں ہر طرف انتظامی سکون اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔ کائنات میں تصادم اور ٹکراؤ کا نہ ہونا قرآن کے نزدیک صریح طور پر خدا کے ایک ہونے کی دلیل ہے ۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞

(الانبیاء: ٢٢)

اگر زمین و آسمان میں بجائے ایک اللہ کے بہت سے خدا ہوتے تو ان کا نظم بگڑ کر رہ جاتا۔ پس یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اللہ جو عرش کا مالک ہے، اس سے پاک اور بلند ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۙ عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞

(المومنون: ٩٠، ٩١)

نہ تو خدا کی کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی دوسرا خدا یہاں موجود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ ایک الگ دنیا قائم کر لیتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ اللہ ان کے بیان سے پاک ہے۔ وہ ہر چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ (اگر کوئی خدا ہوتا تو اس کو اس کا علم ہوتا) پس اللہ ان کے شرک سے بلند ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۞ سُبْحٰنَهٗ

ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے پر غالب آنے کی کوشش کرتے، پاک اور

وَتَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ۝

(بنی اسرائیل: ۴۲ تا ۴۴)

بلند ہے وہ ان کی باتوں سے۔ بہت بلند۔ ساتوں آسمان اور وہ ساری مخلوقات جو ان میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ بردبار اور مغفرت کرنے والا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں ان کے آخر میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز جب خدا کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے اور اس کی بڑائی اور بزرگی کا اعتراف کر رہی ہے تو کوئی دوسرا خدا کہاں سے آ گیا؟ کائنات توحید کا اعلان کر رہی ہے اور تم شرک کا دعویٰ کر رہے ہو۔ کائنات جس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے کیا اس کے خلاف بھی کوئی دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے؟

اس حقیقت کے بیان کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ "شرک کی جو بات یہ کہتے ہیں خدا اس سے بلند ہے۔ سورۂ مومنون میں فرمایا "خدا ان کے شرک سے بلند ہے"۔ یہی بات سورۂ انبیاء کی آیت میں "رَبُّ الْعَرْشِ" (عرش کا مالک) کہہ کر واضح کی گئی ہے۔ ان فقروں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان شرک سے اسی وقت بچ سکتا ہے جبکہ وہ خدا کا انتہائی بلند تصور رکھتا ہو۔ یہ عظیم کائنات جس عظیم تصور خدا کا تقاضا کرتی ہے اگر وہ تصور ہمارے پاس نہیں ہے تو کائنات کے نظم و تخلیق کا مسئلہ ہزاروں خداؤں سے بھی حل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا تجزیہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کائنات میں بے شمار خداؤں کی خدائی تسلیم کرتے ہیں، ان کے ذہن میں دراصل خدائی کا انتہائی پست اور گھٹیا تصور ہوتا ہے۔ جب اس گھٹیا تصور کے ذریعہ کائنات کے مسائل حل نہیں ہوتے تو بجائے اس کے کہ وہ خدا کے بارے میں بلند تر تصور قائم کریں۔ مزید خداؤں کو اس کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ

انہوں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور ساری زمین قیامت کے روز اس کے قبضہ میں ہوگی اور آسمان (کاغذ کی

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝	طرح) لپٹے ہوئے اس کے داہنے ہاتھ میں ہونگے
(الزمر: ۶۷)	وہ پاک ہے اور بلند، اس شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔

شرک کے خلاف اوپر کی آیتوں میں یہ دلیل دی گئی ہے کہ "زمین اور آسمان میں کئی خدا ہوتے تو ان میں خرابی واقع ہوجاتی" قرآن کی اس دلیل کے بارے میں ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں اس امکان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ کائنات کے متعدد خدا ہوں اور وہ باہم اتفاق کے ساتھ اس کا نظم چلا رہے ہوں۔ اگر یہ امکان موجود ہے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں تصادم اور ٹکراؤ کا نہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں صرف ایک خدا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے خدا ہوں اور ان کے اتحاد و ہم آہنگی نے کائنات کو فساد اور خلفشار سے بچا رکھا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ چاہیں تو ہر مسلّمہ کے خلاف ایک مفروضہ کھڑا کر سکتے ہیں لیکن یہ بات آپ کو نہیں بھولنی چاہیے کہ فرضی امکانات سے واقعات کی تردید نہیں ہوتی۔ ہماری عقل ان ہی امکانات کو قبول کرتی ہے جو واقعات سے ہم آہنگ ہوں۔ اس کے برعکس جن امکانات کی واقعات سے مطابقت نہ ہوتی ہو عقل ان کو لغو سمجھ کر نظر انداز کر جاتی ہے۔ اگر کسی آتشیں مادہ کو پٹرول سے قریب کیا جائے تو وہ فوراً جل اٹھے گا۔ ایک "امکان" یہ بھی ہے کہ آتشیں مادہ پٹرول سے قریب ہو اور اس میں آگ نہ لگے۔ لیکن عقل کے نزدیک اس "امکان" کا کوئی وزن نہیں ہے۔ کیونکہ یہ امکان ہمارے طویل ترین تجربات اور واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو یہ امکان قابل رد ہے کہ کائنات کے کئی خدا ہوں اور وہ باہم اتفاق سے کام کر رہے ہوں۔ کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ ایک ملک میں دو با اختیار حاکم نہیں رہ سکتے۔ یا تو وہ ملک تقسیم ہو جائے گا یا اس میں جنگ اور کشمکش موجود ہوگی۔

امام ابن الہمام نے اس مسئلہ پر بڑی اچھی اور عمدہ بحث کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

والعلوم العادية كالعلم حال	علوم عادیہ (تجربی علوم) جیسے یہ بات کہ جس
الغيبة عن جبل عهدناه	پہاڑ کو ہم نے پتھر کی شکل میں دیکھا ہے ہمارے
حجرا انه حجر الآن داخلة	وہاں سے غائب ہونے کی حالت میں بھی

في العلم الماخوذ فيه عدم احتمال
النقيض ولذا اجيب عن ايراد
خروجه لاحتماله النقيض مع
انه علم بان الاحتمال فيه
بمعنى انه لو فرض العقل خلافه
لم يكن فرض محال وذٰلك
لا يوجب عدم الجزم المطابق
بان الواقع الآن خلاف ذٰلك
الممكن فرضه فاثبتوا فيه
ثبوت الجزم والمطابقة والموجب
اعني العادة القاضية التي
لم يوجد قط خرمها وذٰلك
هو المعنى العلم القطعي بان
الواقع كذا . . . . فيحصل لنا
العلم القطعي بان الواقع الفساد
علىٰ تقدير تعدد الآلهة لان
العادة المستمرة التي لم
يعهد قط اختلافها في ملكين
مقتدرين في مدينة واحدة
عدم الاقامة علىٰ موافقة كل
للآخر في كل جليل وحقير
بل تابى نفس كل وتطلب
الانفراد بالمملكة والقهر

وہ پتھر ہی رہے گا سونے میں نہیں تبدیل
ہو جائے گا، ایسے "علم" کی تعریف میں آتے
ہیں جس میں کہ نقیض کا امکان نہیں ہوتا۔ جو
لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ علوم عادیہ میں
نقیض کا احتمال ہے اس لیے ان کو "علم" نہیں
شمار کرنا چاہیے۔ ان کا جواب یہ ہے کہ احتمال
کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر عقل اس کے خلاف
فرض کرے تو یہ فرض محال نہ ہوگا۔ لیکن اس سے
یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ ہے اس پر بھی ہم
یقین نہ رکھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ واقعہ کے
خلاف جو امکان ہمارا ذہن فرض کر رہا ہے
حقیقت اس کے برعکس ہے پس اس طرح
متکلمین نے علم تجربی میں یقین، واقعہ کی مطابقت
اور "موجب"، کا اثبات کیا ہے۔ "موجب"
سے مراد ایسا قطعی تجربہ ہے جو کبھی نہ بدلے۔
اسی کا نام علم قطعی ہے۔ یعنی یہ کہ واقعہ یہی ہے
اور اس کے خلاف کوئی بات صحیح نہیں ہے...
.... پس اس بنیاد پر ہمیں علم قطعی حاصل ہے کہ
کائنات میں متعدد خدا مان لیں تو نظم کائنات
کا بگڑنا ضروری ہے کیونکہ مسلسل تجربہ جس کے
خلاف کبھی نہیں دیکھا گیا، یہ ہے کہ دو با اختیار
بادشاہوں کی ایک ہی شہر میں حکومت ہو تو وہ
ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں کبھی موافقت

فکیف بالالھین والالٰہ یوصف باقصی غایات التکبر کیف لا تطلب نفسہ الا نفرادبالملک والعلوعلی الآخرکما اخبر اللہ سبحانہ بقولہ وَ لَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ ھذا اذا توءمل لا نکادا لنفس تخطر نقیضہ فضلا عن اخطارفرضہ مع الجزم بان الواقع ھوالاخروعلیٰ ھذا النقدیر ھوعلم قطعی [۱]

نہیں کرتے۔ ان میں سے کسی ایک کا نفس بھی اس طرح کی موافقت کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ حکمرانی بلاشرکت غیرے اسی کی رہے۔ تو ہم اس طرح کی "مصالحت" کا تصور دو خداؤں کے بارے میں کیسے کر سکتے ہیں۔ جب کہ خدا ہے ہی وہ جو انتہائی تکبر اور انانیت کے ساتھ متصف ہو۔ تو وہ سلطنت اور اقتدار میں اپنے لیے انفرادیت اور دوسرے پر اپنی بالادستی کا طالب کیسے نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول میں "اگر کئی خدا ہوتے تو وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے" فرمایا ہے۔ مسئلہ پر اگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو جو بات کہی گئی ہے اس کے خلاف کوئی بات ذہن میں کھٹک ہی نہیں سکتی، چہ جائیکہ اس طرح کا مفروضہ اسے لاحق ہو۔ جب کہ انسان کو یہ یقین ہے کہ واقعہ اس مفروضہ کے خلاف ہے۔ اس لحاظ سے علم تجربی بھی علم قطعی ہے۔

نفسیات شرک کا انکار کرتی ہیں

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ انسان کی نفسیات شرک کا تقاضا کرتی ہیں یا توحید کا؟ وہ اپنے لیے ایک خدا چاہتا ہے، یا کئی خداؤں کو پسند کرتا ہے۔

خدا کائنات کا حاکم ہے اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ہی حاکم کو پسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غلامی کی بدترین قسم یہ ہے کہ وہ کئی خداؤں کی خدائی میں گھرا رہے اور اس کی غلامی میں کسی ایک کا نہیں بلکہ بہت سے آقاؤں کا حصہ ہو۔ جو شخص اپنے لیے کئی خداؤں کو منتخب کرتا ہے وہ اپنی فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی راہ چل رہا ہے جس میں اس کا ضمیر اور اس کی نفسیات

---

[۱] المسایرۃ المطبوع مع شرحہ المسامرۃ ص ۴۵-۴۸

اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
(الزمر: ۲۹)

اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کی مثال دی جس کے مالک ایسے شریک ہیں جو بہت ہی جھگڑالو ہیں اور ایک وہ شخص ہے جو صرف ایک شخص کے لیے خاص ہو گیا ہے، کیا ان دونوں کی حالت ایک ہو سکتی ہے؟ سب تعریف خدا کے لیے ہے، لیکن ان میں سے بیشتر جانتے نہیں ہیں۔

زلزلہ اور بھونچال آتا ہے تو زمین ان خزانوں کو اُگل دیتی ہے جن کو وہ اپنے سینہ میں چھپائے رکھتی ہے۔ اسی طرح انسان کی حقیقی نفسیات اس وقت ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جب وہ کسی مصیبت میں گھر جاتا ہے اور تمام امیدیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ ایک شخص راستہ چل رہا ہو اور پیچھے سے اچانک اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے تو اس حالات میں اس کی زبان سے جن الفاظ میں چیخ نکلے گی، وہ اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوگی۔ اس طرح کے حالات میں انسان پر جتنے مصنوعی پردے پڑے ہوتے ہیں وہ تار تار ہو جاتے ہیں اور اس کی اصل شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ جس چیز کی جڑیں زمین میں زیادہ گہری نہ ہوں، ہوا کا ایک جھونکا اس کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ زمین سے اس کا تعلق محض سطحی تھا۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ شرک سے بیزاری انسان کی نفسیات میں شامل ہے۔ کیونکہ مصیبتیں اور پریشانیاں اس سے توحید کا اعتراف کراتی ہیں۔ وہ اپنی مشکلات میں دس سہارے نہیں ڈھونڈھتا، بلکہ صرف ایک ایسا مضبوط سہارا چاہتا ہے جو اس کو ہر مشکل سے نجات دے سکے۔ اگر اس کے ہزار خدا ہوں تو مایوسی اور ناامیدی میں وہ ان سب سے امیدیں وابستہ نہیں کرتا بلکہ صرف ایک خدا کو پکارتا ہے اور اسی سے آس لگاتا ہے۔ انسان کی یہ نفسیات توحید کی زبردست دلیل ہیں۔ انسان کی کشتی جب بھنور میں پھنس جاتی ہے اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر خدائے واحد کی طرف مدد کا ہاتھ پھیلاتا ہے، تو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سکون اور اطمینان کی حالت میں اس کا بہت سے خداؤں کو ماننا جھوٹ اور فریب ہے۔ شرک اس کی فطرت نہیں ہے۔ بلکہ ایک غیر فطری بات ہے

جواس کے ساتھ چپک گئی ہے۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ
وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ ۚ
وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَّ
فَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ
وَّجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ
وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ
لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ
مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ
إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ
الْحَقِّ ۗ

(یونس: ٢٢-٢٣)

وہ خدا ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ (ایسے مواقع بھی آتے ہیں) جب کہ تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ خوشگوار ہوا کی مدد سے لوگوں کو لیے چلتی رہتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہو چکے ہوتے ہیں کہ یکایک آندھی چلنے لگتی ہے اور ان کو ہر طرف سے سمندر کی موجیں گھیر لیتی ہیں اور وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب وہ (مصیبت میں) گھر گئے، تو ایسے وقت میں وہ اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بنے رہیں گے پھر جب وہ ان کو اس حالت سے نجات دے دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ
دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ
يُشْرِكُونَ ۝

(العنکبوت: ٦٥)

جب وہ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو وہ دین کو خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اس کو پکارتے ہیں۔ پھر جب وہ ان کو بچا کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں۔

قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ
عَذَابُ اللَّهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ

اے پیغمبر! ان سے کہو۔ بتاؤ اگر تم پر خدا کا عذاب آئے یا قیامت تمہارے سامنے

أَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام: ۴۰، ۴۱)

آگھڑی ہو تو کیا اس وقت خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو آواز دیتے ہو؟ اگر تم اپنے ان معبودوں کو ماننے میں سچے ہو (تو تمہیں ان ہی کو بلانا چاہیے) لیکن تم صرف خدا کو بلاتے ہو۔ اور جس مصیبت میں تم اسے بلاتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اسے رفع کرتا ہے۔ اس وقت تم اپنے شرک کو بھول جاتے ہو۔

غرض کائنات[۱] کی تخلیق، اس[۲] کا نظم اور انسان[۳] کی نفسیات صاف بتا رہے ہیں کہ شرک ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ اس کائنات میں خدا کے شریک وسہیم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جو لوگ کئی خداؤں کو مانتے ہیں وہ صرف ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں وہ ایسے نام ہیں جن کے وجود کا خارج میں کہیں کوئی پتہ نشان نہیں ہے۔

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ (النجم: ۲۳)

یہ تو چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے اپنی طرف سے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان پر کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ یہ لوگ اپنے خیال اور اپنے نفسوں کی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں، اور حال یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ ۗ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (یونس: ۶۶)

سن لو! جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور جو زمین میں ہیں وہ سب اللہ ہی کے محکوم ہیں، جو لوگ خدا کے سوا دوسرے شرکاء کو پکارتے ہیں وہ ان شرکاء کی اتباع نہیں کرتے (کیونکہ ان کا کہیں وجود نہیں ہے) وہ محض اپنے ظن وگمان کے پیچھے چل رہے ہیں

اور اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں۔

جو شخص ان دلائل پر سنجیدگی سے غور کرے گا، وہ قرآن کا ہم زبان ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوگا۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۙ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ ۙ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (المومنون : ۱۱۷)

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو پکارتا ہے، وہ اپنی اس روش (کے حق ہونے) پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اس کا حساب بس اس کے رب کے پاس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کافر کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

توحید کو عقل و استدلال کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اور شرک کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے، توحید ایک علمی صداقت ہے اور شرک کو انسان کے وہم نے وجود بخشا ہے۔ انسان نے اپنے اور اس کائنات کے بارے میں جتنے نظریات قائم کیے ہیں ان میں صرف توحید ہی ایک سچا اور معقول نظریہ ہے۔ اس کے علاوہ جتنے نظریات ہیں وہ سب باطل اور بے دلیل ہیں۔ کائنات پر یہ حقیقت لکھی ہوئی ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے، انسان آنکھیں کھول کر اس حقیقت کو ہر وقت پڑھ سکتا ہے لیکن جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو اس کو آفتاب سے زیادہ واضح حقیقت بھی نظر نہیں آ سکتی۔

فصل چہارم

کائنات میں خدا کا عمل

''اس میں شک نہیں کہ کائنات اپنے آغاز میں ایک خالق کی محتاج تھی۔ لیکن اب اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کائنات واقعہ کے طور پر جب ایک مرتبہ وجود میں آچکی تو آگے بڑھنے کی قوتیں بھی اس میں خود بخود پیدا ہوگئیں، اس لیے وہ اپنے خالق کی مدد کے بغیر اپنا کام انجام دے رہی ہے''۔

یہ فلاسفہ کے ایک گروہ کا خیال ہے۔ خدا کو خالق کائنات کی حیثیت سے ماننے میں اس گروہ کو کوئی تامل نہیں ہے، البتہ وہ اس رائے سے انکار کرتا ہے کہ کائنات وجود میں آنے کے بعد بھی خدا کی محتاج ہے۔ عقل جہاں کوئی مادی سبب ڈھونڈنے میں ناکام ہوتی ہے، وہاں تو فلسفیوں کا یہ گروہ خدا کو ماننے کے لیے تیار رہے، لیکن اگر مادی توجیہہ و تاویل کا کوئی کمزور سہارا بھی اس کے ہاتھ آجاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اب خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ کائنات کے آغاز کا مسئلہ، مادیت کی بنیاد پر حل نہیں ہوتا اس لیے وہ مانتا ہے کہ خدا اس کا خالق ہے اور اسی نے اس کو وجود بخشا ہے۔ لیکن کائنات میں اسباب کا سلسلہ چل رہا ہے، اس لیے یہ اسباب ہی اس کے نزدیک اصل کارفرما قوت ہیں۔ ان ہی نتیجے میں یہاں واقعات رونما ہوتے اور مٹتے ہیں، چیزیں ابھرتی اور فنا ہوتی ہیں۔ اس گروہ کی رائے میں جب کسی واقعہ کا ایک محسوس اور ٹھوس سبب ہم دیکھ رہے ہیں تو کسی غیر محسوس اور غیر مادی قوت کو اس کا سبب ماننے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ پانی سے اگر بجلی پیدا ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خدا کو بجلی کا خالق تسلیم کریں۔

کائنات میں خدا کا عمل جاری ہے

ان فلسفیوں نے خدا کو ماننے کے باوجود خدا اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کا

اقرارِ خدا بھی انکارِ خدا سے مختلف نہیں ہے، ایک مرحلے میں وہ جس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں دوسرے مرحلے میں اسی کی تردید بھی کر جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا اس کائنات کے لیے صرف علتِ اولیٰ ہی نہیں ہے بلکہ کائنات سے اس کا مسلسل اور غیر منقطع تعلق ہے۔ خدا اور کائنات کے تعلق کی نوعیت وہ نہیں ہے جو کارخانہ اور انجینئر یا مصنف اور اس کی کتاب کے تعلق کی ہوتی ہے کہ کارخانہ وجود میں آگیا اور چلنے لگا تو وہ انجینئر سے بے نیاز ہے۔ کتاب اپنے مصنف سے اسی وقت تک تعلق رکھتی ہے جب تک کہ وہ اس کے ذہن میں ہے۔ جس وقت وہ ذہن سے نکل کر تحریر میں آگئی تو مصنف کی محتاج نہیں رہی۔ لیکن کائنات خدا سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ خدا سے الگ ہو کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ جس طرح وہ خدا کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی، اسی طرح خدا کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی۔ کائنات اپنی جگہ اس لیے قائم ہے کہ اس کا خدا اسے تھامے ہوئے ہے۔ اگر خدا اپنا ہاتھ اٹھالے تو وہ فوراً ختم ہو جائے گی۔ کائنات اپنی بقا کے لیے خدا کی اس سے زیادہ محتاج ہے جتنی گرتی ہوئی دیوار کسی سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَاۃ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِہٖ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ٥ (فاطر: ۴۱)	بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو کسی طرف ڈھلک جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ اپنی جگہ سے ڈھلک جائیں تو سوائے خدا کے کوئی ان کو روک نہیں سکتا۔ یقیناً اللہ بردبار اور غفور ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری کائنات میں حیرت انگیز توافق اور ہم آہنگی ہے۔ یہ اس کی ذاتی خصوصیت نہیں ہے بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور وہی اس کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ بے شمار سیارے اس اتھاہ فضائے کائنات میں پھیلے ہوئے ہیں اور خدائے تعالیٰ ان کو ایک خاص توازن کے ساتھ اپنے اپنے دائرے میں مسلسل گھما رہا ہے، سورج ہو یا چاند یا ہمارا یہ کرۂ زمین ان میں سے کوئی بھی از خود فضا میں گردش نہیں کر رہا ہے بلکہ خدا کی قدرت اسے گردش دے رہی ہے اس طرح نظامِ کائنات حسن و خوبی کے ساتھ قائم ہے اور کہیں بگاڑ اور خرابی نہیں پیدا ہوتی۔

زمین، سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے تو ہمارے اوقات رات اور دن میں تبدیل ہوتے ہیں۔

اس تبدیلی سے ہمیں یہ موقع ملتا ہے کہ وقفہ وقفہ سے ہم سعی و محنت بھی کریں اور آرام بھی پائیں اور یہ دونوں ہی چیزیں ہمارے لیے ضروری ہیں۔ کیونکہ ہم نہ تو مسلسل محنت کر سکتے ہیں اور نہ محنت کے بغیر اپنی ضروریات حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا رات اور دن کا یہ حیرت انگیز نظام از خود قائم ہے؟ نہیں! بلکہ رات آتی ہے تو خدا کی قدرت سے آتی ہے اور دن نکلتا ہے تو خدا کی قدرت سے نکلتا ہے۔ وہ اگر اس نظام کو بدل دے تو سیارے اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں اور رات اور دن کا فرق مٹ جائے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
(القصص : ۷۲۔۷۳)

ان سے کہو بتاؤ اگر اللہ رات کو تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک طاری کر دے تو وہ کون خدا ہے سوائے اللہ کی ذات کے جو تمہارے پاس روشنی لائے کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے کہو، بتاؤ اگر اللہ تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیامت تک دن کیے رہے تو سوائے اللہ کی ذات کے وہ کونسا خدا ہے جو تمہارے لیے رات لائے جس میں تم سکون حاصل کرسکو۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن مقرر کیے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

کائنات کی تخلیق کے بعد خدائے تعالیٰ اس سے الگ ہو کر نہیں بیٹھ گیا، بلکہ وہ پوری طرح اس کو اپنی حفاظت میں لیے ہوئے ہے۔ وہ اس کا حاکم مطلق اور بادشاہِ کل ہے اور حکمت و دانائی کے ساتھ اس پر حکومت کر رہا ہے۔ وہ اس کا نور ہے اور ہر دم اس میں اپنا جمال اور روشنی پھیلا رہا ہے۔ یہی حقیقتیں ہیں جو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر دعا بن کر جاری ہو گئی ہیں:-

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ وَلَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْھِنَّ[1]

خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے۔ تو نگراں ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو ان میں ہیں۔ خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے تو نور ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان تمام چیزوں کا جو ان میں ہیں خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے تو بادشاہ ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو ان میں ہیں۔

اسی بات کو آپؐ نے ان الفاظ میں بھی ظاہر فرمایا ہے:-

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُہٗ یُرْفَعُ اِلَیْہِ عَمَلُ اللَّیْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّھَارِ وَعَمَلُ النَّھَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّیْلِ[2]

بے شک اللہ سوتا نہیں ہے اور سونا اس کے شایانِ شان بھی نہیں ہے وہی عدل کی ترازو کو کبھی نیچے کرتا اور کبھی اوپر کرتا ہے۔ اس کے سامنے رات کا عمل دن کا عمل شروع ہونے سے پہلے اور دن کا عمل رات کا عمل شروع ہونے سے پہلے پیش کیا جاتا ہے۔"

کائنات ہر آن اپنے خالق کی محتاج ہے

کائنات صرف اپنے آغاز ہی میں خالق کی محتاج تھی تو تخلیق کا عمل بھی صرف ایک ہی مرتبہ ہونا چاہیے تھا، حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مسلسل تخلیق ہو رہی ہے۔ ایک چیز

---

[1] یہ ایک لمبی دعا ہے جس کے ابتدائی کلمات یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو بخاری، کتاب التہجد، باب التہجد باللیل۔ یہی روایت کچھ تقدیم و تاخیر اور بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مسلم میں بھی موجود ہے۔ دیکھیے، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ النبیؐ و دعائہ باللیل۔

[2] مسلم، کتاب الایمان، باب معنی قول اللہ عزوجل: ولقد راٰہ نزلۃ اخری۔

فنا ہوتی ہے تو دوسری چیز اس کی جگہ لینے موجود ہوتی ہے۔ کائنات اپنا جو سرمایہ حیات کھوتی ہے، عملِ تخلیق دوبارہ اس کو وہ سرمایہ فراہم کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کائنات سے اس کے خالق کا رشتہ اس کے آغاز ہی میں تھا تو تخلیق کا یہ عمل اس وقت کون انجام دے رہا ہے؟ اس کے جواب میں آپ ہوا، پانی، لوہا، پتھر اور ایسی ہی بے شمار چیزوں کا نام لیں گے جو آپ کے نزدیک تخلیق کا سبب ہیں۔ لیکن یہ جواب اس سوال کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ایک دوسرے سوال کو پیدا کرتا ہے، وہ یہ کہ جن چیزوں کو آپ سبب تخلیق کہتے ہیں ان میں تخلیق کی قوت کہاں سے آگئی؟ اس سوال کا جواب جس سے عقل مطمئن ہو جائے قرآن کے پاس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تخلیق کا عمل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے۔ کائنات کی علت اولیٰ بھی وہی ہے جب کہ اس کے سوا وجود کائنات کا کوئی دوسرا سبب نہیں تھا اور اس وقت بھی ہر چیز کو وہی پیدا کر رہا ہے جب کہ یہ کائنات اسباب سے بھری ہوئی ہے۔ اسباب خالق نہیں ہیں، بلکہ خدا خالق ہے۔ کسی واقعہ میں فی نفسہٖ یہ طاقت نہیں کہ وہ دوسرے واقعہ کو وجود دے بلکہ خدا جب اس واقعہ کو ذریعہ بنانا چاہتا ہے تو وہ ذریعہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بار بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ کائنات اب بھی اپنے خالق کی محتاج ہے۔ اگر خدا کی خالقیت کا یہاں مظاہرہ نہ ہو تو کوئی بھی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ ایک جگہ فرمایا:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ط يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ط ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ٥ (الزمر: ٦)	خدا نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس نے تمہارے لیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں یکے بعد دیگرے تخلیق کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے۔ تین تاریک پردوں کے بیچ میں۔ وہی ہے اللہ تمہارا رب، سلطنت اسی کی ہے۔ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں، پس تم کہاں پھیرے جاتے ہو؟

مطلب یہ کہ انسان ہو یا کوئی بھی ذی حیات مخلوق، اس کو زمین پر پہلی مرتبہ وجود دینے والا بھی

خدا ہی ہے اور اس کے بعد بھی جو جاندار وجود میں آتا ہے خدا ہی کی قدرت سے وجود میں آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ خدا نے کسی وجود کی ابتدا تو کی ہو اور پھر از خود اس کا سلسلہ چل پڑا ہو بلکہ سلسلۂ وجود کی ہر کڑی کے ساتھ خدا کا عمل تخلیق جاری ہے۔ کائنات میں ہر طرف رشتۂ زوجیت پھیلا ہوا ہے اور اسی رشتے کے نتیجے میں انسان اور حیوان پیدا ہوتے ہیں، لیکن اس رشتے میں یہ حیرت انگیز تاثیر اور قوت آپ سے آپ نہیں آگئی بلکہ وہ خدا کی پیدا کردہ ہے۔ ایک انسانی پیکر کو عدم سے وجود میں آنے کے لیے بہت سے انقلابات سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر وجود میں آنے کے بعد وہ مختلف مراحل طے کرتا ہے، یہ سارے انقلابات و مراحل خدا کے علم اور قدرت سے طے ہوتے ہیں۔ وہ ان تبدیلیوں کو نہ لانا چاہے تو کسی ظاہری سبب یا علت میں یہ طاقت نہیں کہ ان تبدیلیوں کو لا سکے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ؕ وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖۤ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ (فاطر: ۱۱)

اللہ نے تم کو مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا پھر اس نے تم کو جوڑوں کی شکل میں بنایا اس کے علم کے بغیر نہ تو کسی مادہ کے پیٹ میں حمل قرار پاتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے۔ اور نہ کسی بڑے عمر والے کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور نہ کسی کی عمر میں کمی ہوتی ہے۔ الا یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے۔ یقیناً ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔

انسان ایک ایسے عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جس کا اس کی تخلیق سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن سوال کرتا ہے کہ نطفے کا ایک قطرہ جس میں تم زندگی کے بے شمار جراثیم دیکھتے ہو اور جو تمہارے نزدیک انسان کی تخلیق کا سبب ہیں۔ بتاؤ یہ جراثیم اس میں کہاں سے آگئے؟ نطفے میں یہ قوت کیسے پیدا ہوگئی کہ ہوش و حواس رکھنے والا انسان اس سے وجود میں آسکے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا مادیت کی دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔

دانے کو مٹی میں ڈالنے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ لازماً اس سے پودا نکلے گا۔ کیونکہ اب تک یہی دیکھا گیا ہے کہ جو بھی دانہ زمین کی گود میں پہنچا، اگر کوئی رکاوٹ نہ ہو تو وہ پودا بن کر ابھرا ہے

یہ بات صحیح ہے۔ لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ماضی میں زمین دانہ کو پودے کی شکل دیتی رہی ہے تو ضروری نہیں کہ آئندہ بھی اس کا یہی عمل ہو۔ کیونکہ زمین کی یہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ایک ننھے سے دانے کو تناور درخت میں تبدیل کر دے۔ زمین سے پودے کا نمودار ہونا، بڑھنا اور پھیلنا یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے پیچھے خدا کی قدرت اور اس کی مرضی کام کر رہی ہو۔ ورنہ یہی زمین ہوگی لیکن جو سرسبزی و شادابی ہم اس کے سینے پر دیکھتے ہیں وہ کبھی نظر نہ آئے گی۔ جس خدا نے دانہ کو قوتِ نمو اور زمین کو اس کی پرورش کی صلاحیت عطا کی ہے وہ جب کبھی چاہے اس سے محروم کر سکتا ہے۔

سمندر کا پانی بخار بن کر اوپر فضا میں پہنچتا ہے اور وہاں سے برسنے لگتا ہے ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ ان اسباب کا نتیجہ ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہیں لیکن مطلقاً یہ بات صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ ہر عمل کے پیچھے اسباب پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسباب اسی وقت تک اسباب ہیں جب تک کہ خدا ان کو اس حیثیت میں رکھنا چاہے۔ ورنہ کوئی بھی چیز کسی چیز کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس لیے ماننا پڑے گا کہ سمندر سے بخارات خود سے نہیں پیدا ہوتے بلکہ خدا ان کو پیدا کرتا ہے، بارش خود سے نہیں برستی بلکہ خدا اس کو برساتا ہے۔ سمندر کے پانی کو بھاپ بنا کر اوپر لے جانا اور بارش کی شکل میں زمین پر برسانا یہ اسباب کا کام نہیں ہے بلکہ خدا کا کام ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر کا پانی کھاری ہے، لیکن یہی پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے تو لذیذ اور شیریں بن جاتا ہے۔ جس خدا نے یہ نظام مقرر کیا ہے وہ جب چاہے اس کو بدل سکتا ہے۔

آگ جلانے کے لیے ہم لکڑی کا استعمال کرتے ہیں۔ لکڑی سے آگ کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک راز ہے جسے ہم مادی اسباب کی روشنی میں حل نہیں کر سکتے۔ لکڑی سے آگ کے شعلے ایک مرتبہ نکل پڑے تو کیا ہمیشہ اس سے یہی عمل صادر ہونا چاہیے؟ قرآن کا دعوٰی ہے کہ جب تک خدا نہ چاہے لکڑی آگ نہیں پیدا کر سکتی[1]۔"

جس طرح کائنات کے آغاز کا مسئلہ خالق کو مانے بغیر حل نہیں ہوتا اسی طرح کائنات کے

---

[1] یہ تقریر سورۂ واقعہ آیت ۷۵ تا ۷۳ سے ماخوذ ہے۔

بقا و ثبات کا مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہوتا جب تک کہ ہم یہ نہ مان لیں کہ کائنات اب بھی اپنے خالق کی محتاج ہے۔ یہاں ہونے والا ہر چھوٹا بڑا واقعہ ایک نیا واقعہ ہے جب بھی وہ وجود میں آتا ہے خدا کی قدرت سے وجود میں آتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، سب خدا ہی کی طرف سے ہے وجود اور عمل دونوں خدا کے قبضے میں ہیں۔ کوئی چیز اس کی مرضی اور فیصلے کے بغیر نہ تو وجود میں آ سکتی ہے اور نہ اپنا کام انجام دے سکتی ہے

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ

سن لو، تخلیق اور اقتدار دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اس چھوٹے سے فقرے میں جو بات کہی گئی ہے اس کو کائنات اور خدا کے تعلق کے بارے میں قرآن کی تعلیمات کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات پر موجود ہے:۔

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَھُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَکَّرُوْنَ ہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (السجدہ ۴ : ۵)

اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی ساری چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ اپنے عرش پر متمکن ہوا، اس کے علاوہ تمہارا کوئی ولی و کارساز اور سفارشی نہیں ہے تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؛ وہ آسمان سے زمین تک تمام معاملات کا انتظام کرتا ہے

یہی بات سورۂ حدید کی ابتدائی آیتوں میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے:

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ج وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَھُوَ بِکُلِّ

آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ کی تسبیح کر رہی ہیں اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے وہی ہے اول و آخر اور ظاہر و باطن اور وہ ہر چیز کا

شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ؕ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَھُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

(الحدید : ۱-۶)

علم رکھتا ہے اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے، جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان پر چڑھتا ہے وہ سب کو جانتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینے میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے۔

خدا عدل کے ساتھ کائنات پر حکومت کرتا ہے

اس کے ساتھ قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ کائنات پر خدا کی حکومت کسی نادان یا ظالم فرمانروا کی حکومت نہیں ہے بلکہ خدائے تعالیٰ اسے انتہائی بصیرت اور عدل و انصاف کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اس کا کوئی عمل انصاف سے ہٹا ہوا اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر کام حکمت سے بھرا ہوا اور انصاف کے عین مطابق ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں ڈارون نے کہا تھا کہ یہ کائنات ایک میدان جنگ ہے۔ یہاں مخالف قوتیں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ اس جنگ میں جو چیز شکست کھاتی ہے وہ مٹ جاتی ہے اور جو چیز غالب آتی ہے وہ زندگی کی جدوجہد میں کامیاب رہتی ہے۔ ڈارون خدا کا منکر تھا اس لیے وہ یہ سوچ نہیں سکا کہ اس کائنات میں 'حق' موجود ہے اور یہاں جو کچھ ہوتا ہے بہ تقاضائے حق ہوتا ہے۔ ڈارون کی طرح جو بھی شخص خدا کا انکار کرے گا وہ کبھی اس کائنات میں 'حق' کے وجود کا قائل نہیں ہو سکتا۔ اس کو ہر طرف باطل ہی کی حکمرانی نظر آئے گی حالانکہ اس کائنات کے بارے میں یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے جو بولا گیا ہے:-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۚ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۗ

(ص : ٢٧)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے جو خدا کے منکر ہیں پس تباہی ہے نارِ جہنم کی خدا کا انکار کرنے والوں کے لیے۔

قرآن اس خیال کی سختی سے تردید کرتا ہے کہ کائنات حق و انصاف سے خالی ہے اور ظلم اور باطل کی اساس پر چل رہی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کائنات باطل کے تصرف میں نہیں ہے بلکہ حق کے قبضہ میں ہے۔ یہ کائنات خدا کی ہے کسی ایسی ہستی کی نہیں ہے جس کے اعمال میں مقصدیت نہ ہو۔ خدا نے بطور تفریح یہ کارخانہ نہیں کھول رکھا ہے بلکہ اسے ایک عظیم مقصد کے تحت پیدا کیا ہے۔ جو لوگ اتنی بڑی حقیقت کو جھٹلاتے ہیں وہ قرآن کے نزدیک اپنے انجام سے بے خبر ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۗ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝

(الانبیاء : ۱۶،۱۸)

ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں بطور کھیل نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کھیل کود کی کوئی چیز بنانا چاہتے تو اپنی طرف سے ایسا ہی بنا لیتے۔ اگر واقعتاً ہمیں ایسا کرنا ہوتا لیکن ہم پھینک مارتے ہیں حق کو باطل پر تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پس اس طرح باطل مٹ جاتا ہے اور تباہی ہے تمہارے لیے ان باتوں میں جو تم کرتے ہو۔

خدائے تعالیٰ نے جس طرح "حق" کے ساتھ اس کائنات کو پیدا کیا ہے، اسی طرح "حق" کے ساتھ وہ کائنات میں تصرف بھی کر رہا ہے۔ یہاں کوئی واقعہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ حق و عدل کے تقاضے اس کے وجود کو لازم نہ کر دیں۔ خدائے تعالیٰ نے نظامِ کائنات کو اس انداز سے بنایا ہے کہ اس نظام میں جس چیز کو اپنے لیے جس قسم کی قوتوں اور صلاحیتوں

کی ضرورت ہے اسی قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں اسے عطا کی ہیں چنانچہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کر رہا ہے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کائنات کے اس مجموعی عمل میں بہت سے واقعات آپ کو حکمت سے خالی نظر آئیں گے لیکن اگر آپ انہیں پورے نظام کائنات میں رکھ کر دیکھ سکیں تو معلوم ہوگا کہ ہر واقعہ ٹھیک اپنی صحیح شکل میں وجود میں آرہا ہے سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل جاتی ہے، خزاں آتی ہے اور بہار کی ساری رنگینی ختم ہو جاتی ہے۔ زلزلہ کا ایک جھٹکا زمین کو تہ و بالا کر دیتا ہے اور جیتی جاگتی مخلوق زمین کے نیچے دب جاتی ہے۔ موت کا پنجہ بچہ کو ماں کی گود سے چھین لیتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ سب کچھ ظلم ہے اور ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ آپ کی عقل کا قصور ہے۔ آپ کی نظر محدود ہے اس لیے آپ زیادہ دور تک دیکھ نہیں سکتے۔ اس کائنات کی حکمتوں کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے، جو اس کا مالک ہے اور جس کا علم پوری کائنات کو محیط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کائنات میں موت بھی ہے، اور حیات بھی، تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی خوشی بھی ہے اور غم بھی۔ پھول بھی ہے اور کانٹے بھی۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں کوئی اندھی بہری قوت حکومت کر رہی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کائنات دونوں کی محتاج ہے خدائے تعالیٰ اگر اپنی حکمت سے ہر آن اس کائنات میں تراش خراش نہ کرے تو اس کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور اس کے ساتھ وہ بہترین مقصد بھی ختم ہو جائے گا جس کے لیے کائنات وجود میں لائی گئی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے :۔

وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ (المومن : ۲۰)	اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور اس کے سوا جن لوگوں کو یہ پکارتے ہیں وہ کسی بھی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے۔

اس بات کا سب سے بڑا ثبوت کہ کائنات حق و انصاف اور بصیرت کے ساتھ چلائی جا رہی ہے۔ خود اس کا حیرت انگیز نظام ہے۔ بڑے بڑے سیارے جن کی لمبائی چوڑائی کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے، فضا میں تیر رہے ہیں۔ یہ سیارے اگر آپس میں ٹکرا جائیں تو کائنات میں زبردست شکست و ریخت واقع ہوگی اور کوئی چیز اپنی جگہ باقی نہیں رہ سکے گی۔ لیکن وہ خدا کے قانون میں اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ اپنے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ہولناک سمندر ہماری زمین کو

چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن اس کی طغیانی زمین کو ختم نہیں کرتی ۔ کیونکہ خدا کی مرضی یہ نہیں ہے کہ زمین ختم کر دی جائے ۔ یہ حیرت انگیز اعتدال اور بے مثال توازن اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی قوت ہے جو اس توازن اور اعتدال کو باقی رکھے ہوئے ہے ۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا وَّقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝
(یونس : ۵)

وہی ذات ہے جس نے سورج کی روشنی اور چاند کو نور عطا کیا اور اس کی منزلیں متعین کر دیں تاکہ تم برسوں اور تاریخوں کا حساب معلوم کر سکو۔ یہ سب کچھ اللہ نے حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝
(یٰس : ۳۸، ۴۰)

اور سورج چل رہا ہے اپنے متعین راستے پر، یہ غالب اور جاننے والے خدا کا ٹھہرایا ہوا فیصلہ ہے اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں متعین کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کی مانند ہو جاتا ہے سورج کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے اور ہر چیز اپنے مدار میں گھوم رہی ہے ۔

کائنات میں اس لیے سکون ہے کہ اس پر ایک ایسی ہستی کی حکومت ہے جو اپنے اختیار کو ہمیشہ "حق" کے ساتھ استعمال کرتی ہے ۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجیے کہ ایسا نہ ہوتا اور یہ کائنات انسان کے اختیار میں ہوتی تو ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فتنہ و فساد سے بھر جاتی ۔ کیونکہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے اختیار کو ہر وقت 'حق' کے تابع نہیں رکھتا بلکہ بسا اوقات 'خواہش' کے تابع بنا دیتا ہے ۔ اسی وجہ سے وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک بھی جاتا ہے ۔ کیونکہ خواہش ایک اندھی بہری قوت ہے ۔ وہ حق و باطل میں تمیز نہیں کرتی اور بیشتر معاملات میں 'حق' کو چھوڑ کر باطل کے

پیچھے دوڑنے لگتی ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ؕ (المومنون : ۷۱)	اگر حق، ان کی خواہشات کے پیچھے چلے تو تمام آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں جو ان کے اندر ہیں خراب ہوجائیں۔

کیا کائنات میں جبر ہے؟

قرآن میں پوری قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حکومت و اقتدار خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اول و آخر ظاہر و باطن ہر طرف اسی کی فرمانروائی ہے۔ کوئی اس کی حکومت میں شریک نہیں ہے، سارے معاملات وہ طے کرتا ہے اور ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کی مرضی اور فیصلے کے خلاف دم مارنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جبر ہے؛ کیا یہ کائنات خدا کے ارادے کے علاوہ ہر دوسرے ارادے سے خالی ہے؟ کیا انسان بھی ارادہ و عمل کی قوت سے محروم ہے؟ کیا ہم مشین کے بے جان پرزوں کی طرح خدا کی مشیت کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں اگر مطلقاً ہاں کہہ دیا جائے تو یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہوگا۔ قرآن سے خدا کا جو تصور ملتا ہے وہ جبر محض کی طرف ہماری رہنمائی نہیں کرتا بلکہ وہ کائنات میں ارادہ و اختیار کو ثابت کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ارادہ و اختیار کسی چیز میں کم ہو اور کسی چیز میں زیادہ۔ لیکن کوئی بھی چیز ارادہ و اختیار سے خالی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم اس کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے، لیکن اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے یہ صحیح نہ ہوگا کہ ہم اس کا انکار کردیں۔ قرآن کائنات میں اختیار کا دعویٰ کرتا ہے اس کے اس دعوی پر ہمیں حیرت ہوسکتی ہے، کیونکہ ہم کائنات میں فی الجملہ جبر کی حکمرانی دیکھتے ہیں آپ کہیں گے کہ نظامِ کائنات سیاروں کی گردش کے ساتھ وابستہ ہے اور وہ بظاہر کسی غیر مرئی قوت کے پوری طرح تابع ہیں۔ کیونکہ جس قانون میں وہ بندھے ہوئے ہیں، اس سے ذرہ برابر آزادی انہیں نصیب نہیں ہے تو پھر آزادی کیسی؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ تمہاری نظر کا فریب ہے، یہاں جس حد تک آپ جبر دیکھتے ہیں وہ اختیاری جبر ہے، اضطراری جبر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے سلسلے میں اس کا بیان ہے کہ:

فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا	خدا نے آسمان اور زمین سے کہا آؤ تم

وَّ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ڰ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ؀

(حم السجدہ ۱۱، ۱۲)

دونوں خوشی سے یا ناخوشی سے، تو ان دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے آتے ہیں تو اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب حکم جاری کیا ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت عطا کی اور اس کو ہر طرح سے محفوظ کر دیا۔ یہ زبردست علم و خبر رکھنے والی ہستی کا اندازہ ہے[1]

جبر کا فلسفہ خالص مادی فلسفہ ہے جو اختیار کی بالکلیہ نفی کرتا ہے۔ یہ فلسفہ خدا کے تصور سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ جبر کا فلسفہ بتاتا ہے کہ واقعات آپ سے آپ ظاہر ہو رہے ہیں۔ کوئی ارادہ اور شعور ان کے پیچھے نہیں ہے۔ پہاڑ سے جب چٹان لڑھکتی ہے تو ان چیزوں کو پیس دیتی ہے جو اس کی راہ میں آتی ہیں۔ اس میں نہ تو چٹان کا کوئی ارادہ شامل ہوتا ہے اور نہ جو چیزیں پستی ہیں اپنی مرضی سے پستی ہیں۔ اسی طرح واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو از خود وجود میں آ رہا ہے یہ کسی ارادے اور فیصلے کا پابند نہیں ہے۔ اس فلسفے کو اگر آپ صحیح مانتے ہیں تو خدا کی بہت سی صفات کا آپ کو انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ ہم ان صفات کا تصور ہی نہیں کر سکتے جب تک کہ خدا کی مخلوق کو ارادہ و عمل میں آزاد نہ مان لیں۔ ایک مثال لیجیے! قرآن کہتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے کی آزادی رکھتا ہے اور وہ واقعتہً گناہ کرتا بھی ہے۔ اگر انسان سے آزادی چھین لی جائے تو گناہ و ثواب کا تصور ہی بے معنی ہے۔ ظاہر ہے خدا اس وقت معاف کرتا ہے جب کہ انسان غلطی کرتا ہے۔ اگر انسان کے اندر غلطی کی استطاعت ہی نہیں ہے

---

[1] ان آیات کا عام طور پر جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ خدا کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے اور ساری کائنات اس کے حکم کے تابع ہے۔ مجھے فی نفسہ اس مفہوم سے اختلاف نہیں ہے لیکن الفاظ کسی بلند تر حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہوں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

تو خدا کی مغفرت کا بھی ظہور نہیں ہو سکتا۔[1]

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (الزمر : ۵۳)	میرے ان بندوں سے کہہ دو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ اللہ سارے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ بے شک وہ غفور ورحیم ہے۔

اس آیت میں ان بندوں کو معافی کی خوش خبری دی جا رہی ہے جنہوں نے "اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے"۔ یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ جن حدود کا انسان کو پابند دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کا جبراً پابند نہیں کر دیا گیا ہے، بلکہ انسان ان حدود کو توڑنے کی آزادی رکھتا ہے اور بسا اوقات ان کو توڑ بھی دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے جرم کو محسوس کرے اور خدا سے معافی چاہے تو خدا اس کو اپنے دامنِ مغفرت میں لینے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

ایک دوسری مثال لیجیے! قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے محبت بھی کرتا ہے

---

[1] غالباً اسی حقیقت کی طرف مسلم کی یہ حدیث ہماری راہنمائی کرتی ہے:

والذی نفسی بیدہ لو لم تذنبوا لذھب اللہ بکم ولجاء بقوم یذنبون فیستغفرون فیغفر لھم (کتاب التوبہ، باب سقوط الذنوب بالاستغفار والتوبہ)	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر دیتا اور تمہاری جگہ ایسے انسانوں کو لے آتا جو گناہ کرتے اور اس سے معافی چاہتے اور وہ ان کو معاف کرتا۔

مطلب یہ کہ خدا اپنی مغفرت کا مظاہرہ چاہتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہوتا کہ اس کی نافرمانی ہی نہ ہو تو دنیا کو بجائے انسانوں کے فرشتوں سے بھر دیتا اور یہاں عمل کی جو آزادی موجود ہے وہ موجود نہ ہوتی۔ اس لیے انسان کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کا خدا غفور ورحیم ہے اور اس کی غلطیوں کو معاف کرنے کے لیے ہر آن تیار ہے۔

اور ان سے خفا بھی ہوتا ہے۔ ان صفات کی حیثیت الفاظ بے معنی کی ہو جائے گی، اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم نہ کریں کہ انسان کے اندر ارادہ و عمل کی آزادی موجود ہے۔ کیونکہ یہ صفات ظاہر کرتی ہیں کہ اعمال دو طرح کے ہیں۔ بعض اعمال خدا کی خوشی کا سبب بنتے ہیں اور بعض کا ارتکاب خدا کو ناپسند ہے۔ انسان دو طرح کے اعمال کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور یہی اس کی آزادی کا مطلب ہے۔

اس سے پہلے ہم ثابت کر چکے ہیں کہ کائنات میں خدا کی صفات کا ظہور ہوا ہے خدا اپنے اندر جو اوصاف رکھتا ہے وہ اس کی مخلوق میں نمایاں ہیں[1] اس پہلو سے بھی آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کائنات میں ارادہ و عمل کی آزادی ہے، کیونکہ جب اس کا پیدا کرنے والا خدا ارادہ و اختیار کا مالک ہے تو اس میں بھی لازماً ارادہ و اختیار پایا جانا چاہیے۔ اگر آپ خدا کو ارادہ و اختیار سے متصف مانتے ہیں اور کائنات میں اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں تو آپ خدا کے لیے ایک ایسی صفت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کا مظاہرہ اس کی مخلوق میں کہیں نہیں ہو رہا ہے۔ گویا ہم خدا کو صاحب شعور کہتے ہیں اور خود شعور کا پوری کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے۔

انسان کی آزادی کا مفہوم

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے تو اس کے اندر آزادی ہونی چاہیے۔ یہ ایسی سادہ سی بات ہے جسے عقل آسانی سے قبول کر لیتی ہے۔ لیکن آپ سمجھنا چاہیں گے کہ انسان ارادہ و عمل میں آزاد ہے تو کیا وہ خدا کی مشیت کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے؟ اگر نہیں کر سکتا بلکہ وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے تو اس کی آزادی کے کیا معنی؟

یہ سوال بہت اہم ہے۔ قرآن کے مطالعے سے اس کا جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا ارادہ کلی ارادہ ہے اور انسان جزئی ارادہ رکھتا ہے۔ ارادۂ کلی سے کائنات کی کوئی بھی شے آزاد نہیں ہے۔ خود انسان پوری طرح اس کا پابند ہے۔ اس کے چاروں طرف خدا کے ارادۂ کلی کی حکومت ہے اور وہ اسی ارادہ کلی کے اندر اپنے جزئی ارادے کو استعمال کر رہا ہے۔ البتہ ہم اس کی تفصیلی کیفیت سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہم اپنے ارادۂ جزئی کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس ارادۂ کلی کا احاطہ نہیں

---

[1] دیکھیے "خدا کی صفات" کی بحث۔

کر سکتے۔ جس کی حکومت ہر ذرے پر قائم ہے۔

جس ارادۂ کلی کی ہر طرف زبردست حکمرانی ہے کیا ہم اس سے کسی بھی نوعیت کی آزادی کا تصوّر کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے پورے وجود پر ارادۂ کلی کا قبضہ ہو اور ہم خود اپنی مرضی سے کام انجام دے سکیں؟ یقیناً یہ ممکن ہے۔ ارادۂ کلی ارادۂ جزئی کے پورا ہونے میں مانع نہیں ہے۔ جزء کل کے تابع رہ کر اپنا عمل کر سکتا ہے۔ انسان اپنے ارادہ و عمل میں محدودیت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ وسیع اور لامحدود اختیار نہیں چاہتا بلکہ اس کے لیے محدود آزادی کافی ہے اور یہ اس کو حاصل ہے۔ انسان گو ارادۂ کلی کا تابع ہے لیکن اس سے اس کا اختیار سلب نہیں ہوا ہے۔ ارادۂ کلی کا پابند ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی مرضی پوری کر رہا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں زمین ہمیں اپنے ساتھ لیے ہوئے سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور اسی زمین پر ہم بھی اپنی ایک رفتار رکھتے ہیں۔ زمین کی گردش سے ہماری یہ رفتار ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک ہی وقت میں زمین کی گردش اور ہماری رفتار دونوں جاری ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ یا تصادم نہیں ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ جبر کی آڑ لے کر اپنی بے راہ روی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں قرآن ان کو جاہلِ محض سمجھتا ہے کیونکہ وہ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے خدا کی مشیت کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں جس کی سند خود اس کی اتاری ہوئی کتابوں میں کہیں موجود نہیں ہے۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ (الانعام : ۱۴۹)	جن لوگوں نے خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کر رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا یہاں تک کہ بالآخر انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھ لیا۔ ان سے کہو کیا تمہارے پاس خدا کی طرف سے کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے

سامنے پیش کرسکو۔ تم تو محض گمان کے پیچھے
چلے جارہے اور محض اٹکل سے کام لے رہے ہو۔

قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ وہ مجبور محض نہیں ہے۔ اس کو فکر و عمل کی جو قوتیں ملی ہیں ان کو وہ اپنی آزاد مرضی سے کام میں لا سکتا ہے۔ وہ ہدایت پانا چاہے تو اس پر ہدایت کی راہیں بند نہیں ہیں۔ ان پر چل کر وہ انسانیت کی بلند سے بلند منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لیے حق بھی اتنا ہی واضح ہے جتنا باطل واضح ہے۔ اگر وہ راستے سے بھٹکتا ہے تو خدا کی مشیت اس کو گمراہی اور ضلالت کی طرف نہیں لے جاتی۔ بلکہ وہ خود ہدایت پانا نہیں چاہتا۔ اس کے سامنے کامیابی کے امکانات ہوتے ہیں لیکن وہ جانتے بوجھتے ناکامی کو دعوت دیتا ہے۔ یہ اس کا اپنا قصور ہے جس کا الزام وہ خدا پر نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ خدا اس کے بارے میں اعلان کر چکا ہے۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ٥	ہم نے اس کو سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ اب چاہے وہ خدا کا شکر گزار بنے یا اس کا ناشکرا۔
(الدھر، ۳)	

انسان خدا سے بے نیاز نہیں ہے

یہاں ہمیں اس آزادی کی حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے جو انسان کو ملی ہے آزادی کا وجود احتیاج کی نفی ہے اور احتیاج کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آزادی کو چھین لیتی ہے اور پابند بنا دیتی ہے۔ غرض آزادی اور احتیاج دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اس لیے جب ہم انسان کو اپنے فکر و عمل میں آزاد مانتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے آپ یہ نتیجہ نہ اخذ کر لیں کہ وہ خدا کا بھی محتاج نہیں ہے۔

انسان کی آزادی کا یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ انسان کی آزادی خدا سے اس کے احتیاج کی نفی نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ اپنی آزادی کے باوجود خدا سے قطعاً بے نیاز نہیں ہے۔ یہاں دو چیزیں ہیں، انسان کا ارادہ اور پھر اس ارادے کے نتائج۔ انسان اختیار جس چیز پر رکھتا ہے وہ صرف اس کا اپنا ارادہ ہے۔ نتائج اس کے اختیار میں نہیں ہیں۔ بلکہ وہ پوری طرح خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ خدا کی قدرت کے بغیر اس کے کسی بھی ارادے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انسان کی آزادی خدا سے اس کو بے نیاز نہیں بناتی، بلکہ قدم قدم پر اس کو خدا کا محتاج ثابت کرتی ہے۔ اس کو

تفصیل سے سمجھنے کے لیے اس طرح غور کرنا پڑے گا کہ کائنات میں خدا کا قانون عام ہے۔ انسان صاف طور پر دیکھتا ہے کہ خدا کے قانون سے کوئی بھی چیز آزاد نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کی موت و حیات، بچپن، جوانی اور بڑھاپا، تندرستی اور بیماری سب کچھ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہے۔ یہ قوانین اس کی مرضی سے نہ ٹوٹتے ہیں اور نہ یہ اس کی مرضی سے بدل سکتے ہیں۔ یہ صورت حال اس کے مکمل احتیاج کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ انسان کسی بھی کام کرنے یا نہ کرنے کا اپنے اندر اختیار رپاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں آزادی کا شعور رکھتا ہے اور یہ شعور اتنا قوی ہے کہ کسی بھی حال میں وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی شعور اس کے تمام اعمال کی بنیاد ہے۔ وہ اپنے اس شعور کے تحت جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ایک متعین نتیجہ سامنے آتا ہے۔ وہ اصول صحت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور بیمار پڑجاتا ہے۔ دوا کھاتا ہے اور بیماری سے نجات پاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک آزاد فرد ہے۔ کیونکہ اصول صحت کو اس نے اپنی مرضی سے توڑا تھا اور دوا کے استعمال کرنے یا نہ کرنے میں اس کو اختیار حاصل تھا۔ لیکن جب وہ اسی معاملہ پر ایک دوسرے پہلو سے سوچتا ہے تو اپنے آپ کو بالکل آزاد نہیں پاتا۔ وہ یہ کہ اس کا بیمار پڑنا، دوا کھانا اور اچھا ہونا یہ ان قوانین سے بندھا ہوا ہے جو اس کی مرضی اور اختیار میں نہیں ہیں، بلکہ سراسر خدا کے اختیار میں ہیں، جس میں اس کی مرضی کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہے۔ انسان کو ایک باشعور ہستی مان کر آپ غور کریں گے تو یقیناً وہ آزاد ہے۔ لیکن جب آپ یہ دیکھیں گے کہ اس شعور کے نتائج ان قوانین کے تحت نکلتے ہیں جو یہاں کام کر رہے ہیں اور انسان ان قوانین سے ہٹ کر کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک بے اختیار وجود ہے۔ اس کا ہر عمل خدا کی قدرت کا محتاج ہے۔ خدا کی قدرت اس کا ساتھ نہ دے تو اس کا شعورِ آزادی ایک لاحاصل شے ہے۔ قرآن انسان کو آزاد اور ذمہ دار وجود اس لیے مانتا ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے خدا کے بنائے ہوئے قوانین اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ جنت کی طرف بڑھنا چاہے یا جہنم میں گرنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ بھلائی اور برائی میں سے جس کو چاہے اپنی آزاد مرضی سے اختیار کر سکتا ہے۔

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰىؕ فَاَمَّا مَنْ	یقیناً تمہاری کوششیں مختلف قسم کی ہیں
اَعْطٰى وَاتَّقٰىۙ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰىۙ	تو جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنا مال دیا

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿﴾ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰى ﴿﴾ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ﴿﴾ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿﴾

(الیل : ۷، ۱۰)

اور اس کا تقویٰ اختیار کیا اور بھلی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کی راہ آسان کر دیں گے آسان انجام کے لیے۔ لیکن جو بخل کرے اور خدا سے بے پروا ہوا اور بھلی بات کو جھٹلائے تو ہم اس کی راہ آسان کریں گے مشکل انجام کے لیے۔

کیا خدا کائنات کا محتاج ہے؟

اوپر کی بحث ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ کائنات خدا کی محتاج ہے۔ خدا کی قدرت سے کائنات وجود میں آئی ہے اور خدا ہی کی توجہ سے وہ باقی ہے۔ لیکن یہ بحث ہمارے سامنے ایک سوال کھڑا کرتی ہے وہ یہ کہ کائنات سے خدا کا یہ تعلق کیا خود خدا کی بھی احتیاج کی دلیل نہیں ہے؟ کیونکہ ہم صرف دو طرح کے تعلقات کا تصور کر سکتے ہیں۔ خالص جذباتی و نفسیاتی تعلقات اور رسمی اور قانونی تعلقات یہ دونوں قسم کے تعلقات احتیاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ بچہ اپنے وجود اور پرورش میں ماں باپ کا محتاج ہے تو ماں باپ اپنے خاص قسم کے جذبات کی تسکین کے لیے بچے کے محتاج ہیں محکوم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے حاکم کو چاہتا ہے تو حاکم اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے محکوم کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اب کائنات سے خدا کے تعلق کی نوعیت خواہ جذباتی ہو یا قانونی، اس سے خود اس کا احتیاج ثابت ہوتا ہے حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ خدا غنی ہے اور ہر ضرورت سے بے نیاز ہے۔ وہ ہر چیز کی علت ہے کوئی چیز اس کی علت نہیں ہے۔

لیکن یہ سوال کائنات سے خدا کے تعلق کی نوعیت نہ سمجھنے کی شکل ہی میں اٹھ سکتا ہے۔ انسان کا کسی بھی چیز سے تعلق اس کی ذاتی کمزوری یا احتیاج کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے۔ لیکن کائنات سے خدا کا تعلق اس کی کسی احتیاج کی بنا پر وجود میں نہیں آیا ہے، کیونکہ نہ تو خدا کی ذات میں کوئی نقص ہے اور نہ اس کی صفات میں۔ وہ ہر حاجت سے بلند اور ہر کمزوری سے ناآشنا ہے۔ وہ کائنات کا کسی بھی پہلو سے محتاج نہیں ہے اور کائنات ہر پہلو سے اس کی محتاج ہے۔ وہ غنی مطلق ہے۔ نہ تو کائنات کے وجود و بقا سے اس کی بے نیازی میں کوئی فرق آ سکتا ہے اور نہ کائنات کے زوال

فنا سے اس کی بے نیازی نیازمندی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اس نے کائنات کو پیدا کیا جب کہ کائنات اس کی کوئی ضرورت نہیں پوری کر رہی ہے۔ یہاں اس کے رحم و کرم کی بارش ہو رہی ہے حالانکہ وہ رحم و کرم پر مجبور نہیں ہے۔ کائنات سے خدا کا تعلق احتیاج کا تعلق نہیں ہے بلکہ فیض و احسان کا تعلق ہے۔ وہ کائنات پر مسلسل اپنا احسان کر رہا ہے اور اسی احسان کے نتیجہ میں وہ باقی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات پر ایک رحیم اور مہربان خدا کی حکومت ہے۔ جس جذبہ کے تحت خدا نے اس کائنات کو وجود دیا اور جس جذبہ کے ساتھ وہ اپنے عرش اقتدار پر جلوہ فگن ہے وہ جذبۂ رحمت ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو
وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ	اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان
ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ الرَّحْمٰنُ	میں ہیں چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر
فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا ۝	متمکن ہوا۔ وہ رحمٰن ہے پس تم پوچھ لو
(الفرقان: ۵۹)	اس کے بارے میں کسی خبر رکھنے والے سے

صحیح مسلم کی ایک روایت ہے، جسے اس آیت کی تشریح سمجھنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا جب اپنی مخلوق کو پیدا کر چکا تو اس نے ایک تحریر لکھی۔ یہ تحریر اس کے پاس عرش کے اوپر موجود ہے کہ:

"میری رحمت، میرے غضب پر چھائی ہوئی ہے"۔[۱]

خدا کی بے پایاں رحمت جو اس کائنات پر ہو رہی ہے وہ اس کی بے نیازی کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ بے نیازی کسی اعلیٰ صفت کی نفی نہیں کرتی، بلکہ بے نیازی کا ظہور بعض اعلیٰ صفات ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بے نیازی یہ نہیں ہے کہ کوئی آپ کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلائے اور آپ اس کی طرف سے رُخ پھیر لیں، بلکہ بے نیازی یہ ہے کہ وہ جو کچھ مانگے وہ دے دیں اور اس سے کوئی غرض وابستہ نہ رکھیں۔ کائنات خدا کی محتاج ہے اور وہ اس پر اپنا احسان کر رہا ہے، جب کہ خدا کی خدائی کے لیے اس کائنات کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

---

[۱] مسلم، کتاب التوبہ، باب رحمت اللہ وانہا تغلب غضبہ۔

انسان کے عمل سے خدا کی بے نیازی

خدا کی بے نیازی کو ہم نمایاں طور پر انسان کے معاملہ میں دیکھتے ہیں۔ خدا کے احسانات سے برے اور بھلے سب ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اس فرق کے بغیر اپنا احسان جاری رکھے ہوئے ہے کہ کون اس کا شکر ادا کرتا ہے اور کون ناسپاسی کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری سے نہ تو اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کے کفرو نافرمانی سے اس کا کوئی نقصان۔ خدا کی شانِ بے نیازی میں ذرہ برابر فرق نہیں آ سکتا خواہ انسان اطاعت کی روش اختیار کرے یا اس کا نافرمان ہو جائے۔ یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

" اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دے رکھا ہے لہذا تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب بے راہ ہو، سوائے اس شخص کے جس کو میں راہ دکھاؤں۔ پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو الّا یہ کہ میں کسی کو کھانا دوں پس تم سب مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم شب و روز گناہ کرتے رہتے ہو اور میں تمہارے گناہوں کو معاف کرتا رہتا ہوں۔ پس تم مجھ سے مغفرت چاہو میں تمہیں معاف کروں گا۔ اے میرے بندو! تم کبھی مجھے نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہو سکتے کہ مجھے نقصان پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! اگر ازاوّل تا آخر تمام جن و انس اس شخص کی طرح ہو جائیں جو ان میں سب سے زیادہ متقی ہے تو اس سے میرے اقتدار میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو سکتا اسی طرح ازاوّل تا آخر تمام جن و انس اپنے میں سب سے زیادہ فاجر شخص کی طرح ہو جائیں تو اس سے بھی میرے اقتدار میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں (میں ان کا محتاج نہیں ہوں) جن کو میں نے تمہارے لیے شمار کر رکھا ہے پھر ان کے مطابق تمہیں پورا پورا بدلہ دیتا ہوں۔ جو شخص ان اعمال میں بھلائی دیکھے تو خدا کی حمد کرے اور جس کو ان میں بھلائی نظر نہ آئے تو اپنے نفس ہی کو ملامت کرے (کیونکہ یہ اسی کی کوتاہی ہے)"[1]

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب تحریم الظلم۔

جزا وسزا کی حقیقت

یہاں آپ سوال کریں گے کہ خدا انسان کے اعمال سے بے نیاز ہے تو قرآن جزا وسزا کا تصور کیوں پیش کرتا ہے؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسے ہمارے اعمال سے دلچسپی ہے؟ خدا کا ہمارے اعمال سے خوش ہونا یا ناخوش ہونا کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ ان سے متاثر ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے آپ کو ایک خاص پہلو سے غور کرنا پڑے گا۔ خدا صاحب شعور ہے۔ اس لیے اس کی بے نیازی بے حسی کے ہم معنی نہیں ہے۔ بے نیازی اس کا ایک شعوری عمل ہے۔ اسی وجہ سے وہ خدا کی ایک اعلیٰ صفت سمجھی جاتی ہے اگر کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے واقعہ کو اس لیے اہمیت نہیں دے رہا ہے کہ وہ اس کا احساس ہی نہیں رکھتا تو یہ قابل تعریف بات نہیں ہے۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ پورے علم وآگہی کے باوجود کسی معقول وجہ سے اس کو اہمیت نہ دی جائے۔ خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ انسان اس کے سامنے سر جھکاتا ہے یا بغاوت اور نافرمانی کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کو اس کا شعور بھی نہیں ہے کہ کون اس کی مرضی پوری کر رہا ہے اور کون اس کی مخالفت میں لگا ہوا ہے۔ اگر ہم خدا کی بے نیازی کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ اس کو گالی دی جاتی ہے یا اس کی تعریف کی جاتی ہے تو گویا خدا پر بے حسی کا الزام لگاتے ہیں، حالانکہ خدا لطیف ترین احساسات کا مالک ہے۔ جتنی پاکیزہ صفات ہوسکتی ہیں ان سب سے وہ متصف ہے[1] خدا انسان کے صحیح رویے سے خوش ہوتا ہے اور غلط رویے سے

---

[1] اس حقیقت کی طرف احادیث میں اشارے موجود ہیں۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

ما من احدٍ اغیر من اللہ من اجل ذٰلک حرّم الفواحش وما احدٌ احبّ الیہ المدحُ مِنَ اللہِ — اللہ سے زیادہ کوئی غیرتمند نہیں ہے اسی وجہ سے اس نے بے حیائی کے تمام کاموں کو حرام قرار دیا۔ کسی بھی شخص کو اپنی تعریف اتنی پسند نہیں ہے جتنی کہ خدا کو اپنی تعریف پسند ہے اسی لیے اس نے خود ہی اپنی تعریف کی ہے۔

(بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ، مسلم، کتاب التوبۃ)

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ہے: ان اللہَ تعالیٰ یغارُ وغیرۃُ اللہِ اَن یّاتیَ المؤمنُ ماحرّمَ اللہُ (اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے۔ اس کی غیرت یہ ہے کہ مومن ان اعمال کا ارتکاب کرے جن کو اس نے حرام کر رکھا ہے۔ حوالہ سابق)

اس کو اذیت پہنچتی ہے یہ اس کے صاحبِ شعور ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ اور اس کی بے نیازی یہ ہے کہ وہ انسان کا قطعاً محتاج نہیں ہے۔ انسان کا کوئی بھی عمل اس کی حیثیت اور مرتبہ و مقام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

اِنْ تَکْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنْکُمْ وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ وَاِنْ تَشْکُرُوْا یَرْضَہُ لَکُمْ۔ (الزمر: ۷)

اگر تم کفر کرتے ہو تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ خدا تم سے بے نیاز ہے (لیکن) وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کی روش کو پسند (بھی) نہیں کرتا اور اگر تم شکر کی روش اختیار کرتے ہو تو اس روش کو خدا تمہارے لیے پسند کرتا ہے

اِنْ تَکْفُرُوْا وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ (ابراھیم: ۸)

اگر تم اور زمین کے سارے انسان کفر کرتے ہیں تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ وہ تم سے بے نیاز اور بذات خود ستودہ صفات ہے۔

خدا نے اپنی مخلوق کو شعور اور ارادے کے تحت پیدا کیا ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ شعور اور ارادے کے پیچھے خواہش اور محبت ہوتی ہے۔ آپ جو کام کرتے ہیں اگر تجزیہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ اسی وجہ سے آپ اپنے کام کو برے نتیجہ دیکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے آپ کی محبت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ایک مصنف اپنی تحریر کو قدر کی نگاہ سے اس لیے دیکھتا ہے کہ اس میں اس کے جذبات محبت شامل ہوتے ہیں۔ بچہ مٹی کا گھروندا بناتا ہے اگر آپ اسے ٹھوکر لگا کر توڑ دیں تو چیخ اٹھے گا کیونکہ اس کی ایک محبوب چیز کو آپ نے برباد کر دیا۔ اسی طرح خدا کو بھی اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ کیونکہ اس کے ارادے نے مخلوق کو وجود دیا ہے۔ انسان خدا کی مرضی کے خلاف کام کرتا ہے تو خدا کی محبت غضب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسان کے ساتھ خدا کا تعلق اصلاً محبت اور رحمت کا تعلق ہے لیکن انسان اپنی غلط روش سے اس کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ احادیث میں انسان کے ساتھ خدا کی محبت اور نفرت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث ہے۔

لَیْسَ اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی

کسی تکلیف دہ بات کو سن کر خدا سے زیادہ

سَمِعَهٗ مِنَ اللّٰهِ اِنَّهُمْ لَيَدْعُوْنَ لَهٗ وَلَدًا وَاِنَّهٗ يُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ [1]

صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کے بندے اس کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں اور وہ ان کو عافیت عطا کرتا ہے اور رزق دیتا ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے روایت کرتے ہیں:

يُؤْذِيْنِىْ اِبْنُ اٰدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ [2]

ابن آدم مجھے اذیت پہنچاتا ہے، وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے۔ حالانکہ زمانہ میں ہوں (کیونکہ) میرے ہاتھ میں شب و روز کی گردش ہے۔

ایک اور حدیث میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

اَللّٰهُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ اَحَدِكُمْ يَجِدُ ضَالَّتَهٗ وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَىَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَىَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَاِذَا اَقْبَلَ اِلَىَّ اَقْبَلْتُ اِلَيْهِ اُهَرْوِلُ [3]

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ تم میں کا کوئی شخص اس وقت خوش ہوتا ہے جب کہ اس کی سواری کسی چٹیل میدان میں گم ہو جائے اور وہ پھر اس کو پالے۔ جو شخص مجھ سے ایک بالشت بھر قریب ہو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہو میں اس سے ایک گز قریب ہوتا ہوں۔ جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر پہنچتا ہوں۔

یہ حدیثیں بتاتی ہیں کہ شرک اور کفر سے خدا کو تکلیف ہوتی ہے لیکن وہ صبر کر رہا ہے اور انسانوں پر اپنا احسان جاری رکھے ہوئے ہے۔ خدا ہر واقعہ کا سبب ہے لیکن جب انسان خدا کو سبب

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الصبر والاذیٰ۔ [2] مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرہا۔
[3] مسلم، کتاب التوبۃ۔

نہیں مانتا اور زمانے کو واقعات کا سبب قرار دیتا ہے، تو خدا اس سے اذیت محسوس کرتا ہے ایسان جب اپنی بدعملیوں سے توبہ کرتا ہے اور خدا کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو خدا بے انتہا خوش ہوتا ہے اور آگے بڑھ کر اسے اپنی رحمت میں لیتا ہے۔

شعور، محبت اور نفرت کا سرچشمہ ہے کسی واقعہ کی اچھائی یا برائی کو محسوس کرنے کا نام محبت یا نفرت ہے۔ جزا و سزا کی محبت اور نفرت کا ایک عملی ظہور ہے۔ اگر ہم مانتے ہیں کہ خدا صاحب شعور ہے اور وہ انسانوں سے محبت اور نفرت کا تعلق رکھتا ہے تو جزا و سزا کے تصور کو قبول کرنے میں ہمیں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ خدا کی محبت بے فائدہ ہے اگر اس کے نتیجے میں انعامات کی بارش نہ ہو۔ اسی طرح اس کی نفرت اس کے عذاب کا سبب نہیں ہے تو پھر کیوں انسان خدا سے ڈرے اور اس کی محبت کی تمنّا کرے۔

فصل پنجم

خدا کیا چاہتا ہے؟

خدا کو ماننے کے بعد انسان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی مرضی کیا ہے کہ انسان اس کو پورا کرے، وہ کس کام کا حکم دیتا ہے کہ انسان اسے بجا لائے اور کس کام سے منع کرتا ہے کہ انسان اس سے باز رہے؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی جس میں خدا کی مرضی لکھی ہوئی ہو، اور نہ پیدا ہونے کے بعد براہ راست خدائے تعالیٰ اسے بتاتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا؟ پھر وہ کیسے اس کی اطاعت کرے؟ وہ کونسا ذریعہ ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ خدا کی مرضی کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

چند بنیادی حقیقتیں

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے چند بنیادی حقیقتوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۱۔ اصولی طور پر ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ کائنات ایک وحدت ہے اور اس کے کسی بھی حصّہ کو دوسرے حصّے سے الگ نہیں کیا جا سکتا[1]

۲۔ انسان اس وسیع کائنات کا ایک جزء ہے اور جزء ہمیشہ کل کے تابع ہوتا ہے۔ کل ہی سے جزء کو زندگی ملتی اور اس کی صحیح قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ جزء کو کل سے الگ کرنے کے بعد ایک تو جزء کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے اس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ اگر آپ مشین سے اس کا کوئی پرزہ جدا کر دیں تو اس کی حرکت رک جائے گی

---

[1] ملاحظہ ہو اسی کتاب کی بحث "خدا ایک ہے۔"

اور اس کی حیثیت محض لوہے یا تانبے کے ایک ٹکڑے کی رہ جائے گی۔ لیکن اگر آپ اسے پوری مشین کے اندر رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ "زندہ" ہے اور مشین کے ایک جزء کی حیثیت سے بہت بڑا کام انجام دے رہا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کائنات کے جزء کی حیثیت سے زندہ ہے اور اسی حیثیت سے اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ کائنات کے جزء کی حیثیت سے زندہ ہے اور اسی حیثیت سے اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ کائنات سے الگ ہونے کے بعد اس کا وجود بھی مٹ جائے گا اور اس کی کوئی اہمیت بھی باقی نہیں رہے گی۔

۳۔ مذکورہ بالا حقیقت کو ماننے کے بعد آپ اس مختصر سوال پر غور نہیں کر سکتے کہ خدا انسان سے کیا چاہتا ہے ؟ بلکہ اس کے لیے آپ کو ایک وسیع تر سوال پر غور کرنا ہوگا وہ یہ کہ خدا اس کائنات میں کیا چاہتا ہے ؟ کیونکہ جزء کے بارے میں آپ کا غور و فکر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ آپ کل کے بارے میں اپنا غور و فکر مکمل نہ کر لیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ انسان کے کسی عضو کے متعلق سوچنا چاہیں تو آپ کو اپنی فکر کا آغاز اس بنیاد پر کرنا ہوگا کہ وہ انسانی جسم کا ایک حصہ ہے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ پورے نظام جسمانی میں اس کا کیا مقام ہے اور وہ کونسا کام انجام دے رہا ہے ؟ اس کے بعد ہی آپ اس کے بارے میں صحیح نتیجہ تک پہونچ سکیں گے لیکن اگر آپ اسے انسانی جسم کا ایک حصہ نہ مانیں اور مانیں تو اسے نظام جسمانی سے الگ کر کے دیکھیں تو اس کے متعلق آپ جو بھی رائے قائم کریں گے وہ یقیناً غلط رائے ہوگی۔ لہٰذا پوری کائنات میں خدا کی مرضی معلوم کیے بغیر انسان کے بارے میں اس کی مرضی معلوم کرنا ممکن نہیں ہے۔

۴۔ انسان جزء کائنات ہے۔ اس لیے عقل کا صریح تقاضا ہے کہ اس کی زندگی کا ٹھیک وہی مقصد ہونا چاہیے جو پوری کائنات کا مقصد ہے اور اسے اسی راہ پر چلنا چاہیے جس پر کائنات چل رہی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ جزء کا مقصد کل کے مقصد سے ٹکرا رہا ہو اور جس کام میں کل مصروف ہو جزء اس سے مختلف کام انجام دے رہا ہو، لہٰذا انسان فطری طور پر ایسے عقائد و نظریات کا محتاج ہے جن کی تائید کائنات کے ہر گوشہ سے ہو۔ اسے ایسا نظام حیات چاہیے جو نظام کائنات سے ہم آہنگ ہو اور اسے ایسے قوانین کی ضرورت ہے جو قوانین کائنات سے مطابقت رکھتے ہوں۔

۵۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ خدا اس کائنات میں جو چاہتا ہے وہی وہ

انسان سے بھی چاہتا ہے۔ جس دن انسان کی روش کائنات کی روش سے ہم آہنگ ہوجائے گی خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری ہونے لگے گی اور وہ انسان سے خوش ہوجائے گا۔ اس کا ثبوت انسان کے ظاہر اور باطن دونوں میں موجود ہے۔ البتہ اس کو سمجھنے کے لیے ایک خاص پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

خدائے تعالیٰ کائنات کو ٹھیک اپنی مرضی کے مطابق چلا رہا ہے۔ یہاں ہر طرف اسی کے بنائے ہوئے قوانین کام کر رہے ہیں۔ اور کہیں اس کی حکم عدولی نہیں ہوتی۔ کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اس کا ارادہ ہر چیز کی علت ہے۔ کوئی بھی واقعہ اس وقت تک وجود میں نہیں آتا جب تک کہ اس کے پیچھے خدا کی مرضی موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے اور اسی میں اس کا امتحان بھی ہے۔ آپ کی نگاہ جہاں تک پہنچ سکتی ہے وہاں تک دیکھیے آپ کو نظر آئے گا کہ جس چیز کو قدرت نے جس جگہ رکھا ہے وہ اسی جگہ موجود ہے۔ اپنے اختیار سے اسے بدل نہیں سکتی۔[۱] لیکن انسان کا مقام اس کی اپنی مرضی کے تابع ہو۔ ہوا میں اڑنے والے پرندے اپنی رفتار بدلنے پر قادر نہیں ہیں لیکن انسان کو کسی رفتار کا پابند نہیں بنایا گیا ہے یہی نہیں بلکہ خشکی و تری پر اس کو تصرف حاصل ہے اور بے شمار چیزیں اس کے خود مختارانہ استعمال میں دے دی گئی ہیں، جس کی وجہ سے اس کی آزادی ایک زبردست قوت میں تبدیل ہوگئی ہے اور پھر اسے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود ہی راہ تلاش کرے اور خود ہی منزل پر پہنچے۔ جس روز خدا نے اس کے اندر آزادی کی روح پھونکی اسے اختیار دے دیا کہ چاہے وہ اس کا اطاعت گزار رہے یا اس سے بغاوت کردے۔

پوری کائنات کا خدا کے احکام کا پابند ہونا اور انسان کی زندگی میں آزادی پایا جانا، خدا کی مرضی کو صاف ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس مقصد کو قبول کرلے جو اس کائنات کا مقصد ہے اور ان قوانین اور ضابطوں کو بخوشی اپنی زندگی میں نافذ کرے جو ساری

---

[۱] پچھلے باب میں ہم ثابت کر چکے ہیں کہ کائنات میں جہاں ارادہ و اختیار ہے وہاں جبر بھی ہے لیکن یہ جبر اضطراری نہیں اختیاری ہے۔

کائنات میں نافذ ہیں۔ جب کائنات خدا کے حکم کے تابع ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کا غلام ہونا چاہیے۔ انسان کا صحیح مقام یہ ہے کہ اس اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے جو پوری کائنات پر قائم ہے اس سے وہ ایک عظیم کل کا بہترین جزو بن جائے گا۔ لیکن اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ جو بھی روش اختیار کرے گا وہ قطعاً کائنات کی روش سے ہم آہنگ نہ ہوگی اور انسان کائنات کے ایک جزء کی حیثیت سے عمل نہیں کر سکے گا۔

اب آپ انسان کی ذات پر غور کیجیے بلاشبہ اسے کسی خاص طریقۂ حیات کا پابند نہیں بنایا گیا ہے بلکہ جو طریقہ مطلوب ہے اس کے خلاف عمل کی اس کو آزادی حاصل ہے، لیکن یہ آزادی انسان کو ایک بہت ہی محدود دائرہ میں ملی ہے اور اس دائرہ سے باہر کائنات میں پھیلے ہوئے قوانین ہی اس کی ذات پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے بہت بڑے حصے میں اُن ہی ضابطوں کا پابند ہے جن کے تحت خدائے تعالیٰ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس کا وجود اجزائے کائنات سے ترکیب پاتا ہے۔ کائنات کی گردش اس کو بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک کے مختلف مراحل سے گزارتی ہے، اس کی موت وحیات، اس کا عروج وزوال، اس کی بیماری و تندرستی غرض ایک دو نہیں بے شمار معاملات میں اس پر قوانینِ کائنات کی حکومت ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ اس کی آزاد زندگی کے لیے بھی ان ہی قوانین کی ضرورت ہے جو پوری کائنات میں نافذ ہیں تاکہ وہ کائنات سے پوری طرح جڑ کر اس کا جزء کامل بن جائے۔ اگر وہ اپنے اوپر ان قوانین کے نفاذ کو پسند نہیں کرتا ہے تو بالکل صاف بات ہے کہ اس کی زندگی میں دورنگی اور تضاد پیدا ہو جائے گا۔ ایک حصہ میں قوانینِ کائنات کی حکومت ہوگی اور دوسرے حصے میں ان سے انحراف پایا جائے گا۔ اس طرح وہ جبراً نظام کائنات کا جزء رہتے ہوئے بھی اس سے کٹ جائے گا۔ ظاہر ہے جو چیز نظام کائنات سے کٹ جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہاں بقا اور کامیابی صرف اسی چیز کے لیے ہے جس کی رفتار کائنات کی رفتار سے مل کر بالکل ایک ہو جائے۔

انسان کی احتیاج

یہاں آپ سوال کریں گے کہ کیا انسان اس مقصد کو سمجھ سکتا ہے جو تخلیق کائنات کے پیچھے موجود ہے؟ کیا وہ ان اصول و قوانین کو جان سکتا ہے جو کائنات میں کام کر رہے ہیں؟ اس سوال کا غالباً ایک ہی جواب دیا جا سکتا ہے اور

وہی اس کا صحیح جواب بھی ہے وہ یہ کہ اس وسیع کائنات کا پوری طرح سمجھنا، اس کے قوانین اور حکمتوں کو معلوم کرنا انسان کے بس سے باہر ہے۔ وہ کسی طرح جان نہیں سکتا کہ کائنات کا انتظام کس ڈھنگ کا ہے، یہاں عروج وزوال کے کیا ضابطے ہیں اور خدائے تعالیٰ انہیں کس طریقے سے چلا رہا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ خدا نے اس کائنات کو ایک بہت ہی واضح مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، لیکن یہ مقصد کیا ہے اور کائنات اس مقصد کو کیسے پورا کر رہی ہے، اس کی ابتدا کیا ہے اور کب یہ فنا ہو جائے گی؟ یہ اور ایسے بہت سے بنیادی مسائل ہیں جن کے بارے میں انسان بالکل تاریکی میں ہے۔ کائنات خدا کی مرضی اور اس کے ارادے سے بھری ہوئی ہے لیکن انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی مرضی کو خود سے دریافت کرلے اور اس کے ارادے کو براہ راست سمجھ جائے اس کے لیے ایٹم کے باریک سے باریک ذرّات کا مشاہدہ کرنا ممکن ہے لیکن لوحِ کائنات پر خدا کی مرضی کا پڑھنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کہ خدائے تعالیٰ کائنات میں کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا، بہت وسیع علم کی ضرورت ہے۔ جب کہ انسان کا علم انتہائی محدود اور ناقص ہے۔ اس کے سامنے کسی بھی وقت پوری کائنات نہیں ہوتی بلکہ کائنات کے صرف چند گوشے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے حقیقت کو وہ ہمیشہ ناقص اور ادھوری شکل میں دیکھتا ہے۔ وہ کائنات کی صرف چند چیزوں سے واقف ہے حالانکہ خدا کی مرضی دو ایک یا چند چیزوں میں مرتکز نہیں ہے بلکہ وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے اس نے پوری کائنات میں پھیلا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے محدود علم اور ناقص مطالعہ سے کبھی اس مقام پر پہنچ نہیں سکتا کہ خدا کی مرضی اس پر کھل جائے اور وہ اس کی خوشی و ناخوشی سے آگاہ ہو جائے۔

لیکن اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مطالعۂ کائنات سے خدا کی مرضی بالکل معلوم نہیں کی جاسکتی۔ بے شک کائنات پر غور وفکر کے ذریعہ جس طرح انسان کے اندر خدا کے وجود کا مجمل سا یقین ابھرتا ہے اسی طرح کسی نہ کسی درجے میں وہ خدا کی مرضی کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس غور وفکر سے نہ تو خدا کی ذات وصفات کا اسے تفصیلی تعارف حاصل ہوتا ہے اور نہ خدا کی مرضی پوری طرح اس کے سامنے جلوہ گر ہوتی ہے۔ خدا کو ماننے کے بعد جس اہم سوال سے ہم دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ زندگی کو کیسے خدا کی مرضی کے تابع بنا دیں اور اس کے مکمّل مطیع وفرماں بردار بن جائیں؟

اس کے لیے خدا کی مرضی کا مجمل تصور یا اس کی ایک جھلک کافی نہیں ہے بلکہ ایسی روشنی کی ضرورت ہے جس کی مدد سے انسان قدم قدم پر دیکھ سکے کہ خدائے تعالیٰ کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا اس کی خوشی کن کاموں میں ہے اور وہ ناخوش کن چیزوں سے ہوتا ہے ؛ تاکہ پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ وہ خدا کی اطاعت کر سکے ۔ لیکن افسوس کہ کائنات کا مطالعہ انسان کے اندر اس روشنی کے پیدا کرنے سے قاصر ہے ۔ یہ کائنات ایک ایسی تحریر ہے جس میں خدا کی مرضی لکھی ہوئی ہے ۔ انسان اس تحریر کا صرف اجمالی شعور حاصل کر سکتا ہے ، تفصیلی مطالعہ نہیں کر سکتا ۔ خدا کی خوشی و ناخوشی اس کائنات میں نغمہ بن کر گونج رہی ہے ، انسان اس کی ہلکی سی آواز تو سن سکتا ہے لیکن اسے پوری طرح سمجھ نہیں سکتا ۔ ہر طرح کے ساز و سامان سے بھری ہوئی اس کائنات میں انسان بہت ہی بے بسی کے مقام پر کھڑا ہے کہ اس کی زندگی میں جو حق نمایاں ہونا چاہیے اس حق کا سراغ وہ خود سے نہیں لگا سکتا ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ اس پر حق کھول دے تو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے کہ ساری کائنات اسی حق پر قائم ہے اور اسی کی وجہ سے زندہ ہے ۔

قرآن کی راہنمائی

قرآن کے ذریعہ خدا نے وہ راہ واضح کی ہے جس پر یہ کائنات چل رہی ہے ، اس کے نزدیک "اسلام" کائنات کا دین ہے ۔ جب کوئی چیز خدا کی اطاعت کے جذبے سے سرشار ہو اور پوری طرح خدا کے سامنے جھک جائے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اندر "اسلام" ہے ۔ کائنات اسی کیفیت کے ساتھ گردش کر رہی ہے اور بے چون و چرا خدا کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے ۔ اس لیے اس کا راستہ "اسلام" کا راستہ ہے ۔ جس طرح خدا کے بغیر ہم کائنات کا تصور نہیں کر سکتے ؛ اسی طرح اس بات کا بھی تصور نہیں کر سکتے کہ خدا موجود ہو اور کائنات میں اس کا حکم نہ چلے ۔ وہ کوئی بات کہے اور اس کی اطاعت نہ کی جائے ۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُوْنَ ٥	آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں اسی کی ہیں اور سب کی سب اس کی اطاعت گزار ہیں ۔
(الروم : ۲۶)	

انسان سے خدا کا مطالبہ

خدائے تعالیٰ انسان سے بھی یہی چاہتا ہے کہ وہ اپنی آزادی سے دست کش ہو جائے اور ہر معاملہ میں اس کا

تابعِ فرمان بن جائے۔ "اسلام" اس کی زندگی میں پھوٹ پڑے اور وہ مجسم اطاعت اور سراپا تسلیم و رضا بن جائے۔ بندگی کی جو روح کائنات کے ذرہ ذرہ میں دوڑ رہی ہے وہ اس کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگے۔ جس طرح کائنات خدا کے گن گا رہی ہے اسی طرح وہ بھی اس کی حمد و تسبیح میں مشغول ہو جائے۔ وہ اپنے اختیار کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے، خدا اسے جس وقت جو حکم دے وہ بجا لائے اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جائے۔ وہ خدا کے سامنے اس طرح بچھ جائے جس طرح اس کا سایہ زمین پر بچھا ہوا ہے۔ اس کے دل میں اسی کا خوف ہو، اسی سے وہ محبت کرے، اسی کو بڑا مانے اور اپنی موت و حیات کا اسی کو مالک سمجھے، وہ جس کا دوست ہو اس کا دوست بن جائے، اور وہ جس کا دشمن ہو اس سے اپنا تعلق توڑ لے۔ وہ کائنات میں اس طرح تصرف کرے جس طرح تصرف کا خدا نے اسے حکم دیا ہے۔ وہ یہاں کی ایک چیز کو امانت سمجھے اور خدا کی مرضی کے مطابق اسے کام میں لائے، وہ اسی کے قانون کو قانون سمجھے اور اپنے تمام معاملات میں اس کا پابند ہو جائے۔ غرض یہ کہ جو آزادی اسے ملی ہے اسے چھوڑ کر خوشی سے خدا کی غلامی کا طوق پہن لے اور اپنے آپ کو اس کی تابع داری میں فنا کر دے، جب انسان اس طرح فنا ہو جاتا ہے تو اسے وہ "حق" ملتا ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔

انسان کے لیے صحیح ترین دین وہی ہو سکتا ہے جو کائنات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ اسلام کائنات کا دین ہے۔ جب وہ انسان کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو انسان کائنات کے ساتھ مل کر کام کرنے لگتا ہے اور کائنات اس کی ہم سفر بن جاتی ہے۔ دونوں کا رخ ایک ہوتا ہے اور دونوں ایک راہ پر چلتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ انسان جو بھی دین اختیار کرے وہ دینِ کائنات سے مختلف ہوگا اور انسان پوری کائنات سے کٹ جائے گا۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ○ (آل عمران : ۸۳)	کیا اللہ کے دین کے سوا کوئی دوسرا دین یہ ڈھونڈھتے ہیں حالانکہ خوشی سے یا جبراً اسی کی اطاعت کر رہے ہیں وہ سب کے سب جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں اور وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

انسان کی صحیح حیثیت

اس کائنات میں انسان کی صحیح ترین حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کا غلام ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اس کی کوئی دوسری حیثیت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے اس کی کامیابی کا راستہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے تمام معاملات میں خدا کی غلامی کرے اور اس کا بندہ بن جائے۔ خدا نے انسان کو آزادی دی ہے اور یہ ایک بڑی دولت ہے۔ یہ امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے کہ اسے جس منزل تک پہنچنا ہے اپنی مرضی سے پہنچنا ہے۔ اسی وجہ سے اس کا مقام بھی اونچا ہے۔ کیونکہ جو چیز آزادی سے محروم ہو، اس کی ترقی طبعی طور پر ایک خاص حد پر رک جاتی ہے، اس سے آگے نہیں بڑھتی لیکن آزادی نے انسان کو یہ موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنے اختیار سے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آزادی نے اس کے لیے ایک زبردست خطرہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ اپنی آزادی کو غلط طریقے سے کام میں لائے تو منزل سے بھٹک جائے گا۔ اس کا منزل تک پہنچنا اس بات پر منحصر ہے کہ وہ آزادی کو صحیح طریقے سے استعمال کرے۔ خدا نے آزادی کے استعمال کے لیے کچھ اصول اور حدود و آداب مقرر کر دیے ہیں۔ اسی کو قرآن "اسلام" سے تعبیر کرتا ہے۔ جب "اسلام" کسی شخص کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی آزادی کے حدود متعین ہو جاتے ہیں۔ انسان اپنی نادانی سے ان حدود کی پابندی میں اپنے لیے حرج اور تنگی محسوس کرتا ہے، حالانکہ یہ اس کی ترقی کا زینہ ہیں اور ان کی خلاف ورزی خود اس کے حق میں تباہ کن ہے۔ ان حدود کی پابندی سے اس کی شخصیت اسی طرح ابھرتی اور نشو و نما پاتی ہے جس طرح زمین سے چمٹا ہوا درخت ابھرتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ کسی پھیلے ہوئے دریا کا راستہ آپ متعین کر دیں تو اس کی روانی بڑھ جائے گی۔ یہی حال خدا کے مقرر کردہ حدود کا ہے۔ ان سے انسان کی خوبیاں نکھرتی اور جلا پاتی ہیں اور وہ پوری قوت کے ساتھ کمال کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ان سے اس کی صلاحیتیں ضائع نہیں ہونے پاتیں بلکہ اس پر ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ قرآن کو شکایت ہے کہ ان حدود کے ذریعہ خدا انسان کو ہرگز کسی زحمت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا لیکن انسان ان کو اپنے لیے عذاب سمجھتا ہے۔

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ	اللہ تعالیٰ تم پر تنگی عائد کرنا نہیں چاہتا
مِنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ	بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (المائدہ : ٦)	اور اپنی نعمت کو تم پر مکمل کر دے تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

خدا کی غلامی انسان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک جائے۔ خدا کی غلامی سے انسان کا وقار بلند ہوتا ہے اور اس کے اندر عظمت اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی غلامی انسان کی معراج ہے اور خدا سے بغاوت اس کو بلندی سے پستی میں پھینک دیتی ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر چیز اپنا ایک مقصد رکھتی ہے، اگر وہ اس مقصد کو پورا کرتی ہے تو کامیاب ہے ورنہ ناکام۔ ٹھیک اسی طرح انسان خدا کی غلامی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس مقصد سے پھر جائے تو اس کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ خدا کی غلامی سے انکار کے بعد انسان کی اصل حیثیت بدل جاتی ہے اور کسی چیز کی اصل حیثیت کا بدل جانا اس کی موت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ (الحج : ۱۸)	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ کو سجدہ کرتی ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور بہت سے انسان بھی اس کو سجدہ کرتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر خدا کا عذاب ثابت ہو چکا ہے اور (واقعہ یہ ہے کہ) جس کو اللہ پستی میں ڈال دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور بلاشبہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اسلام راہِ عدل ہے

اسلام عدل کی راہ ہے۔ اسے چھوڑ کر انسان ظلم کا مرتکب ہوتا ہے ظلم کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام سے ہٹا دیا جائے اس کے برعکس "عدل" کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھا جائے۔ قرآن خدا کی بندگی کو "عدل" سے تعبیر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ انسان کی آزادی کا صحیح ترین مصرف ہے۔

اور جب انسان خدا سے بغاوت کرتا ہے تو اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَ اَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّ ادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ (الاعراف : ۲۹)	ان سے کہو کہ میرے رب نے عدل و انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ہر عبادت کے وقت اپنا رخ سیدھا رکھو اور پکارو اس کو خالص اس کے فرماں بردار ہو کر۔

"قسط" عدل و انصاف کو کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "قسط" سے مراد یہاں "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک ماننا اور اس کی اطاعت کرنا ہی وہ عدل ہے جس کا خدا نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے۔ اس کی تشریح گویا بعد کے ٹکڑے میں کی گئی ہے کہ خدا کی بندگی اور اس کی غلامی پورے اخلاص کے ساتھ کی جائے۔ کیونکہ جس عمل میں شرک کی آمیزش ہو جائے وہ خدا کے دربار سے رد ہو جاتا ہے۔ مفسر خازن کہتے ہیں:

فالامر بالقسط فی هذه الآية يشتمل على معرفة الله تعالىٰ بذاته وصفاته وافعاله وانه واحد لاشريك لهٗ	اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے اعمال کی معرفت "قسط" کے حکم میں شامل ہے اور یہ جاننا بھی اس میں شامل ہے کہ وہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

قرآن نے کتاب کے ساتھ "میزان" کا ذکر بھی کیا ہے جو عدل کی نشانی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَ الْمِیْزَانَ (الشوریٰ: ۱۷)	اللہ نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی اور میزان اتاری۔

میزان کی تشریح میں علامہ سید محمود آلوسی فرماتے ہیں:۔

الميزان ای العدل ۔۔۔ اوالشرع الذی توزن به الحقوق ويسوی	میزان کا مطلب عدل و انصاف ہے ۔۔۔۔ یا اس سے مراد شریعت ہے جن سے

---

[1] لباب التاویل فی معانی التنزیل جلد ۲ ص ۱۸۳۔

بین الناس [1] — حقوق تولے جاتے ہیں اور لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک معاملہ کیا جاتا ہے۔

خدا نے اپنے بندوں کے لیے ایک "میزان" نازل کی ہے۔ یہ اس کا دین اور اس کی شریعت ہے۔ یہ وہ قانونِ عدل ہے جس سے انسان کو متوازن نظریۂ حیات ملتا ہے، جس سے اس کے معاملات میں اعتدال پیدا ہوتا ہے اور جس سے اس کے حقوق و مفادات محفوظ رہتے ہیں۔ جو قانون خدا کے قانون سے ٹکرائے یقیناً وہ ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہوگا۔ اس پر چل کر انسان کبھی بھی عدل و انصاف نہیں پا سکتا۔ خدا کے پیغمبر دنیا کے سامنے یہی قانونِ عدل پیش کرتے ہیں، تاکہ دنیا سے ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ ہو اور انسان اپنے تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید:)

ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ای بالحق والعدل وھو اتباع الرسل فی ما اخبروا بہ و طاعتھم فی ما امروا بہ فان الذی جاؤا بہ ھو الحق الذی لیس وراءہ حق [2]

"تاکہ لوگ قسط پر قائم رہیں" یعنی حق و عدل پر قائم رہیں اور وہ ہے رسولوں کی بتائی ہوئی تعلیمات کا اتباع اور ان کے احکام کی اطاعت، اس لیے کہ جو دین وہ خدا کے پاس سے لائے ہیں حق وہی ایک ہے۔ اس کے سوا کہیں حق کا وجود نہیں ہے۔

خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

---

[1] روح المعانی، جزء ۲۵ ص ۲۶۔ [2] تفسیر ابن کثیر، جلد ۴ ص ۳۱۴۔

فانہ یحکم بالعدل وھو الشرع والشرع ھوالعدل و لھذا یامر نبیہ ان یحکم بما انزل اللہ والذی انزل اللہ ھوالقسط والقسط ھوالذی انزل اللہ۔[1]

وہ انصاف کے ساتھ یعنی شریعت کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انصاف شریعت کا اور شریعت، انصاف کا دوسرا نام ہے، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو کہیں عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کا حکم دیتا ہے اور کہیں کہتا ہے کہ خدا کے نازل کردہ دین کے مطابق فیصلہ کرو کیونکہ خدا کا نازل کردہ دین اور عدل وانصاف دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں۔

خدا کا قانونِ عدل ہی ہے جس پر کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام قائم ہے۔ اور اسی کے نتیجے میں یہاں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کائنات میں رہتے ہوئے انسان عدل وتوازن سے محروم نہ رہنے پائے اور اس کی زندگی ظلم اور بے اعتدالی کا نشانہ نہ بن جائے۔ چنانچہ اس نے قرآن نازل کیا اور عدل کی راہ دکھائی۔

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ۝ (الرحمٰن: ۱تا۹)

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کرنا سکھلایا۔ سورج اور چاند (کی گردش) کے لیے ایک حساب ہے۔ تارے اور درخت اسے سجدہ کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند کیا اور میزان کھڑی کر دی۔ تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو، انصاف کے ساتھ میزان کو ٹھیک رکھو اور وزن میں کمی نہ کرو۔

---

[1] کتاب الفوائد ص ۱۴۶ مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ ۱۳۴۶ھ

ان آیات میں کہا گیا ہے کہ خدا نے انسان کو قرآن عطا کیا، اور اسے اس قابل بنایا کہ وہ پڑھ اور سمجھ سکے۔ یہ اس کی خاص رحمت ہے۔ قرآن حقیقت میں ایک "میزان" ہے جو انسان کے ہر معاملہ میں عدل کی راہ دکھاتا ہے۔ خدا نے زمین و آسمان پیدا کیے اور ان کے درمیان عدل کی ایسی "میزان" کھڑی کر دی کہ کوئی بھی چیز اپنی حدود سے باہر نہیں ہوتی۔ یہ خدا کا "عدل تکوینی" ہے جو پوری کائنات میں نافذ ہے۔ قرآن اس کا "عدل تشریعی" ہے۔ اس کے ذریعے انسان معلوم کر سکتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ اسے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے؟

خدا کی روشِ عدل

خدائے تعالیٰ کائنات کو عدل و قسط کی جس راہ پر چلا رہا ہے اور جس پر انسان کو چلانا چاہتا ہے، اس پر وہ خود بھی چل رہا ہے۔ وہ کبھی بھی عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹتا۔ اگر وہ ظلم کرنے لگے تو کائنات سے عدل کا وجود مٹ جائے۔ کائنات کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اسی سے ہر چیز وجود میں آتی ہے۔ اگر سرچشمہ کھاری ہے تو اس سے کھاری پانی ہی بہے گا۔ اسی طرح اگر خدا کی ذات عدل و انصاف سے خالی ہے تو ممکن نہیں ہے کہ کائنات میں عدل و انصاف کا وجود ہو۔ لیکن چونکہ یہاں عدل و انصاف پایا جاتا ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ عدل و انصاف سے متصف ہے۔ قرآن اسے "قائم بالقسط" (آل عمران: ۱۸) کہتا ہے۔ یعنی وہ اپنے تمام اعمال میں عدل اور راستی پر قائم ہے۔ اس کا کوئی کام خلاف عدل نہیں ہوتا۔ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا (الکہف: ۴۹) (تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا) وہ "حق مبین" (النور، ۲۵) ہے، اس کا وجود سراپا حق ہے، وہ بہترین صفات سے متصف ہے۔ اس کے اندر کوئی بری صفت نہیں پائی جاتی، اس کا ہر کام حق ہے، اس کے بارے میں باطل کا تصور بھی گناہ ہے، پوری کائنات اس کے قبضے میں ہے، اور وہ ہر چیز کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ کر رہا ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ	ہر جاندار کی چوٹی وہ پکڑے ہوئے ہے
بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ	یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر
مُّسْتَقِيْمٍ (ھود: ۵۶)	ہے۔

اسی حقیقت کا اظہار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ وَ فِیْ قَبْضَتِكَ ، نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُکْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُكَ [1]

اے اللہ! میں تیرا غلام ہوں، تیرے غلام کا لڑکا اور تیری باندی کی اولاد ہوں۔ میں تیرے قبضے میں ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے بارے میں تیرا ہر حکم نافذ ہو کر رہتا ہے اور تیرا ہر فیصلہ میرے بارے میں سراسر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔"

اوپر کی آیت اور حدیث کو ملانے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عدل ہی وہ "صراط مستقیم" ہے جس پر خدائے تعالیٰ چل رہا ہے۔ سورۂ نحل کی ایک آیت میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ان میں سے ایک گونگا بہرا ہے اور کسی بھی چیز کی قدرت نہیں رکھتا اور اپنے آقا پر بوجھ بنا ہوا ہے، جہاں بھی وہ اسے بھیجتا ہے تو اپنے ساتھ کوئی خیر نہیں لاتا تو کیا یہ شخص اس دوسرے شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور راہِ راست پر قائم ہے۔

یعنی ایک طرف معبودان باطل ہیں کہ ان کی مثال ٹھیک اس غلام کی ہے جو نہ زبان سے کچھ بول سکتا ہے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے، وہ اپنے آقا کے لیے ایک بوجھ ہے، جس کام پر بھی اسے بھیجتا ہے نامراد لوٹ کر آتا ہے۔ دوسری طرف خدائے ذوالجلال ہے جو عدل و راستی کی طرف دوسروں کی ہدایت بھی کرتا ہے، اور خود بھی راہِ راست پر گامزن ہے۔

---

[1] رواہ رزین (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الدعوات)

ظاہر ہے اس سے بڑا نادان کون ہوگا جو ان معبودان باطل کو معبود حقیقی کے ہم پایہ سمجھے، اور ان کو اس کا شریک قرار دے۔

عدل و انصاف کی راہ خدا کی راہ ہے اسی میں انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ عدل کے ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط۔ افراط و تفریط ہی نے ہمیشہ انسان کو تباہ کیا ہے۔ اگر انسان عدل و انصاف کی راہ اختیار کرے تو اس کی رفتار خدا اور کائنات کی رفتار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ وہ ناکام ہوگا۔ خدا کے پیغمبر اسی صراطِ مستقیم کی طرف انسانوں کو بلاتے ہیں۔ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِیْرُ الْاُمُوْرُ۔

وہ انسان جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مالک ہے، جو اگر چاہے تو اپنی دنیا بہتر سے بہتر طریقے سے بنا سکتا ہے وہ کیوں عسرت و تنگی برداشت کر رہا ہے؟ عیش و عشرت اس کا استقبال کرتی ہے تو کیوں وہ ٹھکرا دیتا ہے؟ آخر وہ کتنا بلند مقصد ہے جس کے لیے یہ بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف ہو رہی ہیں؟ اگر آدمی تعصب کا مارا ہوا نہ ہو اور حق کے لیے اس کے دل کے دروازے کھلے ہوں تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ جو شخص واقعتاً خدا کے لیے نہ کھڑا ہو اس کے اندر یہ بے غرضی اور بے نفسی کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ جس وقت اس کے اندر یہ احساس اُبھرے گا اس کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا گرویدہ بنا دے گا۔

انقلاب آفریں سیرت

آپ کی سیرت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں زبردست قوتِ تاثیر تھی۔ چنانچہ بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے گہرا اثر قبول کیا۔ جن افراد کو آپ کا فیضِ صحبت نصیب ہوا وہ آپ کے عکسِ کامل بن گئے۔ آپ میں خدا کی یاد، آخرت کا خوف، فنائے نفس اور ایثار و قربانی کے جذبات تھے تو یہ جذبات ان کے اندر بھی ابھر آئے۔ آپ کے اخلاق و سیرت میں پاکیزگی تھی تو ان کے اخلاق و سیرت میں بھی پاکیزگی آ گئی۔ حق کے لیے ان کے پاس بے پایاں اخلاص تھا اور باطل کے مقابلے میں ان کے اندر بڑی شدت تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم سے نکل کر یقین کے اس مقام تک پہنچ گئے، جس سے اونچے مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے آپ کو رسول مانا اور اس طرح مانا کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ انہیں جس طرح اپنے وجود پر یقین تھا ٹھیک اسی طرح یہ بھی یقین تھا کہ آپ خدا کے رسول ہیں۔ ان کے اس یقین سے دنیا نے قدم قدم پر ٹکر لی لیکن اسے متزلزل نہ کر سکی۔ وہ آزمائشوں میں ڈالے گئے۔ ہر طرح ستائے گئے۔ قید و بند کی تکلیفوں سے گزرے، مال و دولت سے محروم کیے گئے لیکن ان کے یقین نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب اعلان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں تو مکے کے لڑکے ان کے پیروں میں رسی باندھ کر شہر کی گلیوں اور کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے تھے[1] ان کا مالک امیہ بن خلف تپتی ہوئی ریت پر انہیں لٹا کر سینے پر پتھر رکھ دیتا کہ اگر محمد کا انکار نہ کرو گے تو اسی حال میں مر جاؤ گے۔ لیکن اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کا جو کلمہ انہیں پڑھایا تھا اس کے سوا کوئی دوسرا کلمہ پڑھنے سے

---

[1] مسند احمد، جلد ۱ صفحہ ۴۰۴۔

انھوں نے انکار کر دیا[1]

حضرت خبابؓ کو انگاروں پر لٹا دیا جاتا، جس سے ان کے جسم کی چربی پگھلنے لگتی۔ اس عذاب سے دہکتے ہوئے انگارے ٹھنڈے پڑ جاتے لیکن ان کے یقین کی وہ آگ نہ بجھتی جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے روشن کیا تھا[2]

نبوت کے جھوٹے مدعی مسیلمہ نے حضرت حبیب بن زیدؓ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے لیکن ان کے دل کی دنیا جس ایمان و یقین سے آباد تھی اسے نہ نکال سکا۔ وہ ان سے پوچھتا کہ کیا محمدؐ خدا کے رسول ہیں؟ تو پورے یقین کے ساتھ جواب دیتے کہ ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں۔ اور جب وہ یہ سوال کرتا کہ کیا تم مجھے خدا کا رسول مانتے ہو تو صاف کہہ دیتے کہ تمہاری ان خرافات کے سننے سے میرے کان بہرے ہیں۔[3]

حضرت صہیبؓ کو اس جرم میں کہ وہ آپ کو خدا کا رسول مانتے تھے مکہ چھوڑنا پڑا تو انھوں نے اس شان سے ہجرت کی کہ اپنا سارا مال و متاع مشرکین کے حوالے کر دیا اور خالی ہاتھ مدینے پہنچ گئے۔[4]

جن لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی رسالت کو تسلیم کیا تھا ان کے نزدیک کسی بات کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ آپ کی زبان سے نکلی ہے۔ ان کے یقین کا یہ عالم تھا کہ غیب کی جن حقیقتوں کو آپ بیان کرتے وہ ان پر اس طرح ایمان لے آتے جیسے کہ انھوں نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ نے معراج کا ذکر فرمایا کہ شب کے چند لمحات میں خدائے تعالیٰ آپ کو مکے سے بیت المقدس لے گیا۔ وہاں آپ نے نماز پڑھی اور پھر آپ مکے واپس لوٹ آئے۔ آپ کے مخالفین کے نزدیک اس واقعہ کی روایت ہی آپ کی تکذیب کے لیے کافی تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سنا تو کہا "واللہ لئن کان قالہ لقد صدق،" (خدا کی قسم اگر آپ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو سچ بیان کیا ہے۔[5])

حضرت یاسرؓ خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کی بیوی سمیہ کو ابوجہل کے نیزے نے شہید کر دیا

---

[1] سیرت ابن ہشام، جلد ۱ صفحہ ۳۳۹۔ [2] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔ [3] الاستیعاب فی اسماء الاصحاب۔ [4] الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ [5] سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص۵، یہاں واقعہ معراج کی ان تمام تفصیلات سے بحث نہیں جو صحیح حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں۔